

فہرست ابواب

ابتدائیہ

راقم الحروف نے ابتداء میں گلبرگہ یونیورسٹی کے شعبہ اردو سے جب ریسرچ کی خاطر رجسٹریشن کروایا تو موضوع



اردو کے مہاجر افسانہ نگار۔ آزادی کے بعد کا انتخاب کیاتھا۔ اس خصوص میں جب مغربی ممالک میں مقیم ہندوستانی افسانہ نگاروں سے اور خلیج میں بسے فنکاروں سے رابطہ کیا تو کئی اہل قلم حضرات نے اپنا قلمی تعاون فرمایا۔ بعض نے مشوروں سے بھی نوازا۔ ان میں ایک مشورہ محترم منیرالدین احمد جرمنی کا یہ رہا کہ اسطرح کام کرنے سے میدان ادب میں نہ کوئی اضافہ ہوگا اور نہ ہی حق تحقیق ادا کرسکیں گے۔ اس لئے بہتر یہ ہے کہ کسی ایک ادیب، شاعر یا افسانہ نگار کو ریسرچ کا موضوع بنایا جائے اور ان کے پورے ادب کا جائزہ لینے کی کوشش کی جائے تو زیادہ مناسب رہیگا۔ انھوں نے اس میں خود کو بھی شامل کرکے بتایاتھا۔ جب میں نے ان تمام افراد کی چیدہ چیدہ کہانیاں اور شعری سرمایہ کا مطالعہ کیا اور محترم منیرالدین احمد کو بھی پڑھا ۔ ان پر کام کرنے میں میرے لئے دشواری یہ تھی کہ انہوں نے جرمن ادب کو بھی اردو میں منتقل کیاہے۔ اس کے بعد جرمن ہی کے ادباء شعراء کی طرف نظر گئی اور محترم حیدرقریشی کے افسانوں کا مجموعہ دہلی سےمنگوالیا۔ اس کے بعد دلچسپی پیدا ہوئی۔ انھیں انٹرنیٹ پر بھی دیکھا۔ ان کے کلام کو پڑھا اور کچھ انسیت سی پیدا ہوئی۔ انٹرنیٹ سے شناسائی بڑھی اور پھر میں نے دیکھا کہ یہ شخص ہندوستان کے ادیبوں خاص طورپر جوگیندرپال کا شیدائی ہے اور محترم حمیدسہروردی سے میں نے اس کاتذکرہ کیا تو انھوں نے یہ بتایا کہ ۷۰ کے بعد کی دہائی میں جن لوگوں نے افسانوی ادب میں قدم رکھا ان میں حیدرقریشی بھی ایک ہیں۔ اور ہمارے ان کے تعلقات بحیثیت افسانہ نگار اس وقت سے ہیں۔ اس وقت سے تعلقات سے مراد یہ کہ وہ انھیں پڑھتے رہے اور یہ انھیں۔ ایسا نہیں کہ ملاقاتیں ہویں۔ کیونکہ اس زمانہ میں خط و کتابت ہی ایک ذریعہ تھا اور خط و کتابت بھی اردو رسائل کی معرفت بہرحال میرا رابطہ حیدرقریشی سے ہونے لگا۔ اور تقریباً ایک سال کے بعد میں نے اپنے پی ایچ ڈی کے موضوع کیلئے اپنی خواہش کا اظہار کیا اور محترم حمیدسہروردی نے اسے منظوربھی کیا اور شعبہ اردو گلبرگہ یونیورسٹی کے اس وقت

کے صدر پروفیسر عبدالحمیداکبر نے باقاعدہ بورڈ آف اسٹیڈیز میں اسے رکھا اور منظوری بھی حاصل کی اسطرح یہ کام چلتا رہا۔

اس عنوان کو یعنی "حیدرقریشی -شخصیت اور ادبی جہات" کو مزید ذیلی ابواب کے تحت ترتیب دیاگیا۔ حیدرقریشی چونکہ ادب میں مختلف الجہات شخصیت کے مالک ہیں۔ انہوں نے شاعری بھی کی، افسانے بھی لکھے، غیر افسانوی ادب بھی تحریر کیا۔ اور ساتھ ہی کچھ تنقید بھی اور تحقیق بھی کی۔ مگر یہ بہت وسیع پیمانے پر ہے۔ کیونکہ ابتداء تو انھوں نے شاعری سے کی مگر بہت جلد افسانے کی طرف راغب بھی ہوئے۔ اور انھیں جو حلقہ ملاتھا اس نے بہت مدد کی۔ وہ ادبی حلقہ وزیرآغا اور انور سدید جیسی نابغہ شخصیتوں کا تھا۔ ادب میں قدم رکھنے سے پہلے حیدرقریشی نے دنیا کے نشیب و فراز کو جھیل چکے تھے۔ قریب ۱۹ سال تک انہوں نے ایک شوگر فیکٹری میں ملازمت اختیار کی۔ چونکہ یہ صرف میٹرک پاس تھے اس لئے کوئی اہم عہدہ پر فائز نہیں ہوسکتے تھے۔ بلکہ شوگر فیکٹری میں ایک ملازم کی حیثیت سے کام کرنے والے تھے۔ وہاں کی سیاست، امیر اور غریب طبقہ کا ٹکراؤ۔ مختلف چیزیں ان کے سامنے تھیں۔ گھریلو ماحول بھی بہت غربت زدہ۔ اسطرح ان کے اندر کا حیدرقریشی جاگ گیا اور انھوں نے پرائیوٹ طورپر اپنی تعلیم جاری رکھی۔ بالآخر انہوں نے ایف اے، بی اے اور پھر ایم اے بھی کیا۔ اس اثنا میں انھیں ان ادیبوں سے ملنے کے موقع بھی ملے اور بعد کو ایبٹ آباد میں لکچررشپ بھی ملی۔ اب کیا تھا یہ ادبی سلسلہ اپنی منزل کی طرف رواں تھا۔ اس زمانہ میں انہوں نے ایک ادبی مجلہ بھی نکالنا شروع کیا جو نہ صرف پاکستان بلکہ بیرون پاکستان بھی معروف رہا اور ادب میں اپنی ایک شناخت بنالیا۔ وہ تھا "جدید ادب" مالی مشکلات کے سبب کچھ عرصہ تک یہ تعطل کا شکار رہا۔ حیدرقریشی کی طبیعت بھی متحرک تھی سو انھیں حالات بھی ایسے میسر آگئے کہ انھوں نے جرمنی شفٹ ہونے کا ارادہ کرلیا۔ پہلے بیوی اور بچوں کو جرمنی میں سیٹ کروایا اور خود ایک سال کے بعد یہاں پہنچے۔

یو این او کے تحت پہلے انھیں دہلی (انڈیا) میں ایک سال گذارنا پڑا اور بعد میں جرمنی چلے گئے اور آج بھی وہیں مقیم ہیں۔ دہلی کے قیام کے دوران یہاں کے ادباء و شعراء سے ان کا رابطہ رہا۔ جرمنی جانے کے بعد انھوں نے بہت ساادبی کام کیا۔ جس میں خاص طورپر پنجابی کی وہ لوک گیت جسے انہوں نے باقاعدہ تحقیق اور تنقید کے بعد بحث و تمحیص کے مرحلوں سے اسے گذار کر باقاعدہ اردو کے شعری سرمایہ میں اضافہ کیا ور ایک شعری صنف کی حیثیت سے متعارف کرایا۔

ماہیے، غزلیں، نظمیں یادداشت نگاری،خاکہ نگاری، سفر نامہ نگاری کے علاوہ تنقیدی مضامین لکھے۔ اور پھر سے "جدید ادب" کا اجرا جرمنی سے کیا اور ہنوز یہ سلسلہ جاری ہے اور ابتک ۱۹ شمارے منظر عام پر آئے اور اسے اردو کے ادبی صحافت میں صرف درج نہیں کروایا بلکہ آسمان ادب پر چمکنے والے بدرمنیر کی طرح اس کو روشناس کروایا۔ اتنا ہی نہیں سائنس اور تکنالوجی کے ترقی یافتہ اس ماحول میں اردو کو اس سے جوڑ دیا۔ اور بتایا کہ اردو میں یہ دم خم ہے اور لچک ہے کہ وہ دنیاکی دیگر زبانوں کا نہ صرف مقابلہ کرسکتی ہے بلکہ ان کے شانہ بہ شانہ چل بھی سکتی ہے۔ اور دوسروں کو اپنی طرف ملتفت کرنے کا گر بھی جانتی ہے۔ اسطرح جدید ادب کو بیک وقت پرنٹ کے ساتھ الیکٹرانک میڈیا سے بھی جوڑدیا اور دنیا بھر کے ادیبوں اور شاعروں کو انٹرنیٹ سے متعارف کرانے کا سہرا بھی حیدرقریشی کے سر جاتاہے۔

ان تمام کاموں اور انکے ادب کے پیش نظر اس عنوان کو ذیلی ابواب کے تحت تقسیم کیاگیا وہ اسطرح ہیں:

باب اول : حیدرقریشی شخصیت اور سوانح

باب دوم : جہت شعر: غزل، نظم، ماہیا

باب سوم : جہت نثر: افسانہ، خاکہ، انشائیہ، یادداشت ، سفر نامہ، تحقیق و تنقید، مضمون ۔

باب چہارم : جہت صحافت: جدید ادب کی ادارت، کالم نگاری۔
باب پنجم : حیدرقریشی مشاہیر کی نظر میں۔

باب اول کے تحت حیدرقریشی کی سوانح اور شخصیت کا احاطہ کیاگیا۔ اس کیلئے باقاعدہ ملاقات تو نہیں ہوئی۔ مگر جب بھی فرصت کے اوقات نصیب ہوئے ان سے مکالمہ بھی ہوتا اور مراسلہ بھی۔ سائنسی دور میں اس سائنسی انقلاب نے انسان کے ظاہری فاصلوں کو ختم کردیا اور اب دوبدو بلکہ روبرو ہوکر کلام کرنے کے سامان مہیا کردئے۔

میری مراد انٹرنیٹ کے ذریعہ میری ملاقاتیں ہوتیں۔ اور حیدرقریشی نے اپنا سارا ادبی اثاثہ انٹرنیٹ پر صلائے عام کیلئے پیش کردیا، جو بھی پڑھنا چاہے پڑھ سکتاہے اور ان سے رابطہ کرسکتاہے۔ اسطرح یہ باب ان سے بات چیت اور ان کی اہلیہ سے بھی بات چیت کرکے ساتھ میں مختلف ادب دوستوں کی آرا اور خود ان کی کھٹی میٹھی یادوں سے اخذ کرکے تحریر کیاگیا ہے۔

دوسراباب، جہت شعر کے عنوان کے تحت ہے۔ اس میں غزل، نظم اور ماہیہ پر بحث کی گئی ہے۔ جس میں غزل کوجدید دور کےتقاضوں سے کیسے ہم آہنگ کیاگیا ہے۔ اور ان کی نظموں کا جدید ادب کے تناظر میں جائزہ لیاگیا ہے۔ مگر ان کا اصل کارنامہ اردو ماہیہ نگاری کاہےیہ تخلیق تو ہے مگر اس کو تنقید کے باب میں تحقیق اور تنقید کے تحت بھی بتایا گیاہے۔ یہاں صرف تخلیقی حدتک بات ہوئی ہے کہ ان میں کس قسم کا تنوع انہوں نے اختیار کیاہے۔ چنانچہ غزل، نظم اور ماہیوں کے متعلق یہ بتایاگیا کہ کس حدتک حیدرقریشی نے اپنے اسلاف سے متاثر ہوکر اور دور کے تقاضوں کو کیسے سمویا اور نئے رجحانات کو کس اچھوتے انداز میں پیش کیا۔ اور اپنے درد اور کرب کو غزل میں بھی سمودیا۔ ؎

جو میری روح میں بس
زہرگھولتاہی رہا
مرے نصیب میں چینی کا
کارخانہ تھا

جب آنکھیں مندگئیں حیدرگھنے
اندھیرے میں
تو روشنی کا کوئی خواب ہی
جگاناتھا

تیسرے باب میں حیدرقریشی کی افسانہ نگاری ، جس میں انہوں نے تجریدی اور علامتی افسانے بھی لکھے ان افسانوں پر اور خاکے، انشائیے، سفرنامہ، یادنگاری وغیرہ کا احاطہ کیاگیا۔

چوتھے باب میں ان کی صحافتی خدمات کے طورپر جرمنی سے نکلنے والے جدیدادب کے جملہ ۱۹/شماروں کے مضامین، گوشوں اور تفصیلی مطالعہ کے تحت ان پر اختصاریہ لکھاگیا۔ جس سے انکی صحافتی ہی نہیں بلکہ تنقیدی نظر کا بھی اندازہ ہوتا ہے۔ خاص طورپر وہ بحث جب عمران شاہد بھنڈر کے مضامین سے ادبی دنیا میں ایک تہلکہ سا آگیا اس کا تذکرہ یہاں آگیا۔ کہ انہوں نے معروف ادیب ونقاد پروفیسر گوپی چند نارنگ کو مصنف نہیں بلکہ مترجم کہا۔

پانچویں باب میں حیدرقریشی مشاہیرادب کی نظر میں کے عنوان سے ترتیب دیاگیا۔ جس میں دنیا بھر کے ادیبوں، نقادوں اور دانشوروں نے حیدرقریشی کے ادبی مرتبہ کو جن الفاظ میں خراج تحسین پیش کی اسے ترتیب دیاگیاہے۔

اسطرح یہ کام گوکہ مکمل ہوگیا مگر بقول جوش ملیح آبادی۔

کون سمجھے "شعر" یہ کیسے
ہیں اور کیسے نہیں
دل سمجھتا ہے کہ جیسے دل میں

تھے ویسے نہیں

عبدالرب استاد

اظہار تشکر

یہ اللہ کا شکرواحسان ہے کہ اس نے مجھ ہیچمدان کو لکھنے اور پڑھنے کی سعادت سے بہرہ مند فرمایا۔ اور پھر میرے والدین کو یہ توفیق عطا کی کہ وہ اپنی اولاد کی تربیت تعلیم سے کرسکیں۔ میرے والدین کے ساتھ ساتھ میں اپنے تمام بھائیوں اور بہنوں کا احسان مانتاہوں کہ انہوں نے میری تربیت اور رہنمائی فرمائی۔

میرے اس اہم تعلیمی سفر میں، جسے عموماً سندی اعتبار سے اختتام گرداناجاتاہے۔ جن حالات سے گذراہوں اور پھر اس مقام پر پہنچاہوں جہاں پہنچنے کی بہت سوں کی خواہش ہوتی ہے۔ یہ دراصل فیض خداوندی ہے اور وہ فیض میں سمجھتاہوں مجھ پر جاری ہے۔ جسکی وجہ سے آج اس حالت میں ہوں کے میں اپنی ٹوٹی پھوٹی تحریر ہی میں سہی یہ مقالہ داخل کرسکوں۔ اس کیلئے میں اپنے مالک حقیقی کا بے انتہا شکر گذار ہوں۔

میں اپنے والدین کا شکراداکرنے کی کوشش کرتاہوں۔ مگر یکلخت میرا قلم رک جاتاہے۔ اور کلیجہ منہ کو آجاتاہے۔ کیونکہ میں بے بس ہوں۔ اور اپنی بے بسی اور کم مائیگی کے احساس تلے دب جاتاہوں۔ میری حالت تو بس علامہ اقبال کے اس شعر کی پوری غمازی کرتی ہے۔ ؎

عمربھر تیری محبت میری خدمت گررہی
میں تری خدمت کے قابل جب ہوا تو چل بسی

میرے تقرر سے پہلے ہی میری والدہ مجھ سے بچھڑ گئی اور میں سوچتاہوں کہ آخر کروں تو کس کی خدمت کروں۔ وہ جو مجھے بہت عزیز تھی۔ اور میں اسے بہت عزیز۔ ہروقت ہماری

تربیت کرتیں۔ کام ہی کام میں ایسی باتیں اور ایسے کلمات ادا ہوتے کہ میں آج بھی ان پر غور کرتاہوں کہ آخر کیسی صلاحیتیں قدرت نے انھیں عطا کی تھیں۔ خیر میں اپنی مرحوم والدہ اور باحیات والد محترم کا بے حد سپاس گزار ہوں۔ کیونکہ میرے والد کثیرالعیال ہونے اور مالی طورپر کمزور ہونے کے باوجود اپنے آٹھوں بچوں کو تعلیم کے زیور سے آراستہ کیا۔ اور انھیں ملازمتیں بھی ملیں۔ مگر اس کے پیچھے ان کی دعائے نیم شبی بہت کام کرگئی۔ کیونکہ انہوں نے ہمیشہ مسبب پر توکل کیا، اسباب کے پیچھے نہیں پڑے۔ شاید اسی وجہ سے اسباب اپنے آپ بنتے چلے گئے۔

اس طرح میں اپنی دونوں بہنوں ایک مرحومہ کہتے ہوئے بہت افسوس ہوتاہے اور دوسری بقیدحیات ہیں، دونوں نے مجھے ہمیشہ بھائی نہیں بلکہ اپنی اولاد کی طرح سمجھا اور میری استعانت فرماتے رہے۔ اور میرے سات بھائیوں نے جسے جو توفیق قدرت نے دی اسی انداز ومناسبت سے میری مدد فرمائی۔ خاص طورسے بھائی نصیراحمد اور عبدالحفیظ نے تعلیمی طورپر ہویا تربیتی لحاظ سے دیگر بھائیوں کے مقابلہ میں میری مدد فرمائی۔دیگر برادران میں محمد عمر استاد، محمد عبداللہ استاد، عبدالمجید استاد، عبدالحمید استاد اور عبدالرشید استاد کا بھی شکر گزار ہوں۔ ان کے ساتھ ساتھ اپنی شریک سفر کا شکریہ ادا کرنا بھی میرے لئے ضروری ہوجاتاہے کیونکہ وہ اپنی گھریلومصروفیات کے باوجود میرا ہر لمحہ خیال رکھتیں اور دوران تحریر میری استعانت بھی فرماتی۔

ان تمام کے علاوہ بشارت احمد استاد، لیاقت فرید استاد، فراست نوید استاد، محمداسحاق، عبدالسمیع، عبدالسلیم، سعید احمد، سراج احمد اور محمد حمزہ کا بھی شکرگزار ہوں کہ انہوں نے میرے اس تحقیقی سفر میں سہولتیں بہم پہنچائیں۔

میرے اساتذہ میں ڈاکٹر لئیق خدیجہ، پروفیسر وسابق صدر شعبہ اردو گلبرگہ نیورسٹی گلبرگہ، اور تنہاتماپوری کا بھی بے حدممنوں ہوں۔ انہوں نے مجھے ہمیشہ اونچے مقام پر دیکھنا چاہا اور اللہ نے ان کی سن بھی لی۔ میرے رفیق کار میں میرے ہمدم

دیرینیہ اور ریسرچ گائیڈ پروفیسر حمید سہروردی، جنہوں نے مجھے اپنا ایک چھوٹا بھائی سمجھا، ہمیشہ نیک مشوروں سے نوازتے اور ادبی گفتگو کے دوران ادب کو سمجھنے میں بہت استعانت فرمائی آپ کے مشوروں اور ہدایات کو میں تادم آخر بھول نہیں سکتا۔ میری تحقیق کے دوران بھی آپ نے صحیح مشوروں سے نوازا اور مدد فرمائی اس طرح آپ کا مخصوص انداز میں شکریہ ادا کرنا میری خوش بختی ہے۔ ایک اور رفیق کار پروفیسر ایم اے حمید کا خصوصی شکریہ ادا کرنا میرافرض منصبی ہے کیونکہ یہ رجسٹریشن آپ ہی کی زیرصدارت ہوا اور اس کام کی تکمیل تک جتنے نشیب و فراز آتے گئے ان میں جس انداز سے میری مدد فرمائی اور بالآخر یہ کام اپنے اختتام کو پہنچا اس کیلئے میں آپ کا صمیم قلب سے شکریہ ادا کرتاہوں۔

ساتھ ہی میرے وہ بزرگ احباب جو پیشہ تدریس سے وابستہ تو ہیں اور میرے راست اساتذہ نہیں مگر اساتذہ کا درجہ ضرور رکھتے ہیں۔ جنھوں نے مجھے ہمیشہ اسطرف توجہ دلاتے رہے اور میں تساہلی برتتارہا۔ ان احباب میں پروفیسر محمد انورالدین، پروفیسرم۔ن۔ سعید، پروفیسر مسعود سراج، پروفیسر سید شاہ مدار، پروفیسر نسیم الدین فریس، پروفیسر سید خلیل احمد، ڈاکٹر سید اشرف حسین، ڈاکٹر قدیر ناظم سرگروہ، ڈاکٹر صدیق محی الدین، پروفیسر شیوراج ہلی کھیڑ، پروفیسر سنتاپنور، پروفیسر مائکل، پروفیسر دیانند، پروفیسر ویرنادنڈے، پروفیسر کھنڈوبا، پروفیسر ڈی۔بی ۔ نائیک، پروفیسر بسوراج سبرد، پروفیسر ودیاساگر، پروفیسر وجیا تیلنگ، پروفیسر ایچ ٹی پوتے، پروفیسر واسودیوسیڑم، پروفیسر پریملا امبیکر، وغیرہ وغیرہ ان تمام کا اس موقعہ پر شکریہ ادا کرتاہوں۔

خاص طورپر پروفیسر شیواجی واگھ مورے اور ڈاکٹر کے ایس وینکٹیش اسوسی ایٹ پروفیسر، جناب بسواراج پرٹ، بسوراج چورے کا شکریہ ادا کرتاہوں کیوں کہ انھوں نے اسے میری نہیں بلکہ اپنی کامیابی تصور کیا اور یہ کام پایہ تکمیل تک پہنچانے میں میری مدد فرمائی۔



آخر میں ان دوستوں اور طلباء طالبات کا بھی شکریہ ادا کرتاہوں جنہوں نے مجھے ہمیشہ اس طرف توجہ دلائی۔ ان میں جناب نثار احمد کلیم، ڈاکٹر خالد سعید، ڈاکٹر حشمت فاتحہ خوانی، ڈاکٹر افتخار الدین اختر، ڈاکٹر خلیل احمد، ڈاکٹر محمدی بیگم، ڈاکٹر کوثر فاطمہ،ڈاکٹر غضنفر اقبال ، سید عارف مرشد، ڈاکٹر محمد سمیع الدین، ڈاکٹر قاضی شکیل الدین، محمدفیروزخان، ڈاکٹر سید علیم اللہ حسینی، ڈاکٹر زبیر احمد قمردیگلوری،ڈاکٹر حامد اشرف، ڈاکٹر فریدہ بیگم، ڈاکٹر اسمائ تبسم، ڈاکٹر عبدالباری، ڈاکٹر مقبول احمدمقبول، ڈاکٹر چندا حسینی،سید ضمیر الدین، ڈاکٹر سیدہ انجم ضمیر، عبدالمقتدر، محمد یوسف، عبدالسعید، ڈاکٹر محسنہ، شمیم ریحانہ وغیرہ وغیرہ۔

عبدالرب استاد


باب اول
حیدرقریشی شخصیت اور سوانح

حیدرقریشی شخصیت اور سوانح

دنیائے ادب میں حیدرقریشی کی شناخت کیسے کی جائے یہ سوچنا پڑتاہے۔ کیونکہ وہ ایک متحرک اور فعال شخصیت کے مالک ہیں۔ ادب کی مختلف اصناف میں انہوں نے نہ صرف طبع آزمائی کی ہے بلکہ اس کا حق ادا کیاہے۔ اس ادیب و شاعر کی پیدائش گھریلو اعتبار سے ۱۳/جنوری ۱۹۵۲ء کی ہے جبکہ سرکاری کاغذات کے اعتبار سے یکم ستمبر ۱۹۵۳ء درج ہے۔ مقام ولادت، پاکستان کے صوبہ پنجاب، ضلع جھنگ کے شہر ربوہ میں ہوئی جسے آج کل چناب نگر کہاجارہاہے۔ مگر آپ کی تعلیم و تربیت خان پور، رحیم یارخاں جوان کا آبائی علاقہ کہلاتاہے میں ہوئی۔ جہاں ان کے والد کی کپڑوں کی دکان تھی۔ جس کے متعلق وہ خود ایک انٹرویو جو محمد وسیم انجم (راولپنڈی) کو دیاتھا، میں فرماتے ہیں۔

> "میرے والد صاحب کی کپڑے کی دکان تھی۔ ہمارا خاندان متوسط طبقے کا خوشحال گھرانہ تھا۔ لیکن اباجی کا کاروبار زوال کا شکار ہوا تو نہ صرف اباجی کلاتھ مرچنٹ سے ٹیلرنگ شاپ تک آگئے۔ بلکہ ہم لوگ بے حد تکلیف وغربت کی زد میں آگئے"۔[1]

یہ وہ زمانہ تھا جہاں انھیں بہت مصیبتیں اٹھانی پڑیں بلکہ جسے تیسے میٹرک تک آگئے اور میٹرک کا امتحان دیتے ہی انہوں نے اپنے اباجی کا ہاتھ بٹانے کیلئے ان کے ہمراہ شوگر فیکٹری میں ملازمت اختیار کرلی۔ اپنی ابتدائی تعلیم کے متعلق خود حیدرقریشی کا کہنا ہے کہ انہوں نے اپنے امی اور اباجی سے حاصل کی۔ جب کپڑے کی دکان تھی تو وہیں کچھ لکھنا سیکھ لیتے۔ یہاں بعض غلطیوں پر انہوں نے اباجی سے مار بھی

[1] انٹرویوز ص ٦١، ٦٢



کھائیں۔ مگر مار کے معاً بعد جب وہ رونے لگتے تو انھیں ٹافی مل جاتی۔ مگر وہ تربیت بہت عمدہ رہی۔ اور اپنے اباجی کے متعلق حیدرقریشی فرماتے ہیں کہ اباجی نے دو شادیاں کیں۔ پہلی بیوی عزیزبی بی تھیں۔ جنہوں نے اس الزام کی بنیاد پر عدالت سے رجوع ہوکر طلاق لے لیں کہ یہ شخص اولاد پیدا کرنے کے قابل نہیں۔ پھر ان کی شادی حیدرقریشی کی امی سے ہوئی اور یکے بعد یگرے دس بچے تولد ہوئے۔ پانچ بیٹے اور پانچ بیٹیاں۔ عزیزبی بی نے دوسری جگہ شادی کرلی مگر اولاد سے محروم رہی۔ ان تمام اولادوں کے نام یہ ہیں۔

١) شریفہ فرحت، ٢) حیدرقریشی، ٣) اکبر قریشی
٤) زبیدہ کلیم، ٥) شاہدہ تنویر ٦) فہمیدہ کوثر
٧) شمسہ قمر ٨) طاہر یشی ٩) نوید انجم
١٠) اعجاز قریشی

ان تمام میں حیدرقریشی نرینہ اولاد کے اعتبار سے بڑے فرزند رہے۔ ان کی ذمہ داریاں بھی زیادہ رہیں۔ جیسا اوپر ذکر ہوا کہ انہوں نے اپنے اباجی کا ہاتھ بٹانے اور گھر کی ذمہ داریوں میں حصہ لینے کیلئے اپنے اباجی کے ساتھ شوگرمل میں ملازمت اختیار کرلی جہاں چھے مہینے ملازمت کرنی ہوتی اور چھے مہینے بیکاری کے ہوتے۔ ایسے میں انہوں نے پرائیوٹ طورپر ایف اے، بی اے، پھر ایم اے بھی کرلیا دوران تعلیم ان کی شادی ١٩٧١ء میں اپنے ماموں کی بیٹی مبارکہ سے ہوئی۔ جس وقت انکی شادی ہوئی اس وقت انکی عمر اٹھارہ برس کی تھی۔ ١٩٧٦ء میں ایم اے کا امتحان پاس کرلیا۔ اپنی تعلیمی قابلیت کی وجہ سے وہ دوسری کوئی مناسب ملازمت کی تلاش مین سرگرداں تھے۔ کیونکہ شوگر فیکٹری میں جملہ ١٩/برس تک ملازمت کی۔ ١٩٨٧ء میں بغیر کسی وجہ کے انہوں نے شوگر مل کی ملازمت کو خیرباد کہا۔ تین سال بے روزگاری اور تنگ دستی میں گذاری۔ ١٩٩٠ء میں انھیں ایبٹ آباد کے ایک اعلیٰ اور معیاری تعلیمی ادارے میں لیکچرارشپ مل گئی۔ یہ ادارہ پاکستان انٹرنیشنل پبلک اسکول اینڈ کالج تھا۔ باقاعدہ سرکاری گریڈ کے تحت انھیں تنخواہ ملنے لگی۔ اور وہ تنگ دستی کسی حدتک دور

ہوتی نظر آئی اور اب زندگی میں ترقیاں آنے شروع ہوئے۔ یہاں اس ادارے میں لگ بھگ چار سال لیکچررشپ کی۔ اور ۱۹۹٤ء میں جرمنی چلے گئے اور وہاں کی شہریت حاصل کرلی۔ اپنے وطن سے جرمنی پہنچنے کی داستان جواز جعفری کے انٹرویوسے ملتی ہے۔

جواز جعفری : آپ نے بخوشی وطن چھوڑا یا جلاوطن کئے گئے؟
حیدرقریشی : جلاوطن تو نہیں کئے گئے۔ لیکن وطن کو بخوشی نہیں چھوڑا۔ حالات کا دباؤ اسی طرف لے گیا۔
جواز جعفری : جلدوطنی خود ساختہ تھی یا حکومتی دباؤ تھا؟
حیدرقریشی : یہ "خودساختہ" کا لفظ بہت مناسب لگ رہاہے۔
جوازجعفری : اس سے پہلے کس ملک میں تھے؟
حیدرقریشی : جرمنی آنے سے پہلے مجھے ایک سال کا عرصہ یونائیٹڈ نیشنز کے ادارہ برائے مہاجرین کے تحت انڈیا (دہلی) میں رہناپڑاتھا۔ وہیں سے جرمنی بھیجاگیا۔ جرمنی آنے کیلئے مجھے ائیرٹکٹ یونائٹڈ نیشنز کے مذکورہ ادارہ نے دی تھی اور ویزہ جرمن حکام نے دیاتھا۔ فرینکفرٹ ایئرپورٹ پر یونائٹڈ نیشنز کی ایک نمائندہ نے بون سے آکر مجھے ریسیو کیاتھا"۔[2]

جرمنی پہنچنے سے قبل پاکستان میں ہی حیدرقریشی کی ادبی شناخت بن گئی تھی۔ اور ڈاکٹروزیر آغا، انورسدید وغیرہ سے مراسم گہرے ہوگئے تھے اور انہوں نے باقاعدہ شاعری اور افسانے لکھنے شروع کردیے۔ بعد میں "جدید ادب" مجلہ بھی نکالنا شروع کردیا۔ اس طرح ادب میں ان کی پہچان بن گئی تھی۔

جرمنی پہنچنے کے بعد اس کام میں مزید سرعت پیدا ہوئی۔ اور آپ کا ادبی معیار اور وقار بڑھتاہی گیا۔ اور آج وہ عالمی طورپر پہچانے جانے والے ایک ادیب، شاعر، نقاد، محقق، ادبی صحافی وغیرہ وغیرہ کی حیثیت سے ایک منفرد شخص ہیں۔

ادبی اعتبار سے آپ نے غزلیں، نظمیں، ماہیے، دوہے وغیرہ شاعری میں اور افسانوی ادب میں ایک ممتاز مقام پر فائز

---

[2] انٹرویز صفحہ ۸۸، حیدرقریشی سے لئے گئے انٹرویوز، مرتب سعید شباب ۲۰۰٤۔



نظر آتے ہیں۔ دیگر اور حیثیتیں بھی ہیں۔ مگر ادبی جریدے جدید ادب نے حیدرقریشی کو بہت اونچے مقام پر لاکھڑا کیا۔ کیونکہ یہ ایک عالمی جریدہ ہے۔ اس کی مشمولات سے اندازہ ہوتاہے کہ انہوں نے اس کو کس معیار اور مقام پر پہنچادیا۔ اس میں دنیا بھر کے دانشور، پروفیسرز، قلمکار اور اسکالرز کی تحریریں، ان کی غزلیں، نظمیں، ماہیے، مضامین ملیں گے۔ جو واقعی معیار ی ہیں۔

ادب میں سب سے بڑا کارنامہ اگر حیدرقریشی کا کوئی ہے تو وہ ہے پنجاب کے لوک گیت کو باقاعدہ ادبی صنف کے طورپر متعارف کروانے کا کام۔ یہ حیدرقریشی نے کروایا اور وہ ہے "ماہیا" اس کو باقاعدہ ایک شعری صنف کی حیثیت سے رائج کروایا۔ اور اس کیلئے انہوں نے بہت تگ و دوکی، اس کے اوزان متعین کرنے میں انہوں نے کوئی مارشل لا کی طرح اپنا حکم صادر نہیں کیا بلکہ جمہوری انداز کو اختیار کرتے ہوئے عوام سے، اوردانشوروں سے رجوع ہوکر ان کی رائے لی اور بالآخر انکی کوششوں کے بعد متفقہ طورپر اس کو مان لیاگیا کہ یہ لوک گیت اب باقاعدہ شعری صنف کا درجہ اختیار کرگئی۔ اس طرح دنیا بھر میں کئی شعراء اس جانب متوجہ ہوئے اور ماہیے لکھنے لگے۔ خود حیدرقریشی تین سو سے زائد ماہیے لکھے۔ اور بعد میں کئی شعراء نے صرف ماہیوں کے مجموعے شائع کئے اور سلسلہ ہنوز جاری ہے۔

اس طرح افسانے بھی انہوں نے لکھے وہ سترکی دہائی کے بعد والے ہیں اور ان میں زیادہ تر علامتی اور تجریدی ہیں۔ مگر ایسا نہیں کہ وہ بیانیہ سے گریز کرتے ہوں یا ان میں کہانی پن نہیں ہے۔ ایسا ہرگز نہیں ہے۔ خاکوں کا جہاں تک معاملہ ہے انہوں نے اپنے والدین، رشتہ دار اور خاندانی لوگوں کو اہمیت دی ہے۔ میری دانست میں شاید یہ پہلی بار ہواہے۔ اس کے علاوہ ادب دوستوں اور اردو کی بڑی اہم شخصیتوں پر بھی خاکے لکھے ہیں۔

مزید انہوں نے مختلف اصناف میں طبع آزمائی تو کی ہے مگر جدید ادب تو اپنی مثال آپ ہے۔ اس کے لئے ہم صرف یہ کہہ

سکتے ہیں کہ انہیں جنون ہے اور اسی جنون کے تحت یہ جریدہ نکالتے ہیں۔ اب تک تخلیقات پر نظر ڈالیں تو حیدرقریشی واقعی ایک کثیر الجہت شاعر و ادیب کی حیثیت سے منظر عام پر آتے ہیں۔

شاعری :

١) سلگتے خواب (غزلیں)
٢) عمرگریزاں (غزلیں، نظمیں، ماہیے)
٣) محبت کے پھول (ماہیے)
٤) دعادل (غزلیں، نظمیں)
٥) غزلیں، نظمیں، ماہیے (چاروں شعری تخلیقات کا مجموعہ)

تخلیقی نثر :

١) روشنی کی بشارت (افسانے)
٢) قصے کہانیاں (افسانے)
٣) میری محبتیں (خاکے)
٤) سوئے حجاز (سفرنامہ)
٥) عمر لاحاصل کا حاصل جملہ گیارہ کتابوں پر متشمل کلیات۔ جس میں پانچ شعری مجموعے، دو افسانوی مجموعے، خاکوں کا ایک ، یادداشت نگاری کا ایک، انشائیوں کا ایک، سفرنامہ ایک، اسطرح جملہ ١١/ کتابوں کا کلیات۔

تحقیق و تنقید:

١) اردو میں ماہیانگاری۔
٢) عہد ساز شخصیت
٣) ماہیے کی تحریک
٤) اردو ماہیے کے بانی
٥) اردو ماہیا تحقیق و تنقید (پانچ کتابوں کا لیات)
٦) (حاصل مطالعہ) تنقیدی مضامین پر مشتمل۔
٧) تاثرات

صحافتی تجزیوں پر متشمل کتب

۱) ادھار ادھر سے
۲) خبرنامہ
۳) منظر اور پس منظر
٤) فسانوی مجموعے، ترجمہ انگریزی میں And I Wait

ادارت : جدید ادب
جسکے اب تک ۱۹/شمارے منظر عام پر آئے- کئی ادبی شخصیتوں کے گوشے چھپے، اور ان میں سجاد ظہیرنمبر اور میرانجی نمبر بہت اچھے اور تاریخی جریدے ہیں- یہ جریدہ بیک وقت پرنٹ بھی ہے اور آن لائن بھی- یہ ایک انٹرنیشنل ادبی جریدہ ہے-

ان کے علاوہ حیدرقریشی کئی انٹرنیٹ ادبی جریدوں سے وابستہ ہیں- اور اکثر جرائد میں ان کا کام ہے نام نہیں ہے- آپ کی تخلیقات دنیا بھر کے رسائل و جرائد میں شائع ہوتی ہیں- عکاس (انٹرنیشنل) پاکستان نے اور ہندوستان سے ماہنامہ شاعر (ممبئی) ادب ساز (دہلی) نے آپ پر گوشہ بھی چھاپے ہیں- آپ کی ادبی کاوشوں کو نہ صرف سراہاگیا بلکہ اسلامیہ یونیورسٹی بہاوپور، پاکستان کے شعبہ اردو سے آپ پر ایم فل کا مقالہ بھی تحریر کیاگیا اور وہاں کی طالبہ منزہ یاسمین کو ایم فل کی سند سے نوازا گیا- آپ سے کئی لوگوں نے بلکہ کئی ادباء و شعراء نے انٹرویوز بھی لئے- جن کو پڑھنے سے ادب کی اور خاص طور سے مغربی دنیا میں اردو ادب کی صورتحال سے آگہی ملتی ہے- حیدرقریشی بیک وقت ساری دنیا کے ادب پر گہری نظر رکھتے ہیں- آئے دن ہونے والی تبدیلیوں سے پوری طرح واقف ہیں- انہیں کو اپنے مضامین، تبصروں وغیرہ میں بیان بھی کرتے ہیں- آپ کی ایک خوبی یہ ھیکہ نوجوان قلمکاروں کی ہمت افزائی بھی کرتے ہیں اور چاہتے ہیں کہ وہ صحیح انداز سے اپنی تخلیقی

صلاحیتوں کو بروئے کار لائے اور ادب لکھتے رہیں۔ اسطرح انھیں اپنے عالمی جریدے جدید ادب میں جگہ بھی دیتے ہیں۔ اور انٹرنیٹ پر ہمیشہ دستیاب رہتے ہیں۔ کسی کو شکایت کا موقع نہیں دیتے اور نہ ہی ادھار کے قائل ہیں۔ ادھار سے میری مراد کوئی نووارد یا انجان شخص بھی ان سے رابطہ کرے تو اس کو فوری جواب سے نواز تے ہیں۔ اور صحیح اور درست مشوروں سے نواز تے ہیں۔ یہ ایک اچھے اور سچے ادیب بلکہ انسان کی نشانی ہے کہ وہ خود بھی درست رہے اور دوسروں کو بھی صحیح مشورہ دے۔ یہ وصف حیدرقریشی میں ہے۔ دنیا بھر کے تشنگان علم و ادب آپ سے رابطہ میں رہتے ہیں اور انھیں بغیر کسی تردد کے مدد فراہم کرتے ہیں۔

جیساکہ بتایا گیا کہ وہ ادب میں ہونے والی تبدیلیوں پر گہری نظر رکھتے ہیں۔ اور ادب کے متعلق بعض سوالات کے جوابات سے ان کی تبحرعلمی کا اندازہ ہوتاہے۔ اور ادب سے اور ادب کی اصناف سے کس حدتک وہ معلومات رکھتے ہیں اندازہ ہوتاہے۔ چنانچہ وسیم انجم نے جب آپ سے آزاد نظموں اور نثری نظموں سے متعلق پوچھا تو کیا جواب دیا۔

> "آزاد نظم شاعری ہے۔ لیکن نثری نظم شاعری نہیں ہے۔ اس میں شعری مواد تو ہوتاہے۔ لیکن شاعری نہیں بن پاتا۔۔۔ مغرب میں بے جا آزادی کے معاشرتی رجحان نے نثری نظم جیسی اصناف کو ادب کی سطح پر قبول کیاہے۔ لیکن ہم مغرب کی اندھی تقلید تو نہیں کرسکتے۔ ایک حدتک ہی ان کے فیوض سے استفادہ کرسکتے ہیں۔ مغرب میں شادی کے بغیر بچہ پیدا کرلینا عیب نہیں ہے۔ لیکن ہمارا معاشرہ اس "خوبی " کو قبول نہیں کرسکتا"۔ [3]

ثریاشہاب نے جب آپ سے یہ سوال کیا کہ:

---

[3]انٹرویز صفحہ ٦٦



"موجودہ زمانہ سائنس اور حقیقت پسندی کا زمانہ ہے۔ ان حالات میں شاعرانہ تصورات اور مبالغہ آرائی کا کیا مقام ہے"۔
تو آپ نے جو جواب دیا وہ واقعی عمدہ ہے۔ جواب ملاحظ ہو۔

حیدرقریشی: قدیم ادوار میں جو جادو کا تصور تھا وہ بھی حقیقتاً سائنس ہی تھی۔ البتہ تب اس زمانہ کے سائنس دانوں نے اسے اپنا راز بناکر رکھا اور جادو کا غلاف چڑھائے رکھا۔ شاعری اور فکشن کا معاملہ بھی یوں ہے کہ پرانی داستانوں کی مبالغہ آرائی انسان کو سائنسی ترقی کے اس حیرت انگیز دور تک لائی ہے۔ مثلاً قدیم داستانوں میں دیوؤں، پریوں، اڑن کھٹولوں اور اڑن قالینوں کے تذکروں پر غور کریں تو یہ اڑنے کی انسانی خواہش تھی جسے اس زمانے کے ادیبوں نے مبالغہ آرائی کی صورت میں بیان کردیا اور پھر اس خواہش کو زندہ رکھا۔ میں ایسی داستانوں کو اس زمانے کے فنکاروں کا تخلیقی کشف سمجھتاہوں۔ جو آج ہوائی جہاز اور راکٹ کی صورت میں ایک حقیقت میں فاصلہ کا تعین کرنا مشکل ہوجائےگا۔ پھر یہ بھی حقیقت ہے کہ ہر سائنسی انکشاف سائنسی زبان میں بھی پہلے فکشن ہوتاہے۔ بعد میں وہی فکشن سچ قرار پاتاہے۔ ادب طبعیات سے زیادہ مابعد الطبیعات میں اور ظاہری حقیقت سے زیادہ اس کے عقب میں چھپی ہوئی سچائی میں دلچسپی لیتاہے---- اسی لئے نامعلوم کی دریافت کا سفر ادب میں زیادہ اہم ہے----- اب تو ہماری جدیدتر

سائنس بھی Un known اور Mystry میں دلچسپی لے رہی ہے۔ اور سائنس دان خود اس عمل کے دوران حیرت زدہ ہیں۔[4]

[4] انٹرویوز صفحہ ۵۰،۵۱

حیدرقریشی کا حلیہ

موجودہ صورتحال کے تناظر میں دیکھاجائے تو حیدرقریشی واقعی جاذب نظر شخصیت کے مالک ہیں۔ میں نے انھیں بارہا انٹرنیٹ کی معرفت دیکھاہے۔ ان سے رابطہ ہوا اور انھوں نے اپنی رہائش گاہ کا بھی نظارہ رکروایا۔ ان ملاقاتوں میں یہ محسوس ہوا کہ حیدرقریشی نفاست پسند ہیں۔ خواہ وہ رہائش کے اعتبار سے ہو کہ لباس کے اعتبار سے۔ اتنا ہی نہیں ان سے متعلق جتنے انٹرویوزان کے متعلق لئے گئے ان سے بھی یہی نتیجہ اخذ کیاجاسکتاہے۔ البتہ ان کے روزمرہ کے معمولات ہوں یا خوردونوش کے معاملات ان میں انکی اہلیہ، بچے اور بہویں وغیرہ سےمعلومات ملتی ہیں۔

جرمنی میں رہنے کے باوجود حیدرقریشی نے اپنے گھریلو ماحول کو مشرقی انداز میں ہی رکھاہے۔ گھر کی تہذیب بالکل وہی ہے جو ہمارے مشرقی تہذیب ہوتی ہے۔ جسے ہم اسلامی معاشرے سے تعبیر کرتے ہیں۔ بڑوں کا ادب، چھوٹوں سے شفقت، رشتہ داروں سے حسن سلوک، اور وقت نکال کر اپنوں سے ملنا جلنا۔ یہ سب اقدار حیدرقریشی نے آج بھی اس تیزرفتار زندگی میں اور مغربی ماحول میں بنائے رکھا۔

گھر میں بچے بھی ہیں۔ پوتے، پوتیاں، نواسے نواسیاں سب آتے جاتے ہیں۔ مگر حیدرقریشی ایک مکھیاکی صورت میں نظر آتے ہیں۔ جنھیں صدرخاندان کہاجاسکتاہے۔ ہربچےکی تربیت آپ اپنے انداز میں کرتے نظر آتے ہیں۔ باقاعدہ عربی تعلیم کا انتظام قران خوانی کا اہتمام، بسم اللہ خوانی اور ختم قران وغیرہ اپنے افراد خانہ کے ہمراہ کرتے نظر آتے ہیں۔ ایسے سرعت زدہ اور تیز رفتار سائنسی ملک میں حیدرقریشی نے اپنی تہذیب کو برقرار رکھا۔ ان کے گھر جتنے بھی افراد رہتے ہیں وہ سب اردو لکھتے، پڑھتے اور بولتے ہیں۔ یہ کوئی معمولی بات نہیں ہے۔ آفرین صد آفرین کہنا پڑتاہے۔ حیدرقریشی اور آپ کے خاندانی افراد کو۔ کیونکہ انھوں نے تو اتنا کیا اور کرنا چاہا۔ ان کے افراد



خانہ جن میں انکی اہلیہ مبارکہ بھی قابل مبارکباد ہیں کیونکہ انھوں نے ایک مشرقی عورت، مشرقی ماں، مشرقی نانی، مشرقی دادی ہونے کا پورا پورا حق ادا کیا اور باقاعدہ اداکرتی جارہی ہیں۔ ساتھ ہی حیدرقریشی کے تمام لڑکے ہوں کہ لڑکیاں وہ بھی اطاعت گذار ، فرمانبردار نکلے اور انکی فرماں برداری کو بھی سلام کرنا پڑتاہے۔ ایسے ماحول میں انھوں نے اپنے والدین کی اطاعت بلکہ اطاعت کاملہ کا ثبوت دیا۔ اور اگر ایسا گھر کہیں ہوتو یقیناً والدین کے لئے ان کے اولاد اور اولاد کیلئے ان کے ماں باپ راحت و سکون کا موجب ہوتے ہیں اور شاید اسی رحت و سکون کو دنیاوی اعتبار سے جنت کہاجاسکتاہے اور کہا جانا چاہئے۔

ان تمام حالات کو دیکھنے کے بعد، ان سے انٹرنیٹ پر ملنے کے بعد ایک اندازہ قائم کرنا الگ ہے۔ مگر ان کی رفیق حیات سے ان کے حلیے کی بابت معلومات کرنا اور بات ہے۔ کیونکہ انھوں نے حیدرقریشی کو جس انداز میں پیش کیا وہ مناسب لگاہے۔ دوران انٹرویو انھوں نے حیدرقریشی کے حلیہ کی بابت بتاتے ہوئے اپنے ماضی میں چلی گئیں اور ایک قہقہہ لگاکر بتایا کہ

> "ویسے ان کی سنجیدہ تصویر ہمیشہ اچھی آتی ہے۔ آپ کے سوال سے تھوڑی غیر متعلق ایک بات بتاؤں۔ جوانی میں ان کے داڑھی تھی وہ داڑی واقعی اچھی لگتی تھی۔ جرمنی میں آکر انھوں نے داڑھی صاف کردی اور کہا کہ تم نے میری داڑھی کی تعریف کرکرکے مجھے داڑھی والا بنادیا، اور میری ساری جوانی خراب کردی۔ اب میں ان سے کہتی ہوں کہ آپ بغیر ٹوپی کے دانشور لگتے ہیں تو کہتے ہیں

جوانی خراب کرنے کے بعد اب میرا
بڑھاپا بھی خراب کرنا چاہتی ہو"[5]

یہ تو حلیہ کی بابت رہا۔ لباس سے متعلق بیوی، بچوں، اور بہوؤں نے ایک ہی جواب دیا۔ اور کیوں نہ ہو جو ہے وہی بات تو کہیں گے۔ مگر اہلیہ مبارکہ کے الفاظ جامع ہیں فرماتی ہیں۔

"گھر پر عموماً سلوار قمیص اور گھر سے باہر پتلوں شرٹ، ویسے ابھی حال ہی میں شیروانی تیار کرائی ہے اور ایک پگڑی بھی منگارکھی ہے۔ لیکن ابھی پہنی نہیں ہے۔ میرا خیال ہے اب یہ اپنے والد صاحب کے مقام پر فائز ہونے والے ہیں۔ پھوپھا جان نے بھی ایک عرصہ تک ٹوپی کے استعمال کے بعد پگڑی پہننا شروع کردی تھی"۔[6]

خوراک کے معاملہ میں البتہ خیالات مختلف ہیں مگر ان میں بھی یکسانیت پائی جاتی ہے۔

مبارکہ بیگم صاحبہ کے مطابق:

"صابرشاکر ہیں۔ جیسابھی مل جائے، کھاپی لیتے ہیں۔ کبھی کبھارٹی وی دیکھتے ہوئے ڈرائی فروٹ کھانے میں بدپرہیزی کرجاتے ہیں۔ تہاری اور پائے شوق سے کھاتے ہیں"[7]

بڑی بیٹی، رضوانہ حفیظ کے مطابق:

"ہر قسم کے سالن کے ساتھ دال طلب کرتے ہیں"[8]

شعیب حیدربڑے بیٹے کے مطابق :

"پاکستانی کھانے، روٹی سالن اور کبھی کبھار بریانی"[9]

---

[5] انٹرویوز، مرتب سعید شباب، صفحہ ۱۴۷، ۲۰۰۴ء
[6] انٹرویوز، مرتب سعید شباب، صفحہ ۱۴۸، ۲۰۰۴ء
[7] انٹرویوز، مرتب سعید شباب، صفحہ ۱۴۸، ۲۰۰۴ء
[8] انٹرویوز، مرتب سعید شباب، صفحہ ۱۵۲، ۲۰۰۴ء
[9] انٹرویوز، مرتب سعید شباب، صفحہ ۱۵۴، ۲۰۰۴ء

نسیم حیدر، بڑی بہو کے مطابق :

"سالن کوئی بھی ہوساتھ تھوڑی دال ضرور لیتے ہیں"[10]

نادیہ حیدر، دوسری بہو کے مطابق۔

"سب کچھ کھا لیتے ہیں، کبھی کبھی دال کی فرمائش کرتے ہیں"[11]

بیٹی اور بہوؤں کے مطابق یہ کچھ بھی مگر دال ضرور پسند کرتے ہیں۔ اور بیوی اور بیٹے نے دال کے متعلق کچھ نہیں کہا۔ اس سے اندازہ ہوتاہے کہ حیدرقریشی میں سنجیدگی کے ساتھ انکساری اور سادگی موجود ہے۔ کیونکہ میری دانست میں مرغن غذائیں ہمیشہ کھائی نہیں جاتیں۔ اور دال ہمیشہ کھائی جاسکتی، مرغن غذا ہونے کے باوجود دال کی فرمائش کرنا یہ دال کرتاہے ان کی سادگی پر اور وہ ایک نارمل لائف گذارنے کے عادی ہیں۔

حیدرقریشی کی ادبی زندگی تو ادبیوں نے اور ادب دوستوں نے ان کے ادب کو پڑھ اور سن کر بہت کچھ کہاہے۔ مگر وہ ایک کثیرالجہت ادیب اپنی نصف بہتر کی نظر میں کیا ہے۔ یہ ان کی اہلیہ کے مطابق یہ ہے:

"ادبی زندگی تو خیر ٹھیک ہے۔ لیکن اب جو انہوں نے انٹرنیٹ پرادبی کام شروع کئے ہیں۔ ان سے میں بہت تنگ ہوں۔ ہروقت کمپیوٹرمیں گھسے بیٹھے ہیں۔ جاب پر جانے سے پہلے انٹرنیٹ پر ہوتے ہیں۔ جاب سے آتے ہی انٹرنیٹ پر بیٹھیں گے۔ ڈاک دیکھیں گے جواب لکھیں گے، پھر کھانا کھائیں گے۔ کھانےکے بعد ٹی وی پر خبریں دیکھتے ہی پھر انٹرنیٹ پر چلے جائیں گے---

[10]انٹرویوز، مرتب سعید شباب، صفحہ ۱۵۶، ۲۰۰۴ء
[11]انٹرویوز، مرتب سعید شباب، صفحہ ۱۵۸، ۲۰۰۴ء

میں کمپیوٹر والے کمرے کو اپنی سوتن کا کمرہ کہتی ہوں"۔ [12]

"میں عموماً ان کی ادبی زندگی کی مصروفیت کی وجہ سے نالاں رہتی ہوں۔ میں گھر پر ہوتی ہوں تو ان کے اپنے ادبی کاموں سے فرصت نہیں ہوتی۔ ایک بار میں دودن کیلئے اپنی بیٹی کے ہاں گئی۔ واپس آئی تو کہنے لگے کہ آپ گھرپر موجود ہوں تو آپ کی موجودگی کے احساس کے باعث خودبخود ادبی کام ہوتارہتاہے لیکن آپ گھر پر نہیں تھیں تو کسی قسم کا کام کرنے کو جی نہیں چاہا۔ یہ ان کے لئے بھی انکشاف تھا اور میرے لئے بھی۔ لیکن یہ واقعی ایک خوشگوار حقیقت ہے۔ [13]

ان تمام انٹرویوز کو دیکھنے کے بعد آپ کے حلیہ، لباس، غذا اور ادبی اہمیت کے ساتھ ساتھ گھریلو معاملات میں وہ کس قدر کامیاب زندگی گذار نے والوں میں سے ہیں۔ ان کے مزاج کے متعلق مختلف خیالات یہ ہیں۔

بیوی (مبارکہ) :

بہت میٹھے اور بہت کڑوے، اپنے ہررویے میں انتہاپسند۔انسان کو تھوڑا بہت مصلحت پسند ہونا چاہئے۔ [14]

بھائی، اعجاز حیدر (فرانس)

"آج کل میرے ساتھ کچھ گرم ہیں، ویسے ٹھیک ہیں۔[15]

[12] انٹرویوز، مرتب سعید شباب، صفحہ ۱٤۹، ۲۰۰٤ء
[13] انٹرویوز، مرتب سعید شباب، صفحہ ۱٤۹، ۲۰۰٤ء
[14] انٹرویوز، مرتب سعید شباب، صفحہ ۱٤۸، ۲۰۰٤ء
[15] انٹرویوز، مرتب سعید شباب، صفحہ ۱۵۰، ۲۰۰٤ء

بیٹی، رضوانہ حفیظ:

"جب غصہ آتاہے تو کسی چھوٹی سی بات پر بھی آجاتاہے۔ نہیں آتا تو بڑی بات کو بھی نظر انداز کردیتے ہیں۔ ویسے عام طورپر نرم طبیعت کے ہیں۔[16]

بڑالڑکا، شعیب حیدر:

"پہلے تھوڑے سخت مزاج کے تھے، اب قدرے نرم مزاج ہوگئے ہیں"[17]

تسنیم حیدر، بڑی بہو:

"عام طورپر نرم ہیں۔ مگر جب غصے میں آتے ہیں تو بہت زیادہ سخت ہوجاتے ہیں"[18]

نادیہ حیدر، دوسری بہو:

"جب نرم ہوتے ہیں تو بہت نرم ہوتے ہیں۔ ایسا لگتاہے کہ انھیں غصہ بھی آتاہوگا۔ مگر جب غصہ کرتے ہیں تو بہت غصہ کرتے ہیں"[19]

ان تمام واقعات سے حیدرقریشی کی شخصیت اور ادب میں آپ کا کیا مقام ہے اندازہ ہوتاہے۔ آپ کی شخصیت اور سوانح سے درون خانہ اور بیرون خانہ کا بخوبی پتہ لگایاجاسکتاہے۔ مگر انسان یہ وہ شئے یا قدرت کی وہ تخلیق ہے جسے سمجھنا آسان ہی نہیں دشوار ہے۔ کیونکہ وہ بھی کئی پرتوں میں نہاں ہوتاہے۔ مگر ان کی تحریر، ان کی بول چال، انداز گفتگو اور رہن سہن ان سب کو عیاں کردیتاہے۔ اور حیدرقریشی بھی ہمارے سامنے عیاں ہیں۔ اپنی تحریروں کے ذریعہ، اپنی طرزگفتگو کے ذریعہ، اور رہن

---

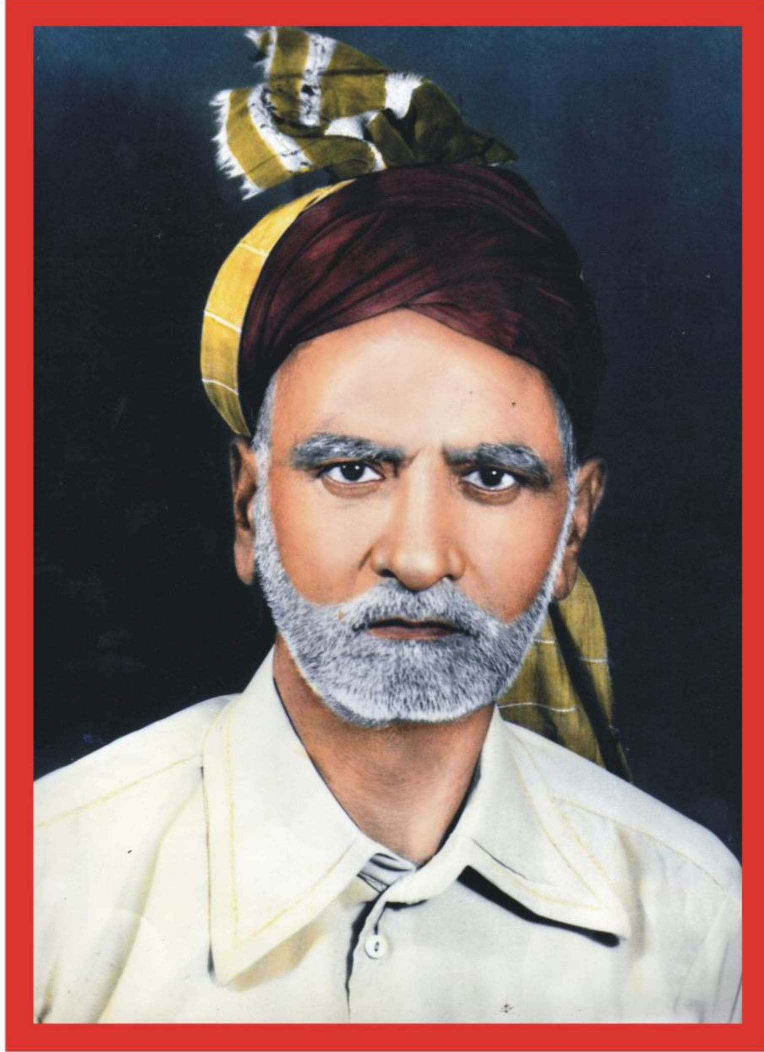
[16] انٹرویوز، مرتب سعید شباب، صفحہ ۱۵۲، ۲۰۰۴ء
[17] انٹرویوز، مرتب سعید شباب، صفحہ ۱۵٤، ۲۰۰۴ء
[18] انٹرویوز، مرتب سعید شباب، صفحہ ۱۵٦، ۲۰۰۴ء
[19] انٹرویوز، مرتب سعید شباب، صفحہ ۱۵۸، ۲۰۰۴ء



سہن کے علاوہ اپنے ادبی حلقے میں اور دوستوں کے ساتھ تعلقات کی بناپر وہ سب پر عیاں ہیں۔ کوئی ایسی بات ڈھکی چھپی نہیں ہے۔ بلاشبہ ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ ایک اچھا ادیب، فنکار، محقق، نقاد اور ان سب سے بڑھ کر ایک اچھا اور سچا انسان کا نام حیدرقریشی ہے۔

*****

حیدرقریشی کا فوٹو البم "زندگی بھر کا سفر"



والدِ بزرگوار قریشی غلام سرورصاحب مرحوم

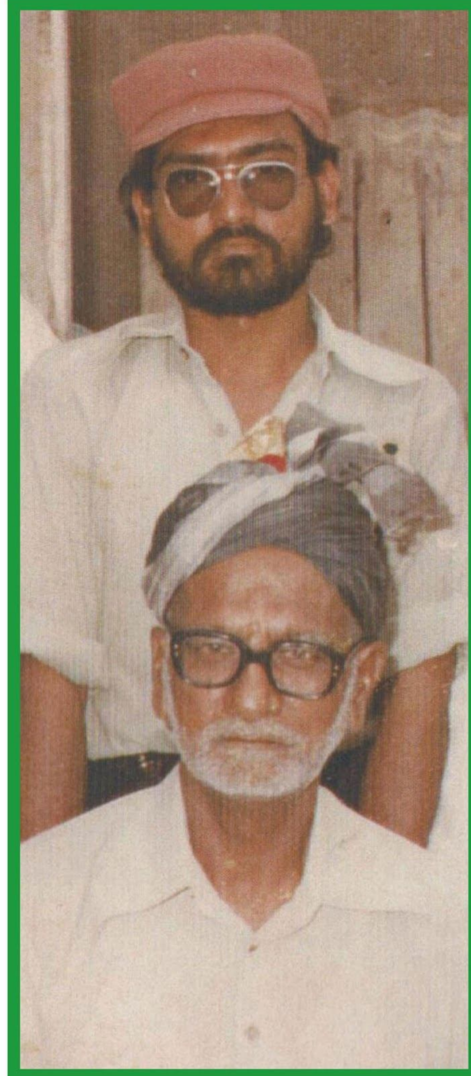


1958



1998

صرف یہ عمرِ گریزاں ہی نہیں کرتی اداس
میرا ہنستا ہوا بچپن بھی رلاتا ہے مجھے





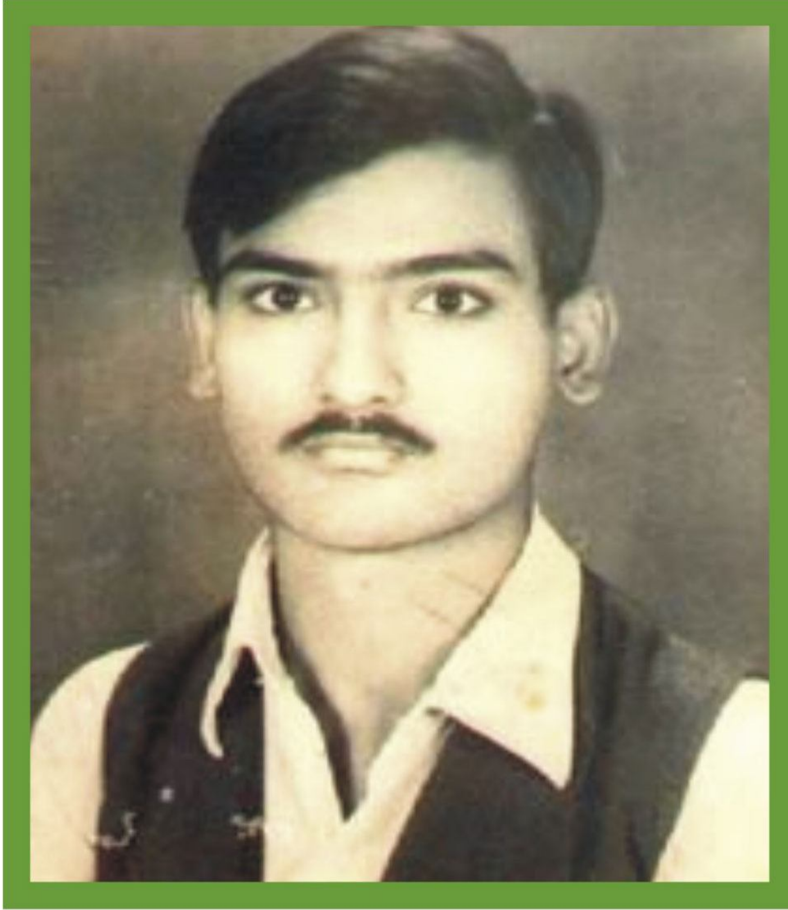
1968

تھے اپنی ہی لہروں میں
عمر گذاری جو
پنجاب کے شہروں میں



1969

یادوں کے خزینے میں
خانپور اپنا تو
آباد ہے سینے ۔میں



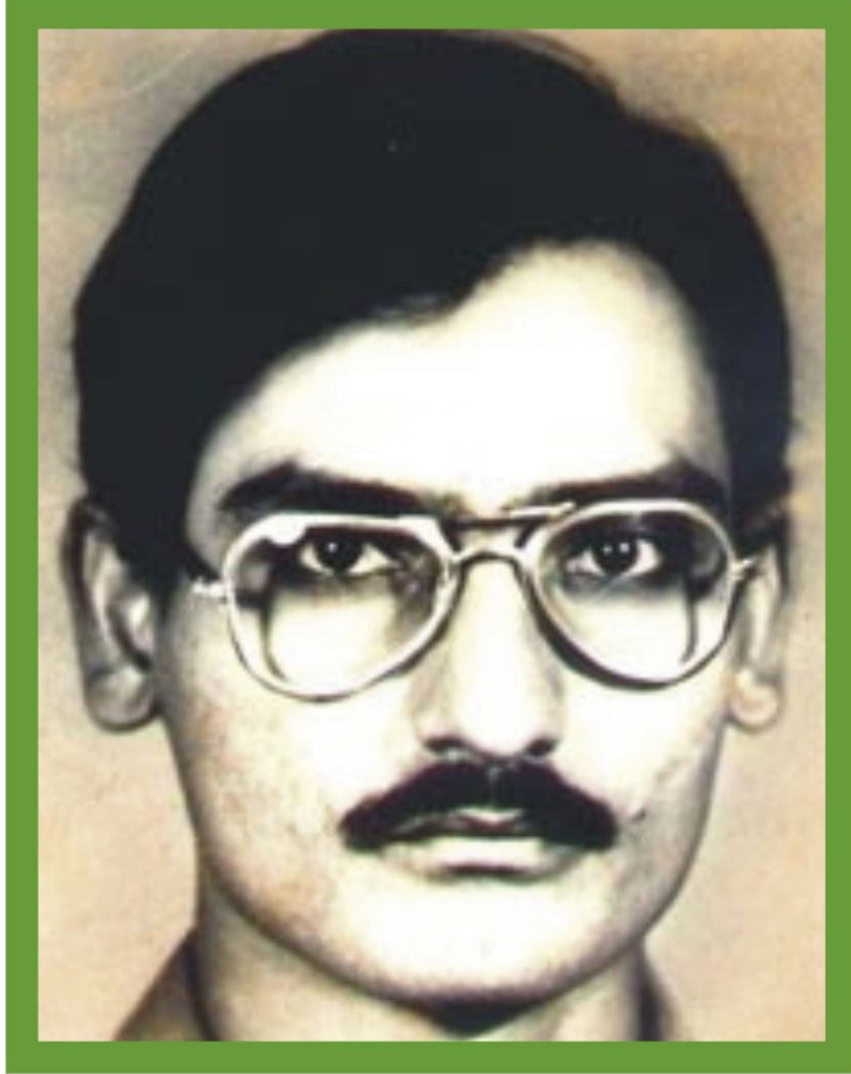
1970

چمبیلی کی کلیاں تھیں
اپنی جوانی تھی
او رشہر کی گلیاں تھیں



1970

جہاں بھر میں ہمارے عشق کی تشہیر ہوجائے
اُسے کس نے کہا تھا دل پہ یوں تحریر ہو جائے



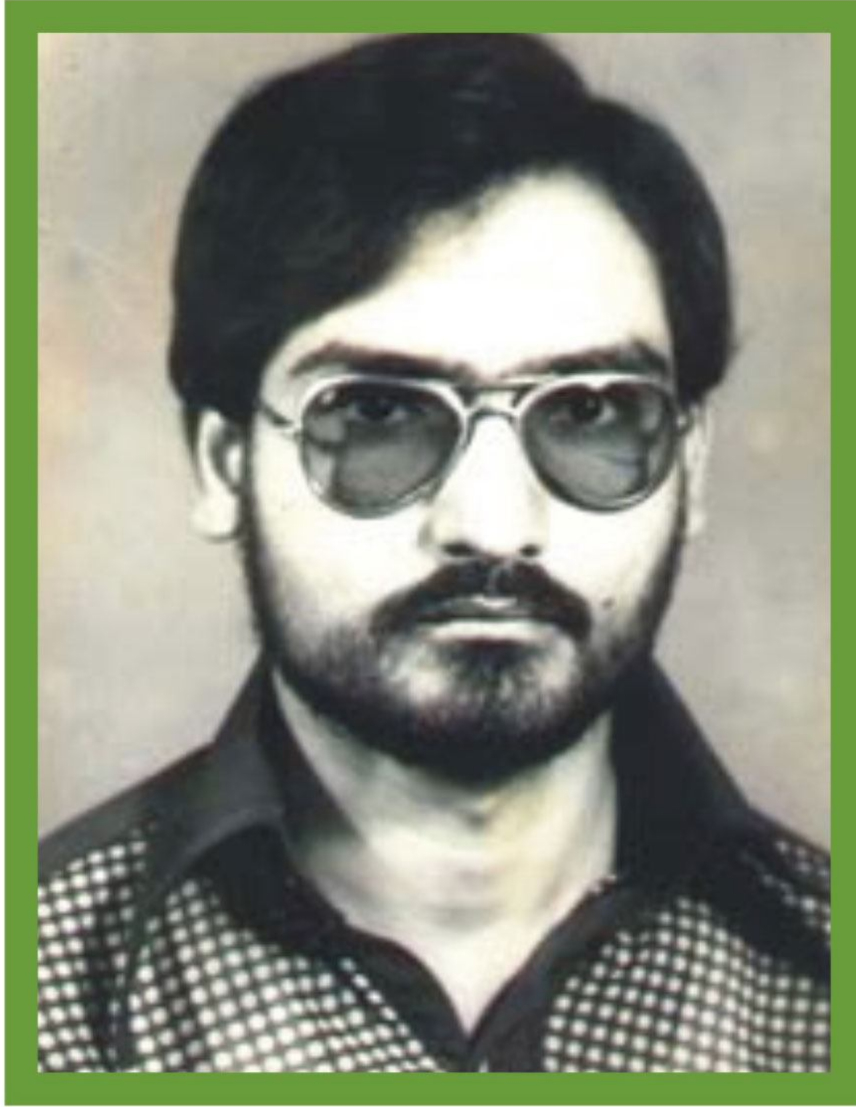
1974

خوشی کے لمحے لکھو، عمر اضطراب لکھو
نکالو وقت کبھی عشق کا حساب لکھو



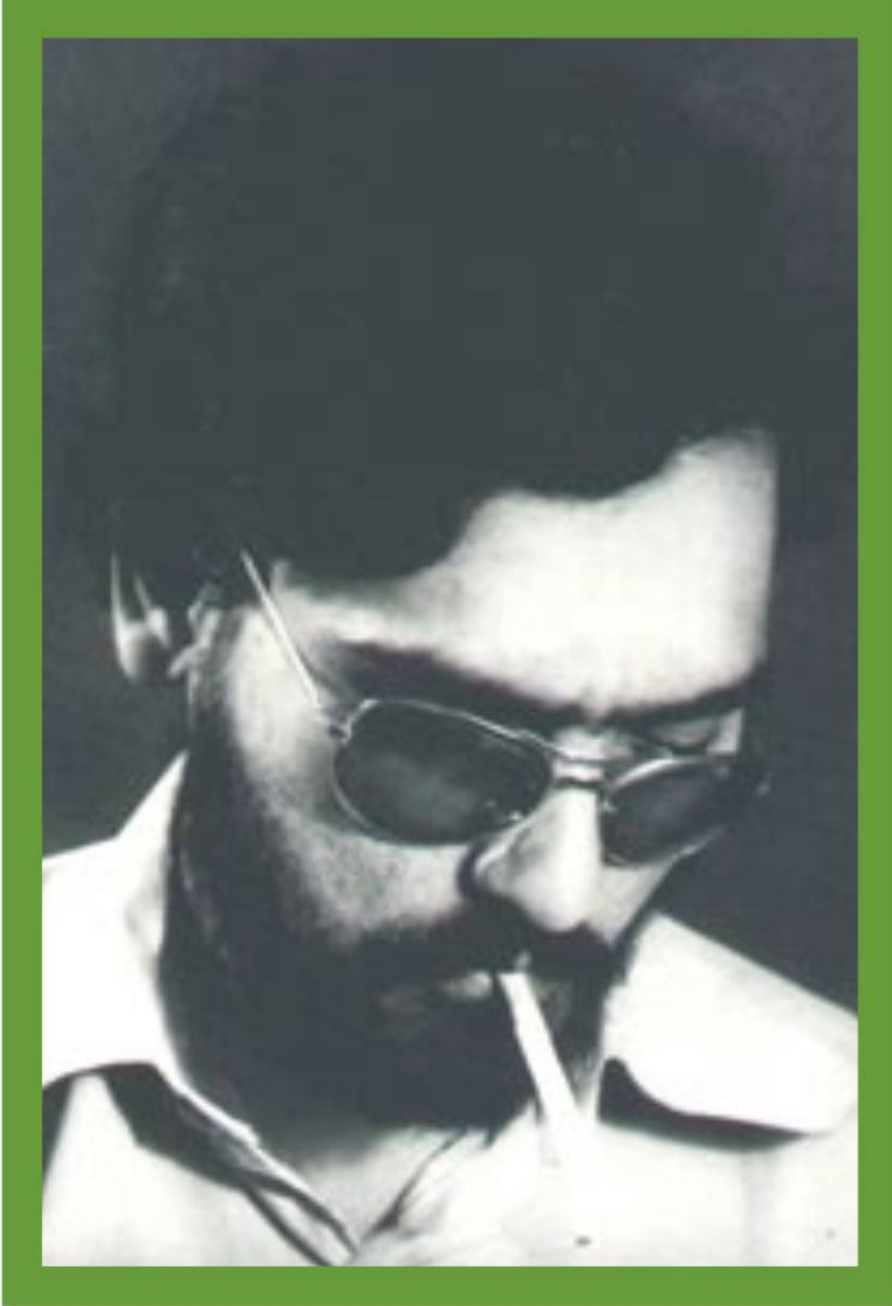
1975

اپنی کچھ نیکیاں لکھنے کے لئے بھی حیدرؔ
اپنے ناکردہ گناہوں سے سیاہی مانگوں



1976

وہ جو حیدرؔ مِرے منکر تھے مِرے ذکر پہ اب
چونک اُٹھتے ہیں کسی سوچ میں پڑ جاتے ہیں



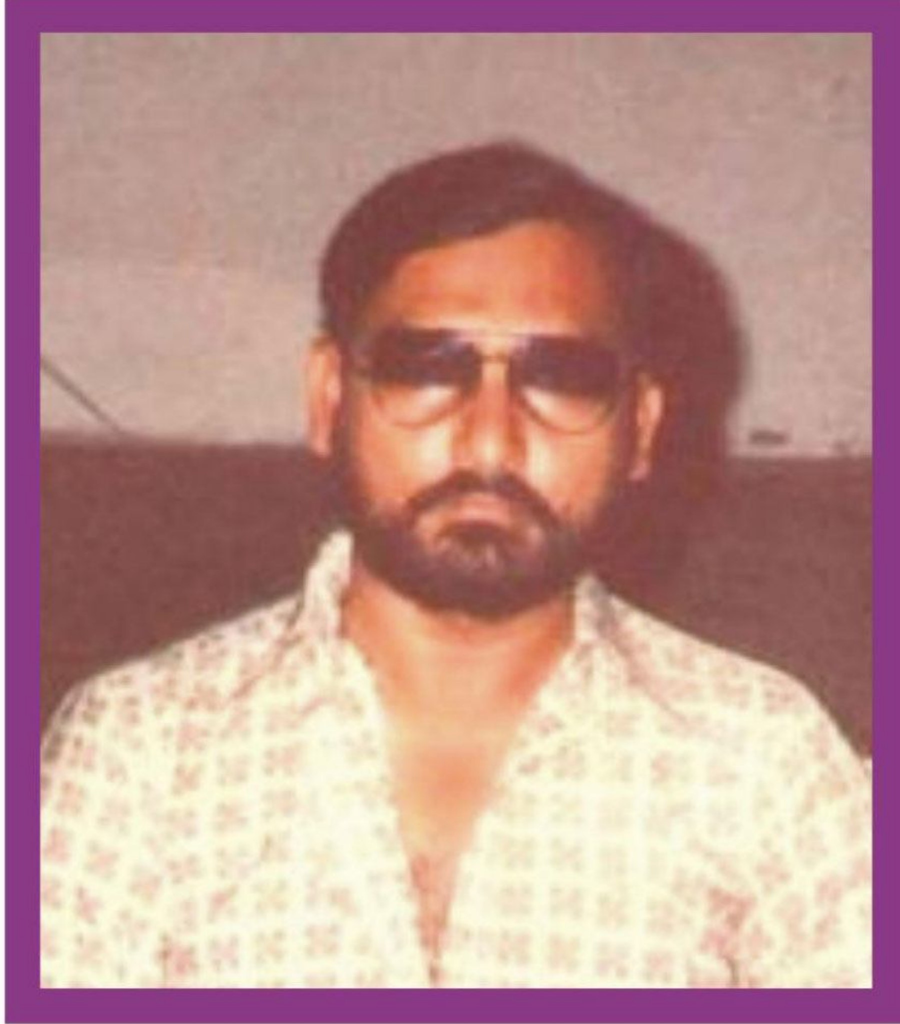
1977

منزلوں نے تو مجھے ڈھونڈ لیا تھا حیدرؔ
پھر مِرا شوق سفر مجھ کو چُرا لایا تھا



1980

اِس حال فقیری میں
عمریں بیت گئیں
زلفوں کی اسیری میں



1985

چار قدموں کا ہے زندگی کا سفر
دو قدم چل چکے، دو قدم رہ گئے



1986

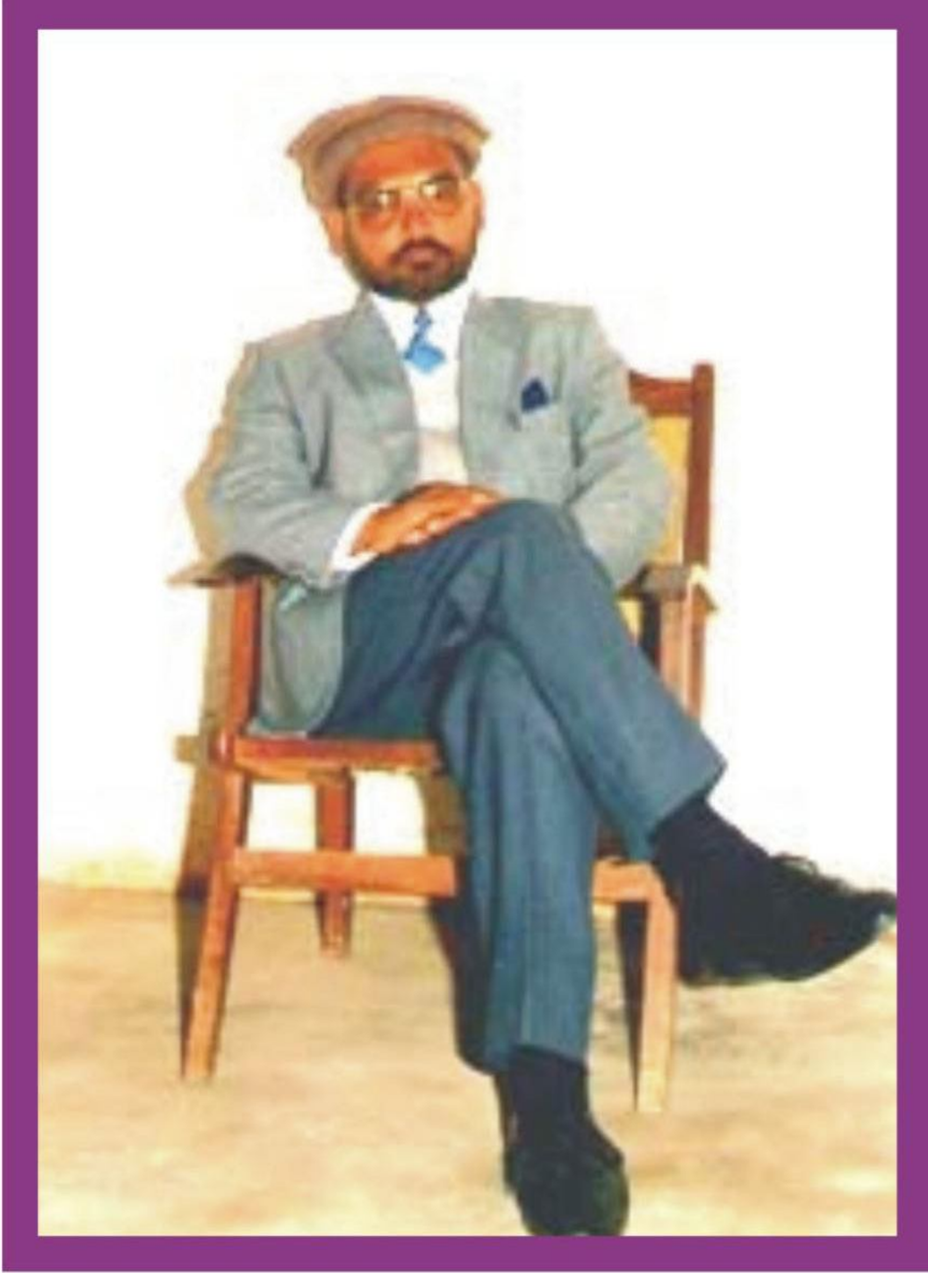
شہر کی گلیوں نے چومے تھے قدم رو رو کر
جب ترے شہر سے یہ شہربدر آئے تھے





1987

ابھی ممکن ہی نہیں قرض چکانا تیرا
زندگی! قرض ترا ہوگا اَدا میرے بعد



1991

عشق میں اپنی ہی جب خاک اُڑالی ہم نے
پھر وہی خاک ترے پیار پہ ڈالی ہم نے



1991

ڈھنگ کا کام کوئی ہم سے کبھی ہو نہ سکا
یوں تو سرسوں بھی ہتھیلی پہ جَما لی ہم نے



1992

اس سے بچھڑ کے آئنہ دیکھا تویوں لگا
ہاتھوں میں اپنے عمر رواں بھی نہیں رہی



1994

یہ بال و پر تو چلو آگئے نئے حیدر
بلا سے پہلے سے اپنے وہ خال و خدنہ رہے



1994

دو پہر جوانی تھی
پل میں بیت گئی
پھر شام سہانی تھی



1995

عمر کی ناپائیداری کا بھی کچھ تو سوچتے
وصل کی تاریخ کو اگلے برس کرتے ہوئے



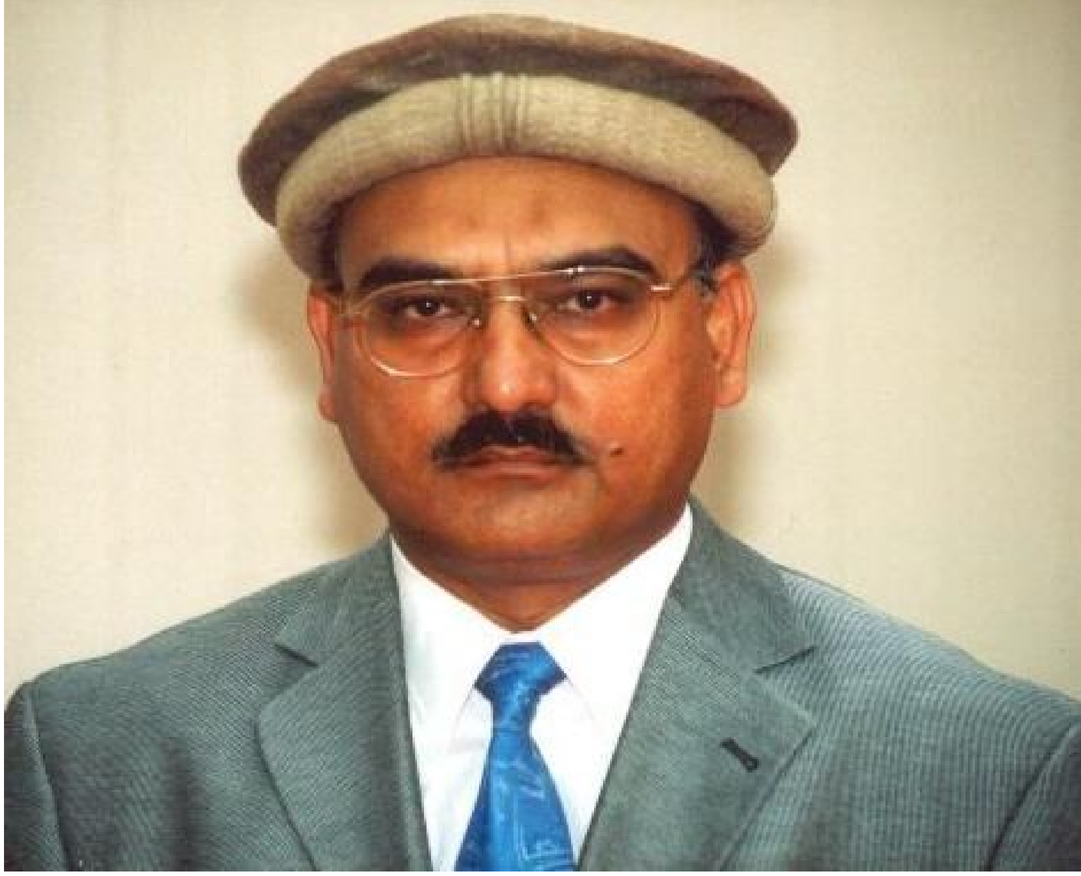
1996

اک عجب عالمِ برزخ میں ہی رکھا اس نے
نہ کبھی قرب ہی بخشا نہ جدائی دی ہے



1996

صرف گناہوں کا ہی بوجھ نہیں سر پر
اپنے نیک اعمال بھی ہم کو ڈھونے ہیں



2000

وہ بھی تھا کچھ ہلکے ہلکے سے میک اپ میں
بال اپنے ہم نے بھی کالے کر رکھے تھے



2008

بہت سی بے نیازی اور اک یادوں بھری گٹھڑی
بڑا سامان اپنی خستہ سامانی میں رکھا ہے
یہاں سے رونقیں دکھ درد کی جاتی نہیں حیدرؔ
دکھوں کا ایسا میلہ اپنی ویرانی میں رکھا ہے



2012

اور تھے حیدرؔ جو اس کی چاہ میں مرتے رہے
ہم نے الٹے ہاتھ سے جھٹکی ہوئی ہے زندگی



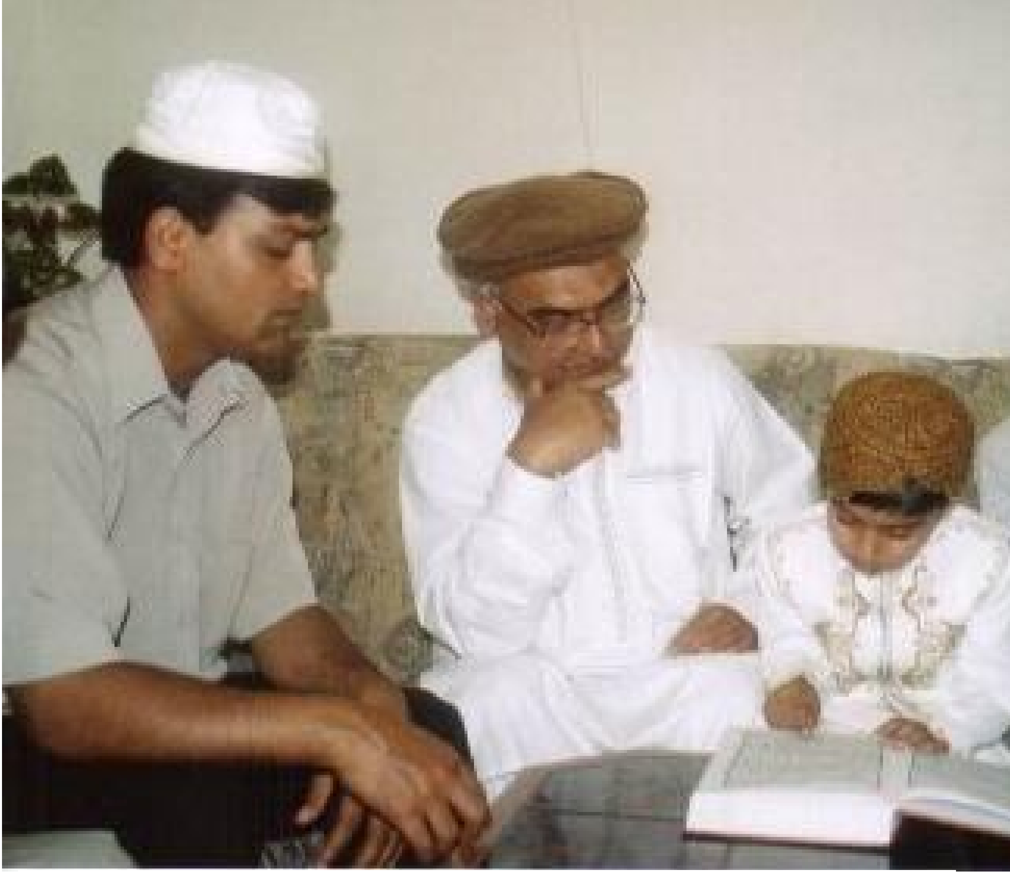
دریا کی روانی ہے
اب مِرے بیٹوں میں
مِری گزری جوانی ہے



ماہ نور کی آمین کی تقریب



ماہ نور کی آمین پرعلیشا بھی ساتھ موجودہے۔



شہر یار حیدر کی آمین کے موقعہ پر حیدر قریشی اور شعیب حیدر


باب دوم
جہت شعر

اردو غزل

اردوغزل نے ولیؔ کے زمانے ہی سے وہ شہرت حاصل کی کے جو خود کو اہل زبان جانتے تھے اور اس علاقہ یعنی دکن (دلی کے علاقے) کی زبان کو لچرسی کہتے میں تامل بھی نہ کرتے تھے انہوں نے بھی بالآخر اس میں طبع آزمائی کو اپنے لئے باعث فخر جانا۔ کیونکہ غزل میں انسانیت کی اور انسانی رشتگی اور ہمدردی رچ بس گئی تھی جو کس بھی طرح جدا ہونے کا نام ہی نہ لیتی۔ یہ بھی شاعری کی اردو تھی، میری مراد اردو زبان نے بھی ہزار زخم کھائے مگر ہمیشہ مسکراتی ہرشخص کو گلے لگاتی رہی سب سے محبت کا سلوک روارکھتی اور اپنے دامن میں جگہ دیتی چلی گئی، جس نے اسے چاہا اسے بھی اور جس نے اس کو دھتکارہ اسے بھی۔ بقول جگر مرادآبادی ؎

ان کا جو کام ہے وہ اہل سیاست جانیں
میرا پیغام محبت ہے جہاں تک پہنچے

غزل میرؔ و سوداؔ کے عہد میں ہی اپنی معراج پر پہنچ گئی، مگر اس میں اتنی توانائی اور قوت آگئی کے اب وہ علاقائیت سے درگذار کرکے آفاقیت کا سفر اناً فاناً طے کرلیا۔ دنیا کی یہ کمسن زبان ہوتے ہوئے بھی دنیا کی بڑی زبانوں سے آنکھیں چار کرنے لگی۔ اور اپنے ہونے کا ثبوت اس نے اگر کہیں دیا ہے تو وہ غزل کے ذریعہ سے۔ آج بھی ساری دنیا اس کی اسیر ہے۔ اس کی تراجم مختلف زبانوں میں ہوئے۔ اور اس نے ایک مقام حاصل کرلیا۔ میرؔ کے بعد غاؔلب نے زندگی کے مختلف بلکہ ہر شعبہ حیات کا تجزیہ بہ انداز غزل پیش کردیا اور نہ صرف غزل بلکہ غالب بھی یعنی غاؔلب سے اردو غزل پہچانی جانے لگی۔ فلسفہ ہوکہ حکمت، طنزہو کہ مزاح، عسر ہو کہ یُسر، تنگی ہو کہ

خوشحالی، زندگی ہو کہ موت، غرض ہر اس شئے کو غالبؔ نے انتہائی غور سے ان کا مشاہدہ کیا اور اسے غزل کے انداز میں برتا۔ اسطرح غزل نے شہرت کی منزل کو پالیا۔

ابتدائے آفرینیش سے جوطرز چلی آئی ہے بھلا اس سے غزل کیسے بچ رہتی چنانچہ اس پر بھی مصیبتوں کے پہاڑ ٹوٹے، یہ بھی اپنے دامن کو داغدار ہوتے دیکھنے لگی۔ اپنی بے گناہی کا ثبوت اس کے چاہنے والوں نے پیش کرنے کی سعی حتی المقدور کبھی شعرسے اور کبھی نثر سے کرنے میں جٹ گئے۔ کیونکہ تاریخ شاہد ہے کہ ہمیشہ ہی اچھوں اور سچوں کو ستایا گیا، انھیں اپنی سچائی اور بے گناہی کے ثبوت پیش کرنے پڑے، حالانکہ وہ گنہ گار نہ ہوتے ہوئے بھی، گنہ گاروں کی زندگی گذارنے پر مجبور ہوئے، اور جس نے بھی اپنے مکروفریب سے اچھائی اور سچائی کو کالک پوتنے کی کوشش کی خود ان کے چہرے سیہ پوشنی سے چمکنے لگے۔ بعینہ غزل نے بھی اس دور سے نہ صرف گذری بلکہ ہر ہر تحریک اور ہر ہر بدلتے وقتوں میں اس نے اپنے جگرپر پتھر رکھ کر اپنی زندگی کا اور زندہ رہنے کا ثبوت پیش کیا۔ دنیا میں جب بھی تبدیلیاں واقع ہوئیں، جب بھی انقلاب آئے یا لائے گئے غزل نے اپنی روشن خیالی کا ثبوت پیش کردیا اوریہ اپنے عصر کے ساتھ شانہ بہ شانہ، کندھے سے کندھا ملاتی چلتی رہی۔ اس نے ہمیشہ ہی زمانے کا ساتھ دیاہے۔ حسرؔت موہانی نے کہاتھا ؂

فطرت میں سلسلہ ہے کمال و زوال کا
گھٹنا ہے بدر کا تو ہے بڑھنا ہلال کا

اور جب حلقہ ارباب ذوق نے اپنا علم بلند کردیا تو غزل ان کی ترجمان بن گئی۔ ان کے ساتھ دینے لگی اور نئے نئے تراکیب، نئی لفظیات سے اپنے آپ کو سجانے سنوارنے لگی۔ جس نے کبھی محلوں میں اپنی آنکھیں کھولی تھی، وہ محلوں میں راج کرتی نظر آتی، اور پھر محلوں سے وہ کوٹھوں کی زینت بنی، وہاں سے نکل کر عوام میں آئی اور عوامی ترجمانی کرنے لگی۔



اس طرح وہ عوام سے ہوتے، خواص میں اپنی جگہ بنالی، اور ہر دور اور ہر مقام سے سالم اور ثابت گزرتی اپنے آپ کو بچاتی اور اپنی آبرو کو قائم رکھتی ہوئی چلتی رہی۔ یہاں تک کہ جب جدیدیت والوں نے پھر سے علاقائیت کی بات شروع کردی تو غزل کو بھلا کونسی دشواری تھی، کیونکہ یہ تو اس کا اپنا میدان تھا۔ چنانچہ اس نے ہر علاقے کو اپنے دامن میں جگہ دیتی، ہر شہراور گاؤں کی لفظیات اور تراکیب، تشبیہات و استعارات اور علائم کو استعمال کرتی نظر آتی ہے۔ چنانچہ یہ صرف برصغیر ہندوپاک میں ہی نہیں بلکہ اب یہ جرمنی کی زبان بھی بولتی ہے۔ انگلستان اور امریکہ کی زبان بھی جانتی ہے، اسپین اور روس کی زبان بھی بولتی ہے۔ اور چین و جاپان کی زبان بھی۔ اب اس نے سارے جہان کو ایک علاقہ تصور کرتے ہوئے ان سے گویا ہے۔ وہ ایران ہو کے سعودی عرب ہر شخص اب غزل کی زلفوں کا اسیر ہوگیاہے۔

ادب جسے سماج کا آئنہ دار قرار دیاگیا۔ وہ جہاں سماج میں ہونے والے واقعات کی ترجمانی ہی نہیں کرتا بلکہ ان کی تہذیب و تمدن میں بھی اپنا رول ادا کرتاہے۔ غزل نے بھی ہر دور کی عکاسی کی ہے۔ ہاں اس کا میڈیم البتہ محبوب رہا۔ اور بعض جگہ تو راست بیانی سے بھی کام لیا۔ ہندوستان کے برخلاف پاکستانی ادب یا پاکستانی غزل پر نظر ڈالتے ہیں تو وہاں کی مطلق العنانیت، ڈکٹیٹرشپ، مارشل لاکے تناظر میں غزل نے بھی اپنے آپ کو آہنی بنالیا اور آہنی لفظیات کے ذریعہ اظہار خیال کیا۔ اس کی تلمیحات، لفظیات بھی اور طرح کی رہی ہیں۔ فیض احمد فیض، وزیرآغا، عبیداللہ علیم، حمایت علی شاعر، احمد ندیم قاسمی، احمد فراز، افتخار عارف وغیرہ نے جس انداز کی غزلیں کہیں ہیں ان میں وہاں کی گھٹن کا صاف لفظوں میں احساس ملتاہے۔

میں کون ہوں، کیا ہوں، مری
تحریر کہے گی
خاموش رہوں تو میری



تصویر کہے گی[20]

جینا بھی اک الزام ہے، مرنا بھی اک الزام
اے کاش ہم اس ملک کے فنکار نہ ہوتے[21]
ایسی عبارتیں تھیں کہ پڑھنی محال تھیں
تحریر کی جگہ بھی اشارے لکھے گئے[22]

تم تکلف کو بھی اخلاص سمجھتے ہو فراز
دوست ہوتا نہیں ہرہاتھ ملانے والا[23]

روز اک تازہ قصیدہ نئی تشبیب کے ساتھ
رزق برحق ہے تو یہ خدمت نہیں ہوگی ہم سے[24]

۱۹۷۰ء کے بعد ادب کے مختلف اصناف میں جہاں واضح تبدیلیاں دیکھنے کو ملتی ہیں وہیں غزل میں بھی تبدیلیاں نظر آتی ہیں۔ اس دور کے مسائل، اس دور کے حالات، جہاں فسادات کے موضوعات، ہجراور کرب کے موضوعات ملتے ہیں ان پر بھی ہمارے شعراء نے غزل کے ذریعہ کھل کر اظہار کیاہے۔ ان میں نئی لفظیات اور نئی تراکیب بڑے ہی سبک انداز میں ملتے ہیں۔ اب غزل کی وہ غنائیت نہیں رہی اس میں بھی جیسا کہ سطور بالا

---

[20]) ج۔ علی شاعر۔ ج۔۱۔ص ۱٤۲۔ شمارہ ۱٤
[21]) ج۔۱۔ص ۱٤۵ شمارہ ۱٤، حمایت علی شاعر
[22]) اکبر حمیدی، ج۔۱۔ص ۱۱۰، شمارہ ۱۵
[23]) احمد فراز
[24]) افتخار عارف، مہر دونیم



میں کہاگیاہے کہ آہن پوشی درآگئی۔ اور کھنک دار اور زبردست لہجہ آگیا۔ مختلف شعراء نے مختلف انداز میں ان مسائل اور حلات کو غزل میں پیش کیا۔

لمبی سڑک پہ دور تلک کوئی بھی نہ تھا
پلکیں جھپک رہاتھا دریچہ کھلاہوا[25]

کچھ یاد گار شہر ستمگرہی لے چلیں
آئے ہیں اس گلی میں تو پتھر ہی لے چلیں[26]

۱۹۷۰ء کے اس ہجوم غزل گویاں میں ایک نام حیدرقریشی کا ملتاہے۔ جو ہیں تو اصلاًپاکستانی، مگر بقول شخصے
ہر ملک، ملک ماآست کہ ملک خدائے ماآست
آجکل جرمنی میں مقیم ہیں۔ غزل میں ایک انفرادیت جھلکتی ہے۔ اور اس ہجوم میں بھی انھوں نے اپنی پہچان بنانے میں کامیاب ہیں بقول وزیرآغا۔

حیدرقریشی کی غزل کا جائزہ لیں تو بہت ساری کیفیات کا اندازہ ہوتاہے۔ کہ یہ وہ غزل کا شاعر ہے جس کے یہاں غزل کا بانکپن بھی موجود ہے اور آہنی کیفیت بھی، ان کی غزل میں جہاں سہل ممتنع کا وصف پایاجاتاہے وہیں تلمیحات کے باب میں ازمنہ تاریخ نظرآتی ہے۔ تشبیہات انوکھی اور اپنے عصر سے ماخوذ اور سائنسی لفظیات کا استعمال، جمالیاتی فضا سے معمور اور ہجرکے لمحات کا ذکر، زندگی اور اس کی تلخ سچائیوں کا اظہار، اس کے ساتھ ساتھ پنجابی لہجہ اور سرائیکی لفظوں کا استعمال، آپ بیتی بھی ہے اور جگ بیتی بھی، تجاہل کا رنگ بھی

---

[25] محمد علوی
[26] ناصر کاظمی



ہے اور سری الفہم انداز بھی ہے، اساتذہ کی روایت بھی جھلکتی ہے اور اپنا انداز بیان بھی موجود ہے۔ بہرحال حیدرقریشی کی غزل مشرقی اورمغربی پہلواپنے جلو میں لئے ہمارے سامنے آتی ہے۔

اساتذہ سلف میں ہم دیکھتے ہیں کہ میرتقی میؔر کی غزل گوئی کا اعتراف کن کن انداز میں کیاگیا۔ استاد شہ حضرت ذوقؔ دہلوی نے جب یہ کہا کہ

نہ ہوا پر نہ ہوا میؔر کا انداز نصیب
ذوقؔ یاروں نے بہت زور غزل میں مارا

اور غالب نے کچھ اس انداز سے گویائی کی ؎

ریختہ کے تمھیں استاد نہیں ہو غالبؔ
کہتےہیں اگلے زمانے میں کوئی میر بھی تھا

مولانا حالیؔ کا انداز کچھ اس طرح کا تھا ؎

حالیؔ سخن میں شیفتہ سے مستفید ہے
شاگرد میرزا کا تو مقلد ہے میر کا

حسرت موہانی نے کچھ اس طرح سے خیال ظاہر کیاہے ؎

شعرمیرے بھی ہیں پردرد ولیکن حسرت
میرکا شیوہ گفتار کہاں سے لاوں

کچھ اسی طرح یا اس روش پر حیدرقریشی نظر آتے ہیں، انھوں نے اپنے عہد کے شاعر کو کس طرح خراج تحسین پیش کیا اور

اس میں کوئی غلو بھی نہیں بلکہ اعتراف ہے اور آج فی زمانہ وہ شخصیت جس سے حیدرقریشی نے استفادہ بھی کیا اور بقول ن کے گھائل بھی ہیں یقیناً قابل تعریف ہے دیکھئے حیدرقریشی کا انداز ؎

سارے اساتذہ ہیں مجھے محترم مگر
غالؔب کا معتقد ہوں محبت ہے میرؔ سے

حیدرؔ نئے ادب میں تو گھائل انھیں کا ہوں
رشتہ بہت ہی گہرا ہے آغاز وزیر سے

اب اندازہ لگایا جاسکتاہے کہ ان کے کلام میں غالؔب اور میؔر سے انسیت اور وزیؔر آغا سے گہری رشتگی کا تعلق کس طرح سے در آیاہے۔ غالؔب نے کہاتھا ؎

ناکردہ گناہوں کی بھی حسرت کی ملے داد
یارب اگر ان کردہ گناہوں کی سزا ہے

حیدرقریشی نے کچھ یوں کہاکہ ؎

بھیداپنے فقط ہمیں جانے
اپنے منکر نکیر بھی ہم ہیں

حالات حاضرہ پر حیدرقریشی کی کڑی نظر ہے اور کیوں نہ ہو کے وہ جہاں شاعر اور افسانہ نگار ہیں وہیں تنقیدی نگاہ بھی رکھتے ہیں اور صحافی بھی ہیں۔ حالات حاضرہ پر وہ بہ انداز مؔیر یعنی سہل گوئی سے کام لیتے ہیں۔ ؎



پتہ وہ دے رہا تھا منزلوں کا
جو خود ہی راہ سے بھٹکا ہوا تھا

منافقت کا ہنر آسکانہ حیدرؔ کو
ہنروروں میں یہی بے کمال باقی ہے

بھرم بھی بے وفائی کا ہمیں کو رکھنا پڑگیا
تمام بے وفاہی جب وفا شعار ہوگئے

اپنے دور میں جسے ہم ترقی یافتہ زمانہ کہہ رہے ہیں قدریں کسطرح پامال ہورہی ہیں بلکہ ہوچکی ہیں۔ جھوٹ نے سچ کو مات دیدی ہے اور ان حالات میں کوئی کیا کرے۔ جس کو اپنا سمجھ رہے تھے وہ بھی اپنا نہیں رہا، غاؔلب نے کہا تھا کہ

ہم بھی دشمن تو نہیں ہیں اپنے
غیر سے تجھ کو محبت ہی سہی

حیدرکا انداز کچھ یوں ہے ؎

بس مسکراکے پیار سے انکار کرگئے
اچھی طرح سے ان کو مکرنا نہ آسکا

جیسا کہ سطور بالا میں ذکر ہوا کہ حیدرقریشی کی غزل میں تلمیحات بھی ہیں ان میں تاریخ از منہ بھی انگڑائیاں لیتی نظر آتی ہے۔

دلوں میں دشمنوں کے اس طرح ڈر بول اٹھتے ہیں
گواہی کو چھپاتے ہیں تو منظر بول

اٹھتے ہیں

مری سچائی، میری بے گناہی سب پہ ظاہرہے
کہ اب جنگل، کنویں، صحرا، سمندر بول اٹھتے ہیں

عجب اہل ستم، اہل وفا میں ٹھن گئی حیدرؔ
ستم کرتے ہیں وہ اور یہ "مکرر" بول اٹھتے ہیں

اس غزل کے پہلے شعر سےامیر مینائی کا وہ مصرعہ یاد آجاتاہے جس میں انھوں نے کہاتھا ؎

جو چپ رہے گی زبان خنجر لہو پکارے گا آستیں کا

اور دوسرے شعر کی تلمیحی کیفیت واقعی دل موہ لینی والی ہے کہ حضرت یوسفؑ کا پورا واقعہ نظروں کے سامنے آجاتاہے اور پھر الفاظ کے انتخاب کا جواب نہیں کہ جنگل، کنویں، صحرا سمندر بول اٹھتے ہیں۔ تیسرے شعر میں پوری تاریخ اسلامیہ سمٹ کر آگئی ہے خواہ وہ حضرت بلال حبشیؓ ہوکے اور دیگر صحابہ رضوان اللہ علیہم اجمعین، یہ انداز حیدرقریشی کی تلمیحات کا ہے۔

اردو شاعری میں سہل ممتنع کو ایک صنعت کے طورپر بھی لیاجاتاہے اور اس کے لئے یقیناً قادرالکلامی کی ضرورت ہوتی ہے۔ میر تقی میرؔ کے بعد ادھر نئے شعراء میں ناصر کاظمی کے پاس مثالیں مل جاتی ہیں۔ اور یہ روش آگے بڑھتے ہوئے حیدرقریشی کے پاس بھی یہ نمونے مل جاتے ہیں کسی کیفیت کو آسان اور عام فہم انداز میں پیش کرنے کا طریقہ ملاحظہ فرمائے۔ ؎

بہت چالاک ہوتے بڑے بے باک ہوتے

جارہے ہو
دلوں کا خوف کرنے
لگ گئے ہو
دکھوں کی آگ میں
جلتے رہو اور

جارہے ہو
بڑے سفاک ہوتے جارہے
ہو
سمجھ لو پاک ہوتے
جارہے ہو

عروج کیا ہے زوال
کیاہے
سوال اتنے جو کررہے
ہو
ہے دل کوئی بے
کنارصحرا
حقیقتیں تو فریب نکلیں
خدا ہے مشکل کشا تو
حیدر

خوشی ہے کیا اور ملال
کیاہے
تمہارا اصلی سوال کیاہے
کہ آرزؤں کا جال کیاہے
جہاں خواب وخیال کیاہے
کوئی بھی کار محال
کیاہے

تعلی تقریباً ہر شاعر کے یہاں بیان ہوتی ہے مگر ہر شاعر کا اپنا اپنا طریق پیش کش علاحدہ ہوتاہے اور اسی سے وہ پہچانا بھی جاتاہے۔ میرؔ نے کہاتھا کہ

سارے عالم پر ہوں میں چھایا ہوا
مستند ہے میرا فرمایا ہوا

مت سہل ہمیں جانو پھر تا ہے فلک برسوں
تب خاک کے پردے سے انسان نکلتے ہیں

غاؔلب کا انداز نرالہ اور انوکھا رہاہے۔



ہیں اور بھی دنیا میں سخنور بہت اچھے
کہتے ہیں کہ غالب کا ہے انداز بیان اور

ہم کہاں کے دانا تھے کس ہنر میں یکتا تھے
بے سبب ہوا غاؔلب دشمن آسماں اپنا

افتخار عارف نے کچھ اس انداز سے اپنے آپ کو پیش کیا
ہم کہاں کسی اور کو گردانتے ہیں
ہم نے لکھا بھی تو لکھیں گے قصیدہ اپنا

حیدرقریشی کا انداز بھی انوکھا سا ہے۔ ؎

ہر گوہر نایاب کی تذلیل بجاہے
پر ہم تو کوئی گوہر نایاب نہیں تھے

کل ہمیں بے شک عظیم مانے گا
آج بے شک حقیر بھی ہم ہیں

یوں ہی تک بندی نہیں کی ہے غزل میں حیدر
بھیڑ سے اپنی الگ راہ نکالی ہم نے

آپ بیتی کا جہاں تک معاملہ ہے ہر فنکار کی اپنی دنیا ہوتی ہے۔ اپنے تجربے ہوتے ہیں اور انھیں کو وہ برتتاہے اب اس میں کس حدتک آفاقی پہلو آجاتاہے۔ کے وہ فن یاوہ شعر ہر شخص کا اپنا تجربہ مان لیتاہے یہی شاعری یا فن کی معراج ہوتی ہے۔ لیکن بساواقات جو خود پربیت رہی ہوتی ہے اسے بڑے ہی شدومد کے ساتھ جب شاعر پیش کرتاہے تو اس سے یک گونہ ہمدردی پیدا ہوتی ہے۔ حیدرقریشی نے جس طرح کی زندگی اس سے ہر قاری اظہار ہمدردی کرتاہے اور اس کو بیان کرنے میں انھوں نے

کہیں بھی تامل سے کام نہیں لیا۔ جوکچھ ہے اور جیساکچھ ہے ان کی زندگی ایک کھلی کتاب کی مانند ہے اسی کو آپ نے اشعار میں ڈالا ہے ؎

عشق اور نوکری مل کے دونوں چوس گئے ہیں تجھ کو
تو تو بس اب ایسے ہے جیسے گنے کا پھوگ

جو میری روح میں بس زہرگھولتاہی رہا
مرے نصیب میں چینی کا کار خانہ تھا

دردآندر کے سب آنکھوں میں ابھر آئے تھے
عشق میں جب ہمیں پانی کے سفر آئے تھے

اس کے ساتھ ہی حیدرقریشی نے اپنی بیماری کا ذکر بھی کیاہے کہ انھیں ذیابیطس کی شکایت ہے۔ مگر اس میں زمانہ کی بے اعتنائی کا ذتذکرہ کس ڈھنگ سے سمودیاہے یہ فنکاری کا عمدہ نمونہ ہے۔

روکھے پھیکے پن کی اب عادت بنانی ہے ہمیں
اتنے میٹھے ہوگئے تھے ہم کہ شوگر ہوگئی

اساتذہ کے یہاں اور کئی مثالیں ہمیں ملتی ہیں جن میں تجاہل عارفانہ بھی ایک ہے اور حیدرقریشی کی غزل میں اس صنعت کی آن بان دیکھئے ؎

اس کی مجنوں کا بھرم کب کا کھل چکا
لیکن یہ دل کہ پھر بھی بڑا خوش خیال ہے

وہ بھی اپنے آئینے میں دیکھتا ہوگا مجھے
جس کو اپنے آئینے میں دیکھتا رہتا ہوں میں

زندگی کیاہے، اس کا فلسفہ کاہے یہ معمہ آج تک حل نہ ہوسکا۔ اس کے متعلق کئی شعراء نے اپنے اپنے فہم اور ادراک کے مطابق پیش کیا اور ہر ایک نے ایک نئی بات کہی۔ بیدؔل نے فارسی میں کہا تھا کہ ؎

زندگی در گردنم افتاد بیدل چارہ نیست
شاد باید زیستن، ناشاد باید زیستن

چکبست نے کہاتھا کہ ؎

زندگی کیا ہے عناصر میں ظہور ترتیب
موت کیا ہے انہیں اجزا کا پریشاں ہونا

اقبال نے کہاتھا کہ ؎

موت کو سمجھے ہیں غافل اختتام زندگی
ہے شام زندگی، صبح دوام زندگی

اپنی دنیا آپ پیدا کر اگر زندوں میں ہے
سر آدم ہے ضمیر کن فکاں ہے زندگی

ساحر نے کہا کہ ؂
لے دے کہ اپنے پاس فقط اک نظر تو ہے
کیوں دیکھیں زندگی کو کسی کی نظر سے ہم

حسن کمال نے زندگی کے متعلق کچھ یوں کہا کہ ؂
جب تک میں زندگی کو نہ سمجھا تھا جی لیا
جب آگئی سمجھ میں تو بے موت مرگیا

افتخار عارف کا انداز بھی ملاحظہ ہو ؂
میں زندگی کی دعا مانگنے لگا ہوں بہت
جو ہو سکے تو دعاؤں کو بے اثر کردے

حیدرقریشی نے زندگی کے متعلق کیا سوچا اور کیا جانا دیکھئے
ہم نے بھوگا ہے ضرور اسے حیدر
ہم نے کب زندگی گذار ی ہے

دیکھا خلوص موت کا تو یاد آگیا
کتنے فریب دیتی رہی



زندگی مجھے

جہاں تک تشبیہات کا تعلق ہے حیدرقریشی کے یہاں اپنی الگ انفرادیت جھلکتی ہے۔

وہ چاند وہ گلاب، وہ پتھر وہ آگ بھی
جیسی مثال دیجئے برحق مثال ہے

ایک ان دیکھے کی سوچوں میں گھرا رہتاہوں
اس کی آنکھیں اس کا چہرہ سو چتا رہتاہوں

حیدر جب اس نے پلکیں اٹھائیں تو یوں لگا
جیسے اتر گیاہوں شراروں کی جھیل میں

شاخ دل یوں تری یادوں سے ہری رہتی ہے
جیسے میوؤں سے کوئی ڈالی بھری رہتی ہے

تمام روشنیاں، خوشبوئیں بجا حیدرؔ
پر اس گلاب بدن سا کوئی ہوا بھی نہیں

غزل دور حاضر میں وہ مسائل حیات کی ترجمان نظر آتی ہے وہیں اس نے اپنےماضی سے رشتہ منقطع نہیں کرلیا۔ اس کی نیوہی اس کی جمالیات ہے، بلکہ جملہ فنون لطیفہ بغیر جمالیات کے تصور میں لاہی نہیں سکتے۔ یوں تو حیدرقریشی کے یہاں جمالیاتی سطح بھی بہت مہین اور عمدگی کے ساتھ ملتی ہے۔ کسی شاعر کا کمال یہی ہوتاہے کہ وہ جمالیات کے ساتھ ساتھ



عصری آگہی اور عصری حالات و کیفیات کو بھی برتے، اس میں حیدرقریشی کو گویا کمال لحاصل ہے۔ اشعار ملاحظہ ہوں ؎

جاگے ہیں میرے ذہن میں جب بھی ترے خیال
خوابوں کے شہر بنتے رہے ٹوٹتے رہے

خاموشیوں کے لب پہ کوئی گیت تھا رواں
گہری اداسیوں کے کنول جھومتے رہے

تھی کتنے موسموں کی مہک اس کے جسم میں
سانسوں کی تیز آنچ میں ہم بھیگتے رہے

ہر اس شخص کو اپنی مٹی، اپنے وطن اور اپنی زمین سے محبت ہوتی ہے۔ اور اس کی محبت اور اس کی قربت کا اظہار کہیں نہ کہیں اور کسی نہ کسی انداز میں ہوہی جاتاہے۔

حیدرقریشی کا تعلق بھی سرزمین پنجاب سے ہے۔ تو ظاہر ہے وہاں کی بوباس، لب و لہجہ اور زبان و بیان بھی ان کی شاعری میں اور خاص طورپر غزل میں آنکھ مچولی کھیلتی نظر آتی ہے۔ دکنی کی طرح پنجابی میں بھی صیغہ جمع کیلئے الف اور نون غنہ کا اضافہ کرکے کیاجاتاہے۔ حیدرقریشی نے اس کیفیت کو باقاعدہ قافیہ کے انداز میں برتاہے۔ غورفرمائیں ؎

فقیربن گئے تیری محبتوں کے اسیر

مگر مزاج کی وہ بادشاہیاں نہ گئیں

بہاریں لاکھ سجاتی رہیں، مگر دل سے
تمہارے پیار کی ڈھائی تباہیاں نہ گئیں

مرے ہی خواب کنوارے نہیں رہے اب تو
کہ آرزوئیں تری بھی بیاہیاں نہ گئیں

ان کے ساتھ ساتھ ایک اچھے اور سچے اور بیدار مغز شاعر میں جو خوبیاں ہونی چاہئیں وہ حیدرقریشی میں ملتی ہیں۔ فیضؔ نے جلاوطنی کی زندگی گذاری اور کئی فنکاروں نے جب انکی سانسیں اور آزادانہ طورپر سانس بھی وہ لینے نہیں پارہے تھے تو ایسے میں بھلا کوئی شخص کیا کرے وہ اپنا آشیانہ بدلنے پر مجبور ہوجاتاہے۔ کسی شاعر نے شاید انہی حالات کے پیش نظر یہ کہنے پر مجبور ہوگیا تھا کہ ؎

اسیران قفس پر جب عنایت آپ کرتے ہیں
کسی کو ذبح کرتے ہیں کسی کے پر کتر تے ہیں

ان حالات میں زندگی گذارنا بڑا دشوار ہوجاتاہے اور کئی لوگوں نے اپنی عزیزترین بستی کو بھی بڑے نمناک آنکھوں سے، رندھے ہوئے گلے اور بجھے ہوئے دل کے ساتھ ترک کرنے پر یا چھوڑنے پر مجبور ہوئے۔ ان میں حیدرقریشی بھی ایک ہیں۔ بعض نے بہ حالت مجبوری وہیں قیام کرنے کو گوارا کرلیا۔ مگر



ان کے ضمیر نے انھیں اظہار پر مجبور کردیا، افتخار عارف کے الفاظ میں ؂

نہ جانے خلق خدا کون سے عذاب میں ہے
ہوائیں چیخ پڑیں التجا کے لہجے میں

یہی ہے مصلحت جبر احتیاط تو پھر
ہم اپنا حال کہیں گے چھپاکے لہجے میں

اس بار بھی دنیا نے ہدف ہم کو بنایا
اس بار تو ہم شہ کے مصاحب بھی نہیں تھے

مٹی کی محبت میں ہم آشفتہ سروں نے
وہ قرض اتارے ہیں کہ واجب بھی نہیں تھے

حیدرقریشی کا لہجہ دیکھئے: ؂

موت سے پہلے جہاں میں چند سانسوں کا عذاب
زندگی! جو قرض تیرا تھا ادا کرآئے ہیں

لفظ تیری یاد کے سب بے صدا کرآئے ہیں
سارے منظر آئنوں سے خود مٹاکر آئے ہیں

ایک لمحے میں کئی برسوں کا کے ناطےتوڑ کر
سوچتے ہیں اپنے ہاتھوں سے یہ کیا کر آئے ہیں

ہر چھلکتے اشک میں تصویر جھلکے گی تیری
نقش پائی پر ترا ان مٹ بناکر آئے ہیں

غزل نے ہر دور میں جہاں وقت کی ضرورتوں کا خیال رکھا وہیں وہ اپنے دور کی لفظیات سے خود کو معمور بھی کرلیا۔ شاید اسی وجہ سے بعض بعض جگہ اس کا لہجہ کہیں کھردرا سا لگنے لگاتھا۔ مگر اکثر شعراء نے غزل کی اس عنائیت اور جمالیات کو مجروح ہونے سے بچائے رکھا۔ اب یہ شاعر پر انحصار کرتاہے کہ ان لفظوں کو بھی غنائی لہجہ عطا کرتے ہوئے استعمال کرے۔ اور حیدرقریشی نے یہی کچھ کیاہے۔ انھوں نے جہاں زمانی ضرورتوں کے تحت الفاظ کو ہو بہو استعمال کیا اور غزل میں اس انداز سے برتا کہ نہ لفظ کی خوبصورتی بگڑی اور نہ ہی اس کی معنویت مجروح ہوئی، بلکہ یہ دور جدید کی غزل میں اضافہ کا سبب کہی جاسکتی ہے۔

اردو کا یہ مزاج ابتدا سے چلتا چلاآرہاہے۔ اور وہ دیگر زبانوں کی طرح اس کو برتنے یا ترجمہ کرنے کی حماقت کم سے کم دورحاضر میں تو نہیں ملتی۔ کیونکہ وہ الفاظ جو روزمرہ مستعمل ہوں اور انھیں بغیر کسی دقت کے بولا جارہاہو یا ادا کیاجارہاہو اس کیلئے ترجمہ کی خاطر خواہ ضرورت تو نہیں

ہونی چاہئے۔ ہاں اگر کسی چیز یا کسی شئے کے اگر ہم موجد ہوں تو پھر اس کا نیا نام ہم رکھیں گے اور وہ لفظ استعمال میں آئے گا اور پورے سیاق و سباق کے ساتھ وہ ادا ہوگا۔ وگرنہ صرف لفظی ترجمہ کرتے بیٹھیں تو نہ تو اس کو صحیح ڈھنگ سے ادا کرپائیں گے اور نہ ہی وہ پورے سیاق و سباق کے ساتھ معنی دے گا۔ اس لئے آج اردو والوں نے موبائیل کو موبائیل، کمپیوٹر کو کمپیوٹر ، انٹرنیٹ کو انٹرنیٹ، وغیرہ استعمال کرلیا۔ اور اسمیں کوئی قباحت بھی نہیں ہونی چاہئے۔ حیدرقریشی کی لفظیات دیکھئے۔

حیدراک اور ہی دنیا ہے یہ انٹرنیٹ کی
کیا سے کیا ہوگیا ہوں سات برس کے اندر

روکھے پھیکے پن کی اب عادت بنانی ہے ہمیں
اتنے میٹھے ہوگئے تھے ہم کہ شوگر ہوگئی

مشینوں کے اس عہد ناروا کا میں ہی یوسف ہوں
مجھے اس نوکری کی شکل میں نیلام ہونا تھا

پاس آکر پڑھ نہ پائے گا کتاب دل کبھی
وہ تو بس شیلفوں سے مجھ کو جھانکتا رہ جائے گا

ہر دور میں فنکاروں نے کچھ نئی لفظیات اور تراکیب کا استعمال کیا۔ بعض نے خود وضع بھی کئے۔ اس طرح حیدرقریشی کی جملہ غزلوں کو (ان کی کلیات میں مشمولہ) دیکھنے سے اندازہ ہوتاہے کہ حیدرقریشی نے بھی کچھ ایسی لفظیات اور تراکیب کا استعمال کیا جو ان کی اپنی وضع کردہ یا اپنے عہد کے فنکاروں کے مستعمل شدہ محسوس ہوتے ہیں۔ بہرحال راقم الحروف یہ کہنے میں بحق بجانب ہے کہ یہ لفظیات اور تراکیب حیدرقریشی ہی کی ہیں۔ جیسے ؎

سوچ کے سحرا، حقیقتوں کے سراب،
سانسوں کا عذاب، کنوارے خواب، دکھوں کے چراغ،
داغوں کے چراغ، کنواری رات، آنکھوں کی چاندنی
سورج کی درخت، خواہشوں کی تتلیاں، یادوں کے جزیرے
اشکوں کے سمندر، سلگتے خواب، حجابوں کی جھیل
اندھے لفظ، صداؤں کے جنازے، خوابوں کے شہر،
خامشی کے سینے، اناکے سائے، لمس کے جھونکے
وصل کے گلاب، فصیل وقت، پیاسے سمندر،
اداسیوں کے کنول، سانسوں کی آنچ، اوہام نگر،
نارسائی کی اذیت، نفرتوں کے خار، کتابوں کی جھیل،
مسافت صحرائے آرزو، قربتوں کی مہک،

ان لفظیات اور تراکیب سے اندازہ ہوتاہے کہ حیدرقریشی اس نئے عہد کا ایک بیدار مغز اور منجھا ہوا غزل گوہے۔ اسی لئے تو اس کے اپنے عہد کے نقاد نے بھی دل کھول کر تعریف کی اور بعض نے تو ان کی غزل اور دیگر شاعری میں ان کی حیات کو ڈھونڈنکالنے کی سعی کی ہے۔

فاعلاتن :

۱) لفظ تیری یاد کے سب بے صدا کر آئے ہیں
۲) فاصلہ پھر کچھ ہمارے درمیاں ہونے کو ہے
۳) لے نہ ڈوبے خواہشوں کا
٤) سامنے ہے گھر مگر

یہ تلاطم دیکھنا مفقود گھر کے راستے
۵) ایک ان دیکھے کی سوچوں میں گھرارہتا ہوں میں
٦) میرے اس کے درمیاں جو فاصلہ رکھا گیا
۷) لفظ اندھے ہوگئے سوچوں کو پتھر کرگیا
۸) یوں کسی کے ساتھ اپنا واسطہ رہ جائے گا
۹) کون دیکھے گا بھلا ان جلتی آنکھوں کے عذاب
۱۰) وہ جو ہم کو آزمانے لگ گئے
۱۱) آگ اپنے خون سے آخربجھانی پڑگئی
۱۲) حکمرانی کی تمنا اتنی خودسرہوگئی

مفاعیلن :
۱) دلوں میں دشمنوں کے اس طرح ڈربول اٹھتے ہیں
۲) جہاں پھر میں ہمارے عشق کی تشہیر ہوجائے
۳) اگر ہم پرعنایت ہے، نہ کچھ اکرام ہونا تھا
٤) خوشی حدسے زیادہ دے کے بھی برباد کرتاہے

متفاعلن :
۱) وہ جو خوشبوؤں کا خرام ہے، جو دھنک کا عکس جمیل ہے
۲) نہ کسی کے دم، نہ عصامیں ہے

مفاعلن :
۱) نہ جانے کون سازشوں کا ہم شکار ہوگئے
۲) محبتوں میں تم سے جو نباہ بھی نہ کرسکا

فعل فعولن :
۱) عروج کیاہے زوال کیاہے

*****

نظم نگاری

اردو نظم نگاری نے مختلف مراحل طے کرتے ہوئے عصری تقاضوں کو پر کرتے، انگیزکرتے، ساتھ دیتے ہوئے اپنے ہونے کا جو احساس جگایا ہے وہ شاید دوسری اصناف کو کم ہی نصیب ہواہے۔ ہمارے ہاں پابند نظم کو نظیر کے بعد اقبال، چکبست اور جوش نے بام عروج پر پہنچایا اور ان کی معرفت اردو نظم نے بھی رفعت و بلندی پر پہنچ گئی۔بالآخر ترقی پسند تحریک کے دورمیں اس نے بھی کروٹ بدلی اور صرف مشرقیت ہی سے سرشار نہیں رہی بلکہ مغربیت یا انگریزی اور دیگر مغربی زبانوں کی شاعری سے استفادہ کرتے ہوئے ان تبدیلیوں کو من و عن قبول کرنے لگی اسطرح اردو میں معریٰ اور آزاد نظم کا آغاز ہوا۔ اس میں ہمارے شعراء نے وہ مقام حاصل کرلیا کہ باوجود تجربہ کے اس نے اس اپنائیت سے اس کو قبول کرلیا کہ اب وہ اپنا ہی محسوس ہونے لگا اور اسطرح وافر حصہ آزاد نظموں کا ہمارے ادب میں بطور سرمایہ کے درآیا۔ جہاں تک معریٰ نظم کا سوال ہے اردو میں عبدالحلیم شررؔ اور ان کے رسالے دلگداز سے شروع ہوا۔ جسے بڑی بحث و تمحیص کے بعد عوام اور شعراء نے قبول کیا۔ اسطرح اسماعیلؔ میرٹھیکی (کی نظمیں جو عموماً بچوں کے ادب کیلئے معروف ہیں) نے بہت ساری نظمیں لکھیں اور وہ قبول عام کو سند بھی حاصل کرلیں، یہ دراصل غزل کے اس مروجہ فارم سے جس میں قافیہ بڑی اہمیت کا حامل تھا۔ بلکہ بغیر قافیہ کے شاعری دراصل شجر ممنوعہ تھی۔ اس سے آزادی حاصل کرنے اور خیالات کو ایک لے میں پیش کرنے کی پیش رفت تھی سو راہ پاگئی۔ اس میں پھر بھی نظم پابند کی طرح ہر مصرعہ بہرحال ایک بحر میں ہوتا، سوائے قافیہ کے اور کوئی تبدیلی اس میں نہیں تھی۔ ہاں البتہ ترقی پسند تحریک نے اردو ادب میں جہاں بہت ساری نئی اصناف کو جنما، ان میں آزاد نظم بھی ایک یا اس کو بھی ایک تجربہ کے طورپر ہی لیاجاتاہے۔ یہ بھی دراصل



ہمارے ہاں انگریزی ادب ہی کی تقلید میں راہ پاگئی۔ اس میں شک نہیں کہ ہر ابتدائی تجربہ کسی بھی ادب، سماج یا قوم کیلئے جلد قابل قبول نہیں ہوتا، سو اس کے ساتھ بھی ایسا ہی ہوا، ترقی پسند تحریک کوئی انفرادی تحریک نہیں تھی، بلکہ یہ اجتماعی فکر کا نتیجہ تھی۔ اور یہ عالمی طورپر باقاعدہ ادب کے ذریعہ معاشرہ میں انقلاب کی نقیب تھی۔ اور اس کے اثرات صرف اردو یا صرف برصغیر میں ہی نہیں بلکہ عالمی طورپر نظر آتے ہیں۔ کیونکہ یہ انقلاب کی نقیب تھی اور اس تحریک کے اثرات اتنے نمایاں ہوئے کہ ساری دنیا میں کثیر تعداد میں اس کی ہمنوا ملتے گئے اور اس تحریک سے وابستہ ہوگئے۔ بالآخر روس کا انقلاب معرض وجود میں آیا حکومت زار کا تختہ الٹ دیاگیا اور ترقی پسندوں یا اشتراکیوں کی حکومت وہاں قائم ہوئی۔ اس طرح ہندوستان پر انگریزی سامراجیت حکمران تھی تو اس سے تمام ہندوستانی بھی آزادی چاہتے تھے ہندوستان کی آزادی ان اشتراکیوں سے ملی نہیں مگر انہوں نے آزادی کے جذبے کو فروغ دینے، انسانوں میں یا شہریوں میں قومی جذبہ کو ابھارنے کیلئے انہوں نے ادب کا سہارا لیا۔ کہانیاں لکھیں، مضامین لکھے، شاعری کی۔ اس کے ذریعہ لوگوں میں بیداری پیدا کرنے کا کام البتہ کیا اور یہ کسی حدتک کارگر بھی ثابت ہوا۔ چنانچہ انھوں نے جہاں ہمارے ادب کی روایت کی پاسداری کی وہیں پر کچھ نئے تجربات بھی کئے اور یہ تجربے ابتداء میں ان کیلئے لعن طعن فراہم کرتے رہے، مگر بعد کو ہرشخص نے گلے سے لگایا۔ ان میں آزاد نظم ایک رہی۔ ان کے لکھنے والوں میں فیض احمد فیضؔ، علی سردار جعفری ساحرلدھیانوی، مخدوم محی الدین، مجروح وغیرہ وغیرہ ملتے ہیں۔ اس کے بعد اردو میں ایک حلقہ ابھرآیا اور وہ حلقہ ارباب ذوق کے نام سے جانا جاتاہے۔ جسے ترقی پسند تحریک اور جدیدت کے درمیان "گریز" کی حیثیت دی جاسکتی ہے۔ کیونکہ جب ترقی پسندی میں شدت آگئی تو جدیدیت کیلئے راہ ہموار کرنے میں اس حلقہ نے کام کیا جسے میں نے قصیدہ کا "گریز" نام دینے کی کوشش کی ہے۔ کیونکہ قلیل مدت کے لئے سہی اس نے جدیدیت کے لئے راہ ہموار

کردی۔ جدیدیت نے جماعت کی بجائے فرد کی اہمیت پر زور دیا اور عصری تقاضوں کے تحت ادب کو پیش کرنے اور نئی لفظیات و محاورات کی طرف توجہ دلائی، یہاں بھی اردو شاعری کے تحت ایک تجربہ کیاگیا اور وہ بھی انگریزی شاعری کی تقلید ہی میں تھا۔ ہاں یہ بحث ابھی بھی جاری ہے مگر ہمارے ادب میں اب تک ایسے بہت سارے الفاظ جو غلط العام کے طورپر رواج پاگئے ۔ یہ نیا تجربہ دراصل "نثری نظم" کا ہے۔ کیونکہ بعض نقادوں کےخیال کے مطابق نثر اور نظم دونوں کو خلط ملط کرکے غلط ترکیب بنائی گئی ہے کیونکہ انگریزی لفظ کا اگر صحیح ترجمہ کرنا تھا تو Prose Poetry کی طرز پر نثری شاعری کرنا چاہئے تھا۔ مگر ان جدیدیوں نے بھی چونکہ اپنی ایجاد یا تخلیق میں بھلے عیب دار ہی سہی اپنا نام دے دیا اور وہ ہے نثری نظم، خیر اردو لفظ ہی بے داغ ہے اور وہ ہمیشہ سے داغدار بنی ہوئی ہے اور کبھی تو اسکے "دا" کو ہی نکال کر پڑھا گیا۔ اب کیا کرے جس کا کوئی نہیں اس کا خدا ہوتاہے۔ شاید یہ بھی افوض امری الی اللہ کے تحت خاموش ہے۔

حیدرقریشی کی نظمیں تعداد کے لحاظ سے کم بلکہ بہت ہی کم ہیں۔ یعنی ان کی شعری کائنات کا جائزہ لیں تو غزلوں اور ماہیوں کے بالمقابل واقعی بہت کم ہیں۔ اس سے یہ اندازہ لگایا جاسکتاہے کہ شاید انھوں نے تجربہ کے طورپر نظمیں لکھی ہیں یا پھر دور جدید کے اعتبار سے غزلیں اور ماہیے ہیں تو چند نظمیں بھی لکھنی ضروری ہیں یہ سمجھ کر شاید لکھاہو۔ مگر ایسا نہیں ہے۔ غاؔلب نے کہا تھا کہ

آتے ہیں غیب سے یہ مضامیں خیال میں
غاؔلب صریرخامہ نوائے سروش ہے

شاعر پر نہ جانے کونسا جذبہ طاری ہواور تخیئل نہ جانے کب مہمیز کرے اور شعر یا خیال وارد ہوجائے اور کبھی غزل کے پیمانے میں در آئے یا ماہیئے کا انداز اختیار کرلے یا پھر نظم کی شکل میں ظاہر ہوجائے۔ ویسے حیدرقریشی کی شاعری کا

مطالعہ کریں تو یہ بات واضح ہوجاتی ہے کہ انھوں نے جہاں کلاسیکی شاعری کا مطالعہ کیا وہیں ترقی پسندی کو نہ صرف پڑھا بلکہ ترقی پسندوں ، حلقہ والوں، جدیدیوں کے ساتھ رہے بھی، ان کو پڑھا، سنا اور اس سے استفادہ بھی کیا۔

اس لحاظ سے جدیدیت اور مابعد جدیدیت کے اثرات تو انکے ہاں ملتے ہیں۔ مگر عہد کے پیش نظر وہ ادب کسی نہ کسی طورپر خواہ بالراست ہو یا براہ راست اثر تو کرے گا ہی۔ چنانچہ ترقی پسندوں، حلقہ ارباب ذوق والوں نے نظم کی بنیادوں کو اسقدر مضبوط کر دیا کہ اب آئندہ آنے والوں کیلئے اس کے بغیر چارہ ہی نہیں رہا۔ خیر جیسا کہا گیا کہ ادب اپنے ماحول کا اعکاس ہوتاہے۔ اسطرح حیدرقریشی نے بھی نظمیں لکھیں اور وہ بھی نئے انداز کی۔ کیونکہ حیدرقریشی فطرتاً شاعر ہیں جیسا وہ خود کہتے ہیں۔

"بنیادی طورپر تخلیق کارہوں"-------- میرے نزدیک تنقید، تخلیقی عمل کا ایک جزوی حصہ ہے کسی فن پارے کی تخلیق کے دوران جب تخلیق کار اپنے فن پارے کے اظہار کے ساتھ اس کے الفاظ کے استعمال اور ان کی پیش کش کے انداز کو دیکھتاہے تو دراصل ایسا دیکھنا اس کی تنقیدی نگاہ بھی ہوتی ہے۔ تخلیق کار کی یہ تنقیدی نظر اپنی تخلیق کے اظہار کے دوران اس کے حس و قبح کا جائزہ لیتی ہے۔ تاکہ اسے خوب سے خوب تر صورت میں پیش کیاجاسکے۔ اپنے فن پارے کو خوب سے خوب تر صورت میں پیش کرنے والی نظر ہی کسی تخلیق کار کی تنقیدی نظر ہوتی ہے، اور اسی کے نتیجہ میں

کسی تخلیق کارکافن پارہ معرض و جود
میں اتاہے۔[27]

اس طرح حیدرقریشی کی یہ نظمیں بھی ایک تخلیق کار کی اپنی کاوش کا نتیجہ ہیں۔ کمیت کا اس پرکوئی اثر نہیں ہوگا کیوں کہ کیفیت کے لحاظ سے پر خوداثرانداز ہونے والی ہیں ان کے کلیات "عمرلاحاصل کا حاصل میں" مشمولہ نظمیں ہیں۔ جو کیفیت کے لحاظ سے یقیناً عمدہ ہیں۔ یہ تمام نظمیں نثری نظموں کی صف میں آتی ہیں۔ ان میں الفاظ کا ربط اور آہنگ موجود ہے۔ وہ نظمیں اس طرح ہیں۔ خلا، درد، ایک اداس کہانی، پھاگن کی سفاک ہوا، تمھارے لئے ایک نظم، چاندکی تسخیر کے بعد، میں پھر آنسوؤں کا گلاگھونٹ دوں گا، ایبٹ آباد، نصف سلور جوبلی، صدا کا سمندر، منی پلانٹ، فاصلوں میں ملاپ، محبت کا خدا، حاصل زندگی، بہار کے پہلے دن، عجیب دشمی، یہ دل، بے فیض موسم کا دکھ، ایک دراوڑکا پیغام آریاؤں کے نام، ہوا، دعاگزیدہ، قیامت، ایک خواہش کی موت، سرسوں کا کھیت، تخلیق درتخلیق، نئی شالاط، دعا، چلواک نظم لکھتے ہیں، محبت کا ایک یادگاردن، مبارکباد اور پرسہ۔

مندرجہ بالا تیس نظمیں ایک الگ کیفیت اور انداز کی ہیں۔ پہلی نظم خلا کے عنوان سے ہے، جس میں انسانی رشتوں کی پامالی اور اردگرد کے ماحول کی بے رغبتی جن سے آج کا انسان دوچار ہے کوپیش کیاہے۔ اور تنہائی آج کے دور کا سب سے بڑا المیہ ہے؛۔ انسان آج یقیناً خلا میں پہنچ تو گیا ہے مگر اس کی زندگی خلا سے پر معلوم ہوتی ہے۔

دوسری نظم "درد" کے عنوان سے رقم ہے۔ اس میں ان بیتی یادوں کو دکھایاگیاہے جو شاعر کے اور شاعر کے حوالے سے ہر اس شخص کے لاشعور و تحت شعور کا حصہ ہیں جنھیں وہ بھلانہیں سکتا۔ درد ایک استعارے کے طورپر استعمال ہواہے۔ یہی درد ہے جو اس کا مونس بھی ہے اور ماں جائے بھی۔ اس کے سہارے وہ زندہ ہے۔ کبھی غالبؔ نے کہاتھا ؂

---

[27]حیدرقریشی فن اور شخصیت



عشق سے طبعیت نے زیست کا مزہ
پایا
درد کی دوا پائی، درد لادوا پایا

اس نظم میں جہاں درد کی یہ کیفیت ہے وہیں امیرؔ مینائی کے اس شعر کی طرف بھی ہماری توجہ مبذور کروائی ہے۔ اور اس کیفیت کی طرف بھی اشارہ کررہی ہوتی ہے۔ ؎

سارے جہاں کا درد ہمارےجگر میں ہے

اس نظم میں جن لفظیات کا استعمال ہواہے وہ کالے انجن کی سیٹی، تانگے کے گھوڑے کی ٹاپوں اور پہیوں کی آواز، چوڑیوں کی چھنک، ٹوٹتی چوڑیوں کی کھنک، بانسری کی رکھی اور سریلی صدا، ان تمام کو شاعر متاع فقیراں سے تعبیر کرتاہے اور اس کو میرے مونس اور ماں جائے کہتاہے۔ اس سے یہ اندازہ ہوتاہے کہ وہ چیزیں جو اس کے بچپن کی تھیں، یاوہ اب یادوں میں بسی ہوئی ہیں جن سے میں جدا ہوا ہوں میرے لاشعور میں پنہاں ہیں اور رہی کبھی کبھی اکیلے میں مجھے اور میرے شعور کو کچوکے لگاتے ہیں اور وہ بسری یادوں کو پھر سے تازہ کرجاتے ہیں اور میں بے چین ہوجاتاہوں۔ یہ بے چینی کبھی مجھے سکون عطا کرتی ہیں اور کبھی تڑپاتی ہیں۔ انھی یادوں کے سہارے گویا میں زندہ ہوں والی کیفیت عیاں ہوتی ہے۔

ان کی نظموں کے متعلق ڈاکٹر جمیل عرشی کا کہنا ہے کہ

"حیدرقریشی نے بظاہر گنتی کی چند نظمیں لکھی ہیں جو ان کے مجموعہ پائے کلام "عمرگریزاں" اور "دعائے دل" میں شامل ہیں۔ تمام نظموں کو آزاد نظموں کے زمرے میں رکھاجاسکتاہے۔ کیونکہ ردیف و قافیہ سے عاری ہیں۔ تاہم ان میں وزن کو ملحوظ رکھاگیاہے۔ نظموں کے مطالعے سے قاری امیر



حلقہ دام خیال ہوجاتاہے۔ کیونکہ شاعری کی بہت سی خوبیاں اس پر منکشف ہوتی ہیں۔ عام طورپر نظم نگار شعراء کالب و لہجہ کھردرا ہوتاہے۔ اور ان کی نظموں میں ثقیل و نامانوس الفاظ کی بھرمار ہوتی ہے۔ جدیدیت اور مابعد جدیدیت کے زیراثر لکھی گئی نظمیں تو ابہام و علائم کا گورکھ دھندا ہوکر رہ گئی ہیں۔ مگر حیدرقریشی نے اپنی نظموں کو شائستہ، متوازن اور مہذب آواز سے آراستہ کیاہے اور ان کا شعری لہجہ اور موثر ہے۔ دوسرے لفظوں میں ان کی شعری کائنات زندگی کے براہ راست تجربوں کی مرہون منت ہے اس لئے ہر نظم داستان حیات معلوم ہوتی ہے۔ اور قاری کو متاثر کرتی ہے"۔[28]

یہی وہ متوازن، مہذیب اور شائستہ آواز ان کی نظموں کی پہچان بن گئی اور باوجود کم تعداد میں ہونے کے اردو کے بڑے نقادوں کو بھی اپنی طرف راغب کرنے میں کامیاب ہوئیں۔

میں آج کی شاعری پر فردجرم عائد کرنے والوں سے حیدرقریشی کے کلام کے مطالعہ کی سفارش کروں گا کہ وہ خود فیصلہ کریں کہ حیدرقریشی کے استعارے، علامتیں، لفظیات اور موضوعات دوسروں سے الگ دکھائی دیتے ہیں یا نہیں۔ حیدرقریشی نے مختلف اصناف سخن میں طبع آزمائی کی ہے۔ غزل گوئی سے تو ان کی بنیادی دلچسپی ہے ہی۔ لیکن انہوں نے نظمیں بھی بہت اچھی کہی ہیں۔ اور

[28]) حیدرقریشی فن اور شخصیت۔ ص ٤٩، ٥٠،



بعض نظموں کو پڑھ کر میرے لئے یہ
فیصلہ کرنا مشکل ہوا کہ وہ غزل کے
زیادہ اچھے شاعر ہیں یا نظم کے "۔ [29]

"پھاگن کی سفاک ہوا" اس نظم میں بھی اپنی ماضی یادوں کو حال کے تناظر میں اچھی طرح سے پیش کیاگیاہے۔ یہاں بھی غاؔلب کے حوالے سے بات واضح ہوتی ہے۔ غاؔلب کہتے ہیں ؎

ہے آدمی بجائے خود اک محشرخیال
ہے انجمن سمجھتے ہیں خلوت ہی کیوں نہ ہو

یہاں جہاں گردی کے چکر میں شاعر اپنے اہل خانہ اور بچوں کے ہمراہ وطن سے دور دوسرے براعظم میں مقیم ہے۔ وہاں کے موسم اور کیفیات سے ابھی نا آشناہے اور یہ تجربے اس کیلئے بالکل انوکھے اور عجیب سے لگتے ہیں۔ جہاں مختلف خیالات کی وجہہ سے انسان ہمیشہ کچھ اور سوچتارہتاہے۔ اور یہی سوچ اسے کبھی حال سے اپنے ماضی میں لے جاتی ہے اور مستقبل سے ڈرتی رہتی ہے۔ یہ پھاگن کی سفاک ہوا ہی تھی جو شاعر کو اپنے درخشاں ماضی میں لیجاکر سوچنے اور غور کرنے اور اپنے بچپن سے مستفید ہونے کا موقع عطا کرتی ہے۔ اگر یہ نہ ہوتی تو میں شاید پھر جہاں گردی کے چکر میں ان کو بھلاکر جی رہاہوتا۔ اس میں وہ دونوں پہلودر آگئے ہیں۔ ایک تو جہاں گردی کے چکرنے یہ موقع دیا اور دوسرا اس موقع سے جہاں گردی کے چکر سے کچھ وقت تو نکال لیا سوچنے کیلئے اور اپنی گمشدہ کڑیوں کو جوڑ نے کیلئے۔

"چاند کی تسخیر کے بعد" یہ نظم واقعی فنکارانہ انداز کا نمونہ ہے۔ ہمارے شعراء نے چاند کو نہ جانے کیسے کیسے اور کن کن معنوں میں استعمال کیا۔ حیدرقریشی نے بھی اپنی روایات

[29]) مظہر امام کے مضمون "عمرگریزاں کی شاعری" مطبوعہ کوہسار" بھاگلپور شمارہ اگست ۱۹۹۹ء سے بحوالہ : حیدرقریشی۔ فن اور شخصیت ص ۸۶، مرتبہ۔ نذیر احمد فتح پوری۔ سنجے گوڑبولے۔ ناشر اسباق پبلی کیشنز۔ پونہ ۲۰۰۲۔

کو ہاتھ سے جانے نہیں دیا۔ مگر اپنے دور سے بھی روگردانی نہیں کی۔ شاعر اور شاعری کا یہی تو کمال ہے۔ وگرنہ لکیر کا فقیر بنے رہنے سے شاعری تھوڑی ہوتی ہے۔ موجودہ دور جس میں آپ ہم جی رہے ہیں وہ سائنس اور ٹیکنالوجی کا دور ہے جہاں بہت سے تجربے ہورہے ہیں۔ اور بہت سی نئی دریافتیں معرض وجود میں آرہی ہیں۔

شہزاد احمد نے کہاتھا

"موجودہ زمانے میں جو space کا زمانہ ہے۔ کہاجاسکتاہے کہ اس بات کا امکان پیدا ہواہے کہ ہم مکان یعنی space کے اندر دور تک داخل ہوسکیں، اس معاملے میں ادب اور شاعری پیش رو کی حیثیت رکھتے ہیں۔ میں نے کچھ نظمیں space کے حوالے سے لکھی تھیں۔ کتاب کا نام "اترے مری خاک پرستارہ" تھا۔ اس کے آخرمیں، میں نے ایک حکایت بیان کی تھی، اب اسے دہرادیتاہوں۔ "جب خلا باز ایک دوردراز کہکشاں کے کسی آبادسیارے پر پہنچے، تو وہ یہ دیکھ کر حیران رہ گئے کہ وہاں نوع انسانی (Homosapien) پہلے سے موجود ہے۔ چنانچہ انھوں نے ان سے سوال کیا کہ تم اس سیارے پر کس ذریعے سے پہنچے"

جواب ملا: "شاعری کے ذریعے"

اس بات کو شاید سبھی تسلیم کرتے ہیں کہ دنیا کے بہت سے علوم شاعری کے ذریعے دریافت ہوئے اس کی وجہ بہت سادہ سی تھی۔ فلسفہ، مذہب، سائنس اور



دوسرے علوم اپنی حدود رکھتے تھے۔
جن سے باہر نکلنا ان کے بس میں نہیں
تھا مگر شاعری ایک ایسا ضدی بچہ ہے
جو کسی حد کو قبول نہٰں کرتا اور ہمہ
وقت ساتواں درکھولنے پر اصرار
کرتارہتاہے۔ لہٰذا اس نے کئی درواکئے،
پھر امکانی سطح پر ان کے فلسفے اور
علوم بنائے گئے۔ اگر شاعری نہ ہوتی تو
علوم بھی آغاز نہیں ہوسکتے تھے"۔[30]

اس اقتباس اور دور حاضر اور حیدرقریشی کی اس نظم اور کلاسیکی شاعری ان چاروں کو ملاکر دیکھیں تو بات سمجھ آئے گی اور ہمارے شاعرکو کہاں کہاں تک کا سفر کرناہے اور وہ کرتاہے تبھی تو بات پیدا ہوتی ہے وگرنہ شاعری شاعری نہ ہوکر کچھ اور بن جائے گی۔ اب سوچ کے دائرے کس قدر پھیلے ہوے ہونے چاہئے۔ اس لئے ہم ضرور کہہ سکتے ہیں کہ حیدرقریشی اس دور کا وہ فنکار ہے جس نے اپنی ماضی (کلاسیک) کے ساتھ ساتھ اپنے حال کو کس طرح سے جوڑتاہے اور اس کی فکری سطح کی بلندی واقعی قابل داد ہے۔ جس نے ادب کو دور کی مناسبت سے جوڑتے ہوئے اس کی فنی اور تخلیقی ابھار میں وسعتیں پیدا کیں اور وہ وسعتیں تعمیری بھی ہیں اور انتہائی قوی بھی۔

اس نظم میں ایک معیناتی نظام کو انہوں نے باندھا۔ اور اس میں کیفیت پیدا کی وہ قابل تعریف ہے۔ اس کیلئے پوری نظم کی قرات ضروری ہوجاتی ہے۔

لفظوں کو جستجو ہوئی اپنے وجود کی / مفہوم اپنے رشتے نئے ڈھونڈنے لگے/
معنوں کی اک بساط بھی بچھنے لگی نئی/ محبوب کے حوالے سے تفہیم چاند کی/
اب صرف ایک قصہ پارینہ بن گئی/ ایٹم کے دور نے ہر اک شے کو بدل دیا/

---

[30]) جدید ادب شمارہ نمبر ۱۰

تہذیب نو کے نام پہ قدریں بدل گئیں/ حس لطیف مٹ گئی، انسان پٹ گئے/
یہ دور سے چمکتاہوا چودھویں کا چاند/ دراصل پتھروں کا اک ایسا طلسم ہے/
جو اس کی چاندنی کے سرابوں میں تیر کر/ پہنچے وہاں تو روح تک پتھرا کے رہ گئے/
لیکن میں اپنے دور سے بالکل الگ تھلگ/ اور اپنے نظریات کو بھی رکھ کے اک طرف/
لفظوں کے وہ پرانے مفاہیم چوم کر/ سوچوں تو تیرا چاند سا چہرہ دکھائی دے/
میں ڈوب جاتاہوں تری کرنوں کے نور میں/ تیری نگاہوں سے یوں امڈتی ہے چاندنی/
لیکن میں جانتاہوں کہ تو صرف چاند ہے/ وہ چاند جس کا دل ہے فقط پتھروں کا ڈھیر/
ڈرتاہوں تیرے قرب سے پتھرانہ جاؤں میں/ میں چاہتاہوں صرف تجھے سوچتارہوں/
جب جانتاہوں دل ترا ہے پتھروں کا ڈھیر/ پھر آئینہ روح کیوں ٹکراؤں گا بھلا؟
تسخیر کرکے میں تجھے کیا پاو ں گا بھلا؟
اچھا ہے تجھ کو دور سے ہی دیکھتا رہوں۔
اچھا ہے تجھ کو دور سے ہی سوچتا رہوں۔[31]

اس کے بعد ایک نظم جو اپنی بہن کی رخصتی کے منظر کو پیش کرتی ہے جو جذباتی لگاؤ اور رشتوں کی ڈور کو بیان کرنے والی ہے۔ ایبٹ آباد دن اور رات کے وقت والی نظم جو منظر نگاری کی اچھی مثال ہے جس میں ان کی رومانیت انگڑائیاں لیتی ہوئی محسوس کی جاسکتی ہے۔ نصف سلور جوبلی کی کیفیت بھی وہی رومانوی انداز کی ہے اور اپنے ماضی کو بیان کررہی ہے۔

[31]) عمر حاصل کا لاحاصل ص ٤٠ (٢٠٠٥ء)

دیگر نظموں میں صدا کا سمندر، منی پلانٹ، فاصلوں میں ملاپ، محبت کا خدا، حاصل زندگی، بہار کے پہلے دن، عجیب دشمن، یہ دل، بے فیض موسم کا دکھ، ایک دراوڑ کا پیغام آریاؤں کے نام، ہوا، دعاگزیدہ، قیامت، ایک خواہش کی موت، سرسوں کا کھیت، تخلیق درتخلیق، نئی شالاط، دعا، چلواک نظم لکھتے ہیں، محبت کا ایک یادگاردن، مبارک باد اور پرسہ، ان تمام نظموں کے مطالعہ سے یہ بات عیاں ہوتی ہے کہ واقعی حیدرقریشی کو نظم لکھنے میں مہارت حاصل ہے اور بہت عمدہ نظمیں تحریر کی ہیں۔ ان میں سے چند ایک بہت متاثر کرنے والی ہیں جن میں آفاقیت ہے اور قاری کی توجہ کو اپنی طرف مبذول کرتی ہے۔

نظم عجیب دشمن قاری کو باندھے رکھنے میں کامیاب ہے اور شاعر نے (ریاضی کی تک بندی) اعداد کو بھی اس انداز سے برتاہے کہ کہیں کوئی کھٹک نہیں محسوس ہوتی اور واقعی یہ غور کریں اس میں عجیب سی کیفیت بھی نظر آئے گی۔ اس نظم کی لفظیات جس میں انگریزی اور ریاضی سے ماخوذ ہیں مگر اسطرح مرتب ہوئے ہیں کہ کہیں نامانوسیت نہیں لگتی۔ ایک دراوڑی کا پیغام آریاؤں کے نام اور ہوا بھی پرکیف لہجے میں تحریر کردہ نظمیں ہیں۔ قیامت کے عنوان سے بہت عمدہ نظم اس کلیات میں شامل ہے جس کے تحت شاعر نے یہ لکھاہے کہ تیامت Tiamat (قدیم عراق) سمیری دیومالاکی ایک سمندری بلا کا نام تھا۔ اسی کو عنوان بناکر عہدحاضر کی کئی ایک بلاؤں کو گویا انہوں نے عیاں کردیاہے۔ نظم گوکہ مختصر ہے مگر اس میں مواد کافی ہے۔ اس نظم کو پڑھتے ہوئے ترقی پسند شاعر مجازؔ لکھنوی کی یاد تازہ ہوتی ہے۔ جنہوں نے "سرمایہ داری" کے عنوان سے شاہکار نظم لکھی اور اس میں کچھ ایسی ہی باتیں درآئی ہیں۔ مگر حیدرقریشی نے عالمی تناظر میں اس کا جائزہ لے کر اس نظم کو تحریر کیا اور یہ قیامت اگر عراقی حوالے سے لیں تو یہ امریکہ پر صاد کرنے والی نظم ہوجائیگی جس نے صرف سمندری راستے سے نہیں بلکہ ہر طرف سے گھیررکھاہے۔ نظم کی لائینں ملاحظہ ہو۔

---- یہ سنتے تھے مگر اب یہ دیکھتے بھی ہیں
کئی صدیوں تلک سوئی ہوئی، کھوئی ہوئی
جابر قیامت جاگ اٹھی ہے،
ہلاکت خیز قوت اور عظمت کے نشے میں جھومتی
قاہر قیامت ساحل مغرب سے نکلی ہے
سمیری سرزمیں کو اب کہ اس نے
صرف خشکی اور پانی ہی نہیں
ساری فضا سے، ہر طرف سے ہر جگہ سے
گھیر رکھاہے۔

اور اگر یہ اسلامی مملکت کے تناظر میں لیں تو پھر اس نے افغانستان، ایران، عراق، شام، پاکستان وغیرہ کو گھیرے ہوئے ہے۔ جیسا کہ سطور بالا میں مجاز لکھنوی کا ذکر ہوا۔ سرمایہ داری نظم کے کچھ اشعار ملاحظہ ہوں۔

یہ وہ آندھی ہے جس کی رو میں
مفلس کا نشیمن ہے
یہ وہ بجلی ہے جس کی زد میں ہر
دہقاں کا خرمن ہے

یہ اپنے ہاتھ میں تہذیب کا فانوس
لیتی ہے
مگر مزدور کے تن سے لہو تک
جوس لیتی ہے

یہ انسانی بلا خود خون انسانی کی گاہک
ہے
وباسے بڑھ کے مہلک، موت سے بڑھ
کر بھیانک ہے

بلائے بے اماں ہے، طور ہی اس کے نرالے ہیں
کہ اس نے غیظ میں اجڑے ہوئے گھر پھونک ڈالے ہیں

درندے سر جھکادیتے ہیں لوہا مان کر اس کا
نظر سفاک تر اس کی، نفس مکروہ تر اس کا

جدھر چلتی ہے بربادی کے ساماں ساتھ چلتے ہیں
نحوست ہم سفر ہوتی ہے شیطاں ساتھ چلتے ہیں

"تخلیق درتخلیق" نظم بھی اپنے جلو میں لئے ہوئے اچھی تخلیق ہے، دور حاضر کے حالات جن سے امت مسلمہ نبردآزماہے اس تناظر میں دعائیہ نظم بعنوان دعا عجیب تاثر پیش کرتی نظر آتی ہے۔

ان تمام نظموں کو پڑھنے سے اندازہ ہوتاہے کہ حیدرقریشی صرف غزل گو اور ماہیانگار ہی نہیں بلکہ ایک اچھے نظم نگار بھی ہے اور پروفیسر مظہر امام کی بیان بہت حدتک صادق آتاہے۔

*****

ماہیہ نگاری اور حیدرقریشی

تاریخ ادب اردو پر نظر ڈالنے سے اندازہ ہوتاہے کہ، ادب ہردم متغیر اور متبدل رہاہے۔ اس میں تبدیلیاں وقتی اعتبار سے

بھی آئیں اورصنفی اعتبار سے بھی، خاص طورپر شاعری میں جہاں تبدیلیاں رونما ہوتی رہیں وہیں نئے نئے تجربات بھی کئے گئے۔ اب تجربات کہاں نہیں، نظم کے میدان میں کافی تجربے ہوئے اور غزل میں بھی۔ اس سے قطع نظر گلوبلیزیشن کے تناظر میں جہاں اور زبانوں کے ادب کو ترجمہ کے ذریعہ اردو میں ڈھالا گیا وہیں غیر ملکی اصناف شعری کو بھی برتاگیا۔ نظموں میں آزاد اور معریٰ کا اور نثری نظم کا خاص طورپر، پھر غزل میں اینٹی غزل اور آزاد غزل کا۔ جبکہ دیگر زبانوں سے جیسے ہندی کے دوہے اور غیر ملکی زبانوں میں ہائیکو وغیرہ، انھیں میں ہندوستان کی ایک وہ زبان جسے بقول محمود خاں شیرانی اردو کی مولد و مسکن ہونے کا شرف حاصل ہے میری مراد پنجابیاس کی وہ لوک روایت جسے عوامی گیت کہاگیایعنی "ماہیہ" اس کو اردو میں باقاعدہ صنفی طورپر حیدرقریشی کی معرفت اپنایا گیا اور اب یہ اردو کی اور شعری اصناف میں اسنے بھی جگہ بنائی۔

جدیدیت نے جہاں علاقائیت کی بات کی وہیں یہ بھی علاقائی روایت کو شعوری طورپر صنفی درجہ دیاگیا۔ ہندوستان جیسے دیہاتوں کا مجموعہ کیا جاتاہے-60ء کے دہے سے ہی ہندوستانی فلموں میں باقاعدہ علاقائی لب و لہجہ اور کہانیاں پیش کی جاتی رہیں جن میں زیادہ تر معاشرتی مسائل اور معاشرتی حقیقتوں کو بتایاجاتارہا، ساتھ ہی تاریخی فلمیں بھی تیار کی گئیں۔ ان میں خاص طورپر عشقیہ داستانوں پر مبنی فلموں میں مکالمے اور نغمے بھی اس علاقے کی نمائندگی کرتی نظر آتی ہیں جس علاقے کو پیش کیاجاتاہے۔ چنانچہ ہمت رائے شرما، حسرت جے پوری، ساحر لدھیانوی وغیرہ نے غیرارادی طورپر فلمی نغمے ماہیوں کی صورت میں لکھے اور بہت مقبول بھی رہے۔ جیسے کہاجاتاہے کہ ادب اپنے عصر کی عکاسی کرتاہے یا ادب سماج کا آئنہ دار ہوتاہے اور یہ بھی حقیقت ہے کہ ادب پھوٹتاہی اپنے اردو گرد کے ماحول سے ہے۔

چنانچہ ماہیے بھی پنجاب کے علاقے سے وابستہ ہیں اور یہ ابتداء میں صرف گائی جانے والی روایت رہی اور بعد کو

اسے فلموں میں نغموں کی صورت میں استعمال کیاگیا۔ پھر وہ وقت بھی آگیا کہ باقاعدہ اس کو صنف کا درجہ دیاگیا۔ اس طرح ماہیہ نے بھی تدریجی طورپر ارتقاء کی منزلوں کو طے کرتے ہوئے ایک مقام حاصل کیا اور آج اردو میں کئی ماہیانگار موجود ہیں۔ بلکہ نوآموزہی نہیں کنہ مشق شعراء کو بھی اس نے اپنی طرف ملتفت کرنے میں کامیابی حاصل کی۔ اب یہ صرف پنجاب کی صنف نہیں بلکہ اب پنجاب نے اس صنف کی صورت میں اتنی وسعت اختیار کرلی جیسے اردو زبان نے، یعنی یہ اب عالمی طورپر لکھی جانے والی، پڑھی جانے والی اور چاہی جانے والی صنف بن گئی۔ دنیا کہ ہر خطہ میں جہاں بھی اردو بولی، لکھی اور پڑھی جارہی ہے اور جہاں سے بھی اردو جرائد اور رسائل کی اشاعت ہورہی ہے، ان میں اردو کی اور اصناف کے ساتھ ماہیا بھی شامل ہوگیا ہے خواہ وہ پرنٹ میڈیا ہو کے الیکٹرانک میڈیا، یعنی ای-میگزین میں بھی ماہیوں کی دھوم ہے۔ اس نے بہت جلد اپنے آپ کو منوالیا۔ اور اب کئی شعراء نہ صرف ماہیا لکھنے میں مصروف نظر آتے ہیں بلکہ اکثر شعراء نے تو صرف ماہیوں پر مشتمل مجموعہ بھی شائع کئے ہیں۔ اس طرح یہ فی زمانہ ہر دلعزیز صنف بن گئی ہے۔

ماہیئے سے متعلق حیدرقریشی کا خیال ہے کہ ؎

"پنجابی میں بھینس کو مئیں کہتے ہیں اور بھینس چرانے والے کو اسی نسبت سے ماہی کہاجاتاہے۔ ان چرواہوں کو بھینسوں پر نظر رکھنے کے سوا کوئی کام نہیں ہوتا تھا۔ اس لئے دیہاتی ماحول کے مطابق انھوں نے کئی مشغلے کے ذریعے وقت گزاری کا راستہ نکالا۔ بانسری بجانے اور گیت گانے کا مشغلہ ایسا تھا کہ بیک وقت چرواہے کا فرض بھی ادا کیاجاسکتا اور اپنے دل کو بھی بہلایا جاسکتا تھا.....

..... لیکن جب محبت کے قصوں میں رانجھے اور مہینوال کو اپنے اپنے محبوب

تک رسائی حاصل کرنے کیلئے چرواہا بننا پڑا تو پھر ان کرداروں کی رومانوی کشش نے لفظ ماہی کو چرواہے کی سطح سے اتھاکر نہ صرف ہیراور سوہنی کا محبوب بنادیا بلکہ ہر محبت کرنے والی منیار کا محبوب ماہی قرار پایا۔ اسی ماہی کے ساتھ اظہار کیلئے ماہیا عوامی گیت بن کر سامنے آیا۔"[32]

ماہیادراصل ہے کیا۔ یہ اردو میں ثلاثی، ہائیکو وغیرہ کی طرح تین مصرعوں والی نظم ہے۔ مگر اس کے تین مصرعے ہم وزن نہیں بلکہ پہلا اور تیسرا مصرعہ ہم وزن ہوتاہے جبکہ دوسرے مصرعہ میں ایک سبب کی کمی ہوتی ہے۔ حیدرقریشی نے جب دیکھا کہ ہندوستانی فلموں میں جو نغمے کے طورپر ماہیئے گائے گئے تھے ان کو بھی لیا، درحالانکہ یہ غیر شعوری طورپر لکھے گئے، باقاعدہ وزن کا خیال رکھ کر ماہیا نگاری کی ابتداء سے متعلق حیدرقریشی کا یہ کہنا ہے کہ چراغ حسن حسرت پہلے پہل کلکتہ کے اخبار "نئی دنیا" سے وابستہ تھے اور وہاں وہ فکاہی کالم لکھا کرتے تھے۔ ۱۹۳۰ء کے بعد جب وہ لاہور پہنچے تو یہاں بھی وہ مختلف اخباروں سے جڑ گئے۔ انہوں نے ۱۹۳۷ء میں پنجابی ماہیوں کے حسن سے متاثر ہوکر اردو میں ماہیئے لکھے۔ مگر اس میں وزن کا کوئی خاص خیال نہیں رکھا۔ یہ دراصل ہم وزن مصرعہ ہوگئے۔

جیسے

(۱)
باغوں میں پڑے جھولے
تم بھول گئے ہم کو
ہم تم کو نہیں بھولے

(۲)
راوی کا کنارا ہو

---

[32] اردو میں ماہیا نگاری صفحہ ۹

ہر موج کے ہونٹوں پر
افسانہ ہمارا ہو

برخلاف اس کے ہندوستان میں جب فلم "پھاگن" بنی تو اس کے پروڈیوسر راجندرسنگھ بیدی تھے جو اصلاً پنجابی اور انھوں نے قمرجلال آبادی سے ماہیئے لکھوائے تو وہ اصل وزن کے مطابق تھے۔ جیسے محمد رفیع اور آشا بھونسلے نے گایا۔

۱)
تم روٹھ کے مت جانا
مجھ سے کیا شکوہ
دیوانہ ہے دیوانہ

۲)
کیوگیاہے گانہ
ترامرا کیا رشتہ
یہ تو نے نہیں جانا

۳)
میں لاکھ ہوں بے گانہ
پھر یہ تڑپ کیسی
اتنا تو بتاجانا

٤)
فرصت ہو تو آجانا
اپنے ہی ہاتھوں سے
مری دنیا مٹاجانا

اس طرح اردو میں ماہیا نگاری کا اولیت کا سہرا قمرجلال آبادی کے سر بندھتاہے۔ مگر بعد کی تحقیق سے پتہ چلا کہ ہمت رائے شرما اردو کے اولین ماہیا نگار ہیں۔ یہ بحث انشاء اللہ حیدرقریشی کے تحقیق و تنقید کے باب میں ہوگی۔

قمرجلال آبادی کے بعد اردو ماہیا نگاری کا یہ سلسلہ چل پڑا ور فلموں میں ساحر لدھیانوی کے ماہیے دھوم مچانے لگے۔ چنانچہ پھاگن کے چند برسوں بعد فلم "نیادور" کے لئے ساحر لدھیانوی کے ماہیئے کام آئے جسے محمد رفیع نے ہی گائے۔

۱)
دل لے کے دغا دیں کے
یار ہیں مطلب کے
یہ دیں گے تو کیا دیں گے

۲)
دنیا کو دکھادیں گے
یاروں کے پسینے پر
ہم خون بہا دیں گے

اس طرح یہ سلسلہ چلتاگیا اور ادب میں باقاعدہ کتب و رسائل میں چھپنے لگے۔ ماہیئے، جس کے متعلق یہ آیا کہ یہ

ابتداء ہی سے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ہندی کی طرح اظہار عشق عورت سے مرد کی طرف ہوتا آیاہے۔ یا جیسے اردو میں ریختی یعنی مرد نے ہی لکھا مگر عورت کی جانب سے اس کی پیش کشی ہوئی۔ مثلاً

۱)
منجی دھپے چھانویں ڈرائی ہوئی اے
غم ساہنوں سجناں دا
لوکاں مرض بنائی ہوئی اے

"اس ماہیئے میں عورت کہہ رہی ہے کہ میں نے اپنی چار پائی آدھی دھوپ اور آدھی چھاؤں میں ڈال رکھی ہے۔ مجھے غم تو اپنے ماہی کی جدائی کا ہے۔ لیکن یہ لوگ میرے دکھ کو نہیں سمجھ رہے اور قیاس کررہے ہیں کہ میں بیمارہوں دھوپ چھاؤں کے الفاظ ایک طرف بہار کے موسم کی طرف اشارہ کررہے ہیں جب چھاؤں میں زیادہ دیر بیٹھے رہیں تو ٹھنڈکا احساس ہونے لگتاہےا ور دھوپ میں زیادہ دیر بیٹھیں تو دھوپ چبھنے لگتی ہے یوں بہار کے موسم میں ماہی کی جدائی کا دکھ بیان کیاہے۔ پھر کبھی دھوپ اور کبھی چھاؤں کے حصے کی طرف کروٹیں بدلتے رہنے سے اپنی بے چینی کا اظہار کیاہے۔ دھوپ چھاؤں کے الفاظ محبت میں لحظہ بہ لحظہ بدلتے ہوئے حالات کی بھی ترجمانی کرتے ہیں"۔



اس کے بعد ماہیئے میں وسعت آتی گئی اور حمدیہ، نعتیہ، منقبتی، عشقیہ، اصلاحی، سماجی، سیاسی، فلسفیانہ طرز کے ماہیئے، ماہیا نگاروں نے لکھے۔

حیدرقریشی نے جہاں اس بحث سے اردو ادب کو ماہیا جیسی صنف سے روشناس کروایا، وہیں آپ نے خود بھی اچھے اور بہت ہی معیاری ماہیئے لکھے۔ ان کے جملہ شعری مجموعوں میں نظموں اور غزلوں کے ہمراہ ماہیئے بھی در آئے ہیں۔ بلکہ آپ نے بھی صرف ماہیوں پر مشتمل ایک مجموعہ ترتیب دیا، بعد میں جب آپ نے اپنی جملہ تخلیقی کاوشوں کویکجا کردیا تو وہ کلیات "عمرلاحاصل کا حاصل" کے نام سے پہلے عوامی ایڈیشن ۲۰۰۵ء میں شائع کروایا۔ جس میں پانچ شعری مجموعے، دو افسانوی مجموعے، ایک خاکے، ایک یادیں، ایک انشائیے اور ایک سفر نامہ، اس طرح جملہ گیارہ کتابوں کو کلیات کی شکل میں طبع کروایا۔ ------ء میں یہی لائبریری ایڈیشن کی صورت میں منظر عام پر لایاگیا۔

اس کلیات کے تحت جائزہ لیں تو تادم تحریر حیدرقریشی نے منجملہ تین سوماہیئے تحریرکئے ہیں۔ ان میں حمدیہ، نعتیہ، سیاسی، سماجی، معاشرتی، عشقیہ، فلسفیانہ، اصلاحی، اقوال پر مبنی ماہیئے ملتے ہیں۔ حیدرقریشی چونکہ اصلاً پنجابی ہیں اور سرائیکی زبان سےبھی واقفیت رکھتے ہیں اسطرح انہوں نے گویا ماہیاکے رس کوپی لیا، بلکہ انکی سرشت میں رچی بسی اور گندھی ہوئی محسوس ہوتی ہے۔ اس کے باوجود جہاں تہاں چند ایک خامیاں نظر آتی ہیں۔ مگر وہ خامی، خامی نہ ہوتے ہوئے اختراع لگتی ہیں۔

اس قسم کی اختراع (خامی) ایسی شخصیتوں کیلئے عیب نہیں بلکہ ہنر کہلائی جاسکتی ہیں۔ کیونکہ میّر و غاؔلب کے یہاں بھی جب ایسی چیزیں راہ پاگئیں تو وہ استاد شعراء کے باب میں ہنر کا درجہ پالیتی ہیں۔ اس کے باوجود بعض نقادوں نے اسے خامی یا عیب ہی گردانہ ہے۔ میرؔ نے توبرملا کہلایا کہ ؎

ریختہ میں ہم سے بات نہ کر
یہ ہماری زبان ہے پیارے

حالانکہ بعض ایسی تعلیاں میرؔ سے سرزد ہوئیں کہ وہ خلاف فصاحت یا خلاف روزمرہ ہیں اس کے باوجود من و عن مستعمل ہوے جیسے ؂

سارے عالم پر ہوں میں چھایا ہوا
مستند ہے میرا فرمایا ہوا

یا پھر غالب کے ہاں قوافی میں عیوب نکالے گئے ؂

ابن مریم ہوا کرے کوئی
میرے دکھ کی دوا کرے کوئی

علم قوفی کے تحت ہرشاعر اپنے آپ پر پابندی یا آزادی مطلع میں ہی کرلیتاہے۔ اس طرح غالبؔ نے اس مطلع میں اپنے اوپر پابندی عائد کرلی مگر معاً دوسرے شعرسے خود کی برات کا اعلان کردیا۔ مگر ان استاد شعراء کو یہ جچتا بھی ہے۔ غالباً حیدرقریشی کے لئے بھی یہ کہاجاسکتاہے کیونکہ اولاً وہ پنجابی اور پنجابی ہونے کی وجہ سے وہ اہل زبان قرار پائیں گے اور پھر کچھ اختراعیں۔ جیسے ؂

۱) ہریالیاں گندم کی
پہنی ہیں دھرتی
نے بالیاں گندم کی

دھرتی نے کی بجائے دھرتی اور تیسرا مصرعہ نے سے شروع ہواہے

۲) باغات کی افشاں ہے
اور حسین جنگل
کی زلف پریشاں ہے

جنگل کی کی بجائے جنگل اور تیسرا مصرعہ کی سے شروع ہواہے

۳) چشمے کیساروں کے
فیض یہ دھرتی ماں

کے دودھ کی دھاروں کے
دھرتی ماں کے ہونا تھا۔

٤) چاند اور ستارے ہیں
ہم سب اس دھرتی
کے راج دلارے ہیں
دھرتی کے ہونا تھا۔

٥) بچپن کا زمانہ تھا
تتلی کے رنگوں
سے لکھا فسانہ تھا
رنگوں / سے

٦) خوشبوں انناس ایسی
میٹھے سے لہجے
میں باتیں کھٹاس ایسی
لہجے / میں

٧) تھوڑی سی پرانی ہے
انساں کی طوطا
چشمی کی کہانی ہے۔
طوطا/چشمی

٨) دنیا میں خراب ہوا
محبوب اور محب
میں عشق حجاب ہوا
محب/میں

لگ بھگ تین صدماہیوں میں یہ آٹھ ماہئے ایسے ہیں جو نظر میں کھٹکتے ہیں۔ مولانا حسرت موہانی نے ہندی کےیتی بھنگ دوش (Yati Bhang Dosh)کو اردو میں شکست ناروا کے نام سے روشناس کروایا، اور بعض ماہرین فن جیسے پروفیسر عنوان چشتی نے دولخت کا نام بھی دیا۔ اب یہاں شکست ناروا کی مناسبت سے راقم الحروف نے حیدرقریشی کے ان ماہیوں کی نسبت انسلاک ناروا سے تعبیر کرنا مناسب سمجھا۔

ہوسکتاہے اہل اردو اس کو مان بھی لیں۔ کیونکہ یہاں منسلک ہورہاہےمگر وہ ناروا طریق پر۔

ان کے برخلاف دیگر ماہیوں کی اپنی ایک شان ہے اور اسی وجہ سے حیدرقریشی کی اپنی شناخت اور پہچان ہے۔ ابتداء میں حمدیہ ماہیئے جو بعنوان "اپنے مولا کے حضور" سے خلق کئے گئے ہیں۔ اس کا انداز بہت اچھوتا اور سری الفہم ہے۔
ے

۱۔ توخود میں اکیلا ہے
تیرے دم سے مگر
سنسار کا میلا ہے

اس کے معابعد وجہ تخلیق کائنات سرکار دوعالم صلعم کی شان میں ماہیئے اور بہت عمدہ اور معیاری ہیں۔ جن سے اس بات کا اندازہ ہوتاہے کہ آپ صلعم سے انہیں کس قدر محبت ہے۔ مولانا حالیؔ نے جب مسدس لکھی تو سرسید احمد خاں نے اسے اپنے لئے باعث نجات قرار دیا۔ جہاں زمانہ جاہلیت کے معابعد مولانا حالیؔ نے بعثت رحمت العالمی کا ذکر ان الفاظ میں کیا ؎

ہوئے محو عالم سے آثار ظلمت کے طالع ہوا ماہ پرج سعادت
نہ چھٹکی مگر چاندنی ایک مدت کہ تھا ابر میں ماہتاب رسالت
یہ چالیسویں سال لطف خدا سے
کیا چاند نے کھیت غار حراسے

جبکہ حیدرقریشی نے صرف تین مصرعی ماہیا میں کس قدر جامع انداز میں پیش کیا۔ ملاحظہ فرمائیں

تاریک تھی، کالی تھی
تیرے مدثر نے
جب دنیا اجالی تھی

اور کس قدر کمال ہے آپ کو کہ سمندر کو کوزہ میں بند کرنے کا۔ یہ قدرت کلام ہے۔ ان کے ماہیوں میں کہیں کہیں قرآنی

آیات کی ترجمانی، کہیں احادیث اور کہیں اقوال سلف صالحین کو ماہیوں کے ذریعہ پیش کردیا۔ اور اس میں تلمیحی انداز کی تو داد دینی پڑتی ہے۔

اد درجہ کشادہ ہے
شہر عالم کا دل
بے حد سے زیادہ ہے

اس ایک ماہیا میں وہ سارا منظر آنکھوں کے سامنے پھر جاتاہے جو حضرت مولانا جلال الدین رومی اور حضرت شمس تبریزی کے مابین جو مکالمہ ہوا اور آپ گھوڑے سے غش کھاکر گرگئے۔ اس میں جہاں تلمیح ہے وہیں محاکاتی پہلو بھی آگیا۔ اس طرح دو صنعتیں ایک ساتھ آگئیں۔

حیدرقریشی صرف ماضی ہی کو نہیں بتاتے بلکہ وہ ایک بیدار مغز فنکار ہونے کا پورا پورا ثبوت بھی پیش کرتے ہیں کہ جہاں انکی نظر ماضی پر گہری ہے۔ وہیں حال سے باخبر اور شعوری طورپر باخبر اور مستقبل کی بھی نویاسناتے نظر آتے ہیں۔ اور وہ بحیثیت انسان زمین سے جڑے رہنے کو ترجیح بھی دیتے ہیں۔ انھیں احساس ہے کہ وہ قادر و توانا خدا ہی ہے اور اس کے اذن کے بغیر کچھ نہیں ہوتا۔ اور مانگنا بھی اسی سے ہے۔ حالیؔ نے مسدس میں یہ کہاتھا ؎

اسی پر بھروسہ ہمیشہ کرو تم   اسی کے سدا عشق کا دم بھرو تم
اسی کے غضب سے ڈرو گر ڈرو تم   اسی کی طلب میں مرو جب مرو تم
مبرا ہے شرکت سے اسکی خدائی
نہیں اس کے آگے کسی کو بڑائی

حیدرقریشی کا ماہیا دیکھئے۔

ہمت اور طاقت دے
عہد یزیدی میں
شبیری شجاعت دے

اس ماہیئے میں جہاں تلمیح ہے وہیں یہ عصری ماہیہ بھی ہوگیاہے۔ یہی وہ شاعرانہ مہارت ہے جہاں لفظ نگینے کیطرح جڑجاتے ہیں اور کم سے کم الفاظ میں وہ قوت اور تاثیرہوتی ہے کہ ایک داستان بلکہ تاریخ کو اپنے اندرجذب کرلینے کا ہنر رکھتی ہے۔ جہاں انسان اس خدائے قادر اور توانا کے آگے اظہار بے بسی کرے اور مدد درسی سے مانگے کیونکہ وہی ہمت اور طاقت دینے والا ہے اور دوسرے مصرعے میں دورحاضر کو عہد یزیدی سے تعبیر کرنا غیر معمولی علامتی انداز ہے اور اس کی مناسبت سے تلمیحی طرز کو اختیار کرکے شبیری شجاعت اس خدائے قدوس سے طلب کرنا جہاں حق اور صداقت کی خاطر باطل سے بھڑنے اور دنیاوی خداؤں سے بچنے کی توفیق عطا ہو، معمولی بات نہیں ہے۔ یہیں آکر حیدرقریشی کے ماہیوں پر زبردست گرفت کا اندازہ لگایاجاسکتاہے۔ جس میں گہرائی، گیرائی، اور علمی تجرکا پتہ چلتاہے۔ اور اسی باب میں ایک تڑپ ہے شاعر کے ہاں کے پھر سے تمام عالم انسانیت میں پیار و محبت کی روشنی ان کے سینوں میں بھردے۔ ایک دوسرے سے وہ محبت کرنے والے بنیں اور ایک دوسرے کو سمجھنے والے بنیں۔ کہتے ہیں ؎

دنیا پہ کرم کردے
پیار کی سینوں میں
پھرروشنیاں بھردے

سوھنی دھرتی:

اس عونان کے تحت گیارہ ماہیئے لکھے ہیں۔ اس عنوان ہی سے اندازہ ہوتاہے کہ یہ پنجاب کی سرزمین سے متعلق ہیں۔ اس صوبہ یا علاقہ کا نام بھی پنج+آب ہے۔ یعنی یہاں پانچ بڑی ندیاں بہتی ہیں اور یہاں کی ہریالی، سرسبزی و شادابی، موسم، میلے، رنگت، وغیرہ کو ماہیوں میں تسلسل سے باندھا ہے۔ یہاں کے کھیت کھلیان، باغات اور فصلوں پر روشنی ڈالی ہے۔

کیا روپ نکالاہے

گردن میں اس کی
دریاؤں کی مالاہے

پنجاب کے نقشہ کو دیکھنے سے اندازہ ہوتاہے کہ یہ دریائیں گویا اس کے گلے کی مالائیں ہیں۔ تشبیہ کا نرالا انداز ہے۔ ؎

خوشبواحساس اس کا
رنگت سرخ سفید
اور سبز لباس اس کا

چند رشتے:

اس عنوان کے تحت بھی گیارہ ماہیئے ہیں۔ ان میں ماں باپ، بھائی، بہن، بیوی، بیٹے اور بیٹیوں سے متعلق جذباتی انداز میں ذکر ہے۔ اور یہ انداز ہی نرالا ہے اور آفاقی حدوں کو چھولیاہے۔

برگد کی جٹائیں ہیں
ساتھ مرے اب بھی
ابو کی دعائیں ہیں

تب آنکھ برستی ہے
دل میں کہیں چھپ کر
ماں جب مری ہنستی ہے

اس ماہیئے کو پڑھنے پر معاً علامہ اقبؔال کا وہ شعر ذہن کے پردے پر آجاتاہے۔ جو آپ نے نظم والدہ مرحوم کی یاد میں کے تحت لکھاہے۔ ؎

عمربھر تیری محبت میری خدمت گررہی
میں تری خدمت کے قابل جب ہوا تو چل بسی

یاد آہی گئے آخر
کچھ بھی سہی لیکن
بھائی ہیں مرے آخر

اس سے اپنے برادران کی تلخی ظاہرہورہی ہے۔ اور یہ کہاں نہیں ہوتا۔ لیکن جب یہ بیٹے کے عنوان کے تحت ایک ماہیہ مگر بہت عمدہ ؂

دریا کی روانی ہے
اب مرے بیٹوں میں
مری گذری جوانی ہے

تشبیہات کا انداز واقعی نرالاہے۔ اور کس قدر چست لفظیات کا استعمال۔ بیوی سے متعلق کہاجاتاہے کہ وہ مرد کی پسلی سے نکالی گئی ہے۔ حیدر کا انداز ملاحظہ ہو ؂

اک روح کا قصہ ہے
میرے بدن ہی کا
جو گم شدہ حصہ ہے

بظاہر معمولی بات لگتی ہے۔ مگر فنکاری یہی ہوتی ہے کہ معمولی کو غیر معمولی بنادیاجائے اور یہ ہنر حیدرقریشی کے ہاں بدرجہ اتم موجود ہے۔

پھول رت اور داستانیں کے عنوان سے علی الترتیب چھے چھے ماہیئے رقم کئے ہیں۔ جو موسم بہار اور داستانوں میں مختلف جیسے ہیررانجھا، سونہی مہیوال، رسی پنوں، کرشن کنہیا اور رادھا، رام اور سیتا پر ماہیئے ہیں۔ اس کے بعد ہندوستانی اور خاص طورپر پنجاب کی دھرتی کی رسموں پر ماہیئے آنکھوں دیکھا حال بیان کررہے ہیں۔ جو شادی بیاہ سے وابستہ ہیں۔ جن میں مہندی کی رسم ہے اور رخصتی کا منظر ہے۔ اس کے بعد مکالمے کی صورت میں عورت اور مرد کی اظہار خیال ہے۔ جو یقیناً کسی فلم کے بہترین نغمہ ہوسکتے ہیں۔

مہندی سے متعلق ماہیئے ملاحظہ ہوں۔

(۱
مہندی جب لال ہوئی
شرم سے بنوبھی
تب لال گلال ہوئی

(۲
رنگ مہندی کا گہرا ہے
حسن خزانہ ہے
اور زلف کا پہرا ہے

رخصتی کا منظر کچھ یوں درآیاہے۔

(۱
یہی رسم زمانہ ہے
بابل کے گھر کو
اب کے چھوڑ کے جانا ہے

(۲
رخصت کی گھڑی آئی
دل ماں کا دھڑکا
آنکھوں میں جھڑی آئی

(۳
اشکوں کی صداؤں میں
رخصتی ہوتی ہے
خوشبوں کی دعاؤں میں

(٤
آباد رہیں مولا
پیار بھرے دونوں
دل شادر ہیں مولا

مکالمے کی صورت میں ماہیئے دیکھئے

مرد: کتنے بدنام ہوئے
پیار میں تیرے ہم
پھر بھی ناکام ہوئے

عورت: ناکامی سے ڈرتے ہو
عشق بھی کرتے ہو
بدنامی سے ڈرتے ہو

مرد: اس حال فقیری میں
عمریں بیت گئیں
زلفوں کی اسیری میں

عورت: زلفوں سے رہا ہوجا
اب تری خیر کرے
جاہم سے جدا ہوجا

مرد: کیا لفظ رہائی کا
دل جب سہ نہ سکے

مرد+عورت ملناہوتو ملتے ہیں



دکھ تیری جدائی کا
پھول محبت کے
پت جھڑ میں بھی کھلتے ہیں

حیدرقریشی کے ہاں چونکہ شاعرانہ مزاج ہے اور یہ مزاج انکی فطرت میں رچابساہے۔ اس لئے انھیں کہیں دقت پیش نہیں آتی بلکہ شاعری انھیں لکھنے پہ مجبور کرتی ہے۔ وہ شاعری نہیں کرتے۔ یہ کیفیت ان کے ماہیوں سے عیاں ہے جس میں آمد کی کیفیت درآئی ہے۔ کس قدر رواں اور غیر معمولی انداز سے اور سبک روی سے وہ ماہیئے کہتے ہیں کہ حیرت ہوتی ہے۔ ان ماہیوں میں بھی جس طرح کے تشبیہوں کا استعمال انہوں نے کیا ہے وہ قابل تعریف بھی ہے اور آنے والوں کیلئے مشعل راہ بھی۔ کیونکہ موقع اور مناسبت کے لحاظ سے، علاقائی کیفیات کو مدنظر رکھتے ہوئے اسی مناسبت سے تشبیہوں کو برتا اور پیش کیاہے۔ اسی کو قادرالکلامی کہاجاتاہے۔ ماہیوں کا رنگ ملاحظہ ہوں ؎

۱)
ہونٹ اس کے اناری ہیں
گال ہیں اس کے یا
دو سیب قندھاری ہیں

۲)
اک خواب ہے جندڑی کا
اس بھری لڑکی ہے
یا آم ہے سندھڑی کا

۳)
ان آنکھوں کی مغروری
ہوش اڑا ڈالے
وہ شربت انگوری

٤)
سوہنی ہے یا ہیرہے وہ
اتنی ہے مجھ کو خبر
جنت کا انجیر ہے وہ

اردو کی افسانوی ادب اور خاص طورپر منشی پریم چند کے فکشن میں ہندوستانی دیہات کو قریب سے دیکھنے اور اس سے محظوظ ہونے کا ذکر ملتاہے۔ شاعری میں نظموں میں البتہ وہ کیفیات ہمیں ملتی ہیں۔ دیہی یا اس سے بھی انوکھے انداز میں اگر دیہات کی سیر کرنی ہے اور اس ماحول سے حظ اٹھانا ہے تو حیدرقریشی کے ماہیوں کو پڑھنا ہوگا۔ کیونکہ یہ دیہات پنجابی دیہات ہیں جو صرف ہمیں احمد ندیم قاسمی کے افسانوں میں ملتے ہیں۔ وہ دیہات، جہاں کا موسم اور وہاں کی مٹی کی بوباس، درختوں کی چھاؤں، ہریالی کا منظر، مختلف فصلوں کو اپنی آنکھوں سے دیکھتاہوا محسوس کرسکتے ہیں۔ انداز ملاحظہ ہو۔

۱)
پودے جو کپاس کے ہیں
منظر پھولوں کے
خوشیوں کی آس کے ہیں

۲)
خوشبوؤں کے تختوں سے
آتے رہے جھونکے
کینوں کے درختوں سے

۳)
بور آگیا آموں کا
رونقیں جاگ اٹھیں
دیہات کی شاموں میں

٤)
اللہ کی گائیں ہیں
باعث برکت جو
بوڑھی امائیں ہیں

۵)
پگڈنڈیوں کے دل دھڑکیں
بستی میں پکی
جب بچھنے لگی سڑکیں

٦)
بجلی کے مسلے کھمبے
کٹ گئے رستے میں
جو پیڑ بھی تھے لمبے

اسی دیہات کے تناظر میں مزید ماہیئے جسے آپ بیتی بھی کہہ سکتے ہیں اور جگ بیتی بھی۔ ویسے جب بیتی کو آپ بیتی کے انداز میں لکھنا ہی فنکاری ہے اور یہ فنکاری حیدرقریشی کا وصف خاص ہے۔ دیہات گاؤں میں رشتوں دوستیوں اور اپنے پن کی کیفیات کا انداز ہی کچھ اور ہوتاہے۔ ان میں انسانی مروتیں دیکھنے کے قابل ہوتی ہیں۔ وہ محبتیں اور مروتیں خالص جذباتی ہوتی ہیں اور ان میں ریاکاری نہیں ہوتی۔ روٹھنے اور منانے کی کیفیت بھی عجیب ہوتی ہے۔ وہاں روٹھنے بھی جلدی ہیں اور منتےبھی جلدی ہیں۔

١)
بے شک ہیں جدا مولا
میرے پیاروں کو
خوش رکھنا سدا مولا

٢)
اتنے نہ ترس جائیں
پیاس کے ماروں کی
آنکھیں نہ برس جائیں

٣)
چپ کا افسانہ تھا
دل یہ ہمارا تو
خاموش دوانہ تھا

٤)
روٹھے کو منانا ہے
وقت جو بیت گیا
پھر واپس لانا ہے

۵)
چلنے کو ترستے ہیں
منزل گم ہے کہیں
بکھرے ہوئے رستے ہیں

٦)
حالات کے دھارے سے
آن لگے آخر
ہم اپنے کنارے سے

اس کے ساتھ اپنے بچپن کی یادوں کو بھی حیدرقریشی نے ماہیوں میں بند کردیاہے۔ وہ ایسا نہیں کہ صرف حیدر کے بچپن کا زمانہ یا کھیل کود تھے، اس میں بھی انہوں نے آفاقیت کا رنگ بھردیا جس کی وجہ سے ہر قاری کے دل کو چھولیتے ہیں اور قاری پڑھتے ہوئے اپنے بچپن میں چلاجاتاہے۔ چند ماہئے بطور مثال دیکھئے:

۱	۲	۳
بچپن کے خزانے میں کتنے زمانے تھے اس ایک زمانے میں	ایک یاد تھی بستے میں کھوگئی جانے کہاں اس عمر کے رستے میں	جو چاہا بنا ڈالا لکھا سلیٹوں پر جب چاہا مٹا ڈالا
فٹ بال میں تیکھے تھے اور کبڈی کے کچھ داؤ بھی سیکھے تھے	اشٹاپو کے خانوں میں قید ہے دل اب تک بچپن کے زمانوں میں	جیتا کبھی ہارا تھا "گلی ڈنڈا" بھی اک کھیل ہمارا تھا
جب کھیل نے "کھو بیٹھے دیکھ کے اک ساتھی ہم اس کو ہو بیٹھے	تقدیر ہی پھوٹ گئی پینگ چڑھالی جب تورسی ٹوٹ گئی	چاہت کی گواہی کا کھیل لڑکپن کا تھا چور سپاہی کا

اس طرح حیدرقریشی کے ہاں کبھی اپنے گاؤں کی مٹی کی بوباس ان کے ماہیوں سے محسوس کرسکتے ہیں تو کبھی جرمنی کی وہ پرفضا، پرکیف وادیوں میں اپنے آپ کو محو کرسکتے ہیں۔ ان کے ہاں ان کے اپنے رشتہ داروں پر بھی ماہیئے ملیں گے اور دوست احباب پر بھی، عبادات پر بھی ماہیئے لکھے ہیں اور شوخیوں پر بھی غرض اس چھوٹی سی صنف میں حیدرقریشی نے بڑے کمالات کردکھائے ہیں۔

*****


باب سوم
جہت نثر

حیدرقریشی کی افسانہ نگاری

اردو میں افسانہ نگاری کی روایت بڑی دیرینہ اورمستحکم ہے۔ یہ اوربات کے دیگر اصناف کے مقابلے میں کم ہے۔مگر اب یہ اردو کی اہم صنف ہے۔ ابتداء میں رومانوی افسانے سجاد حیدریلدرم اور ان کے عہد کے احباب نے لکھا اور معابعد منشی پریم کا نام آتاہے۔ جسے حقیقت سے آشنا کرایا۔ وہ طلسمی فضا جو ایک دور میں افسانوی ادب کا طرہ امتیاز بنی ہوئی تھی اس سے نکال کر اسے حقیقت کی طرف لانے میں منشی پریم چند کا نام آتاہے۔ اور اس لحاظ سے باقاعدہ پہلا افسانہ نگار قرار پاتاہے۔ کیونکہ افسانہ صرف یہی نہیں ہوتا بلکہ اسے ایسی فضا میں تیار کیاجاتاہے کہ وہ حقیقت ہونے کے باوجود افسانہ ہی تصور کیاجاتاہے اور وہ افسانہ، فسانہ نہیں بلکہ حقیقت کا ترجمان ہوجاتاہے۔ منشی پریم چند نے اپنے اردو گرد کے ماحول کو اور ہندوستانی دیہات کو موضوع بناکر ایک دو نہیں بلکہ تین سو سے زائد افسانے تحریر کئے۔ جن میں یہاں کی ریتی رواج اور غلط رسومات، رشوت ستانی، اور سماجی برائیوں پر خاصا طنز بھی ملتاہے اور ان میں وہ اصلاح چاہتے تھے اس لئے وہ تڑپ اٹھتے ہیں۔ یہ سارے افسانے سماجی حقیقت نگاری کا بہترین مرقع کہے جاسکتے ہیں۔ ایک موقع پر انھوں نے تاریخ اور فکشن کی تعریف کچھ اس انداز سے کی ہے:

تاریخ میں سب کچھ جھوٹ ہوتاہے
سوائے مقام اور تاریخ کے اور افسانے
میں سب کچھ سچ ہوتاہے سوائے مقام
اور تاریخ کے۔

اس حوالے کو شمس الرحمٰن فاروقی کی کتاب افسانے کی حمایت میں دیکھاجاسکتاہے۔ منشی پریم چند کی وفات 1936ء میں ہوئی۔ اور 1936ء کا سال اردو افسانے کا ایک سنگ میل رہا۔ کیونکہ اسی سال ہندوستان میں ترقی پسند تحریک کی بنیاد پڑی اور یہ

ترقی پسندی کا رجحان بہت پہلے سے پروان چڑھ رہاتھا۔ اب اسے باقاعدہ ایک منظم تحریک کی شکل میں منظر عام پر آنا تھا اور نہ صرف ہندوستان بلکہ دنیا کے دیگر ممالک میں اس طرح کی تنظیمیں بن رہی تھیں۔ 1917ء میں روس کا انقلاب ساری دنیا کو یہ بتارہاتھا کہ دیکھو جہاں جہاں آمریت ہے اس کا خاتمہ کیاجاسکتاہے اور عوامی حکومت بنائی جاسکتی ہے۔ عوام اپنی آزادی کیلئے کچھ بھی کرسکتے ہیں۔ مگر عوام میں اس آزادی کے جذبہ کو پروان چڑھانے میں ادباء اور شعراء کی بہت بڑی ذمہ داری ہوتی ہے۔ اور یہی کام دنیا بھر کے ادباء شعراء کررہے تھے۔ چنانچہ 1935ء میں ترقی پسند مصنفین کا اجلاس فرانس میں منعقد ہوتاہے اور وہاں سجاد ظہیر اور ان کے ساتھیوں نے اس میں شرکت فرمائی اور ساری روئداد ہندوستان میں رہنے والے ادیبوں اور شعراء کو بتادی۔ کیونکہ اس وقت ہندوستان غلامی کی زنجیرروں میں جکڑا ہوا تھا اور اسے انگریزی سامراجیت سے آزادی دلانی ضروری تھا۔ اس کیلئے دیگر افراد مختلف سطحوں پر سرگرم تھے۔ مگر ایک ادیب، شاعر اور فنکار ہونے کے ناطے اس کا کیا منصب ہونا چاہئے وہ کس طرح عوام میں بیداری پیدا کرسکتاہے یہ ان کے پیش نظر تھا۔ چنانچہ 1936ءمیں باقاعدہ ترقی پسند تحریک کی بنیاد پڑی اور اس کا اجلاس لکھنو میں منعقد کیاگیا۔ جس کی صدارت منشی پریم چند کو سونپی گئی۔ منشی پریم چند نے اس اجلاس کا صدارتی خطبہ کیا پڑھا کہ نئے لکھنے والوں میں ایک نئی روح پھونک دی۔ ان میں جان ڈال دی۔ اور انھوں نے بتادیا کہ ادب کا منصب کیاہے۔ لکیر کا فقیر رہنے کو ادیب یا شاعر نہیں کہتے بلکہ ادیب یا شاعر تو وہ ہوتاہے جو اپنے عہد کے حالات پر گہری نظر رکھتاہو اور ان سے نہ صرف آشناہو بلکہ وہ اپنے ہم عصروں کو ان سے روشناس کراتارہے۔ ادیب یا شاعر اپنے فن کا استعمال صرف وقت گذاری یا طفنن طبع کی خاطر نہیں کرتا بلکہ اس میں جلا بخشنے والی اور انھیں زندہ کرنے والی کیفیت پیداکرے اور بتادے کہ اب تم سوؤگے نہیں بلکہ جاگو گے کیونکہ سونا موت کی علامت ہے۔ اسطرح اس داستانی عہد پر ایک طنز

بھی تھا۔ کیونکہ داستانیں سناکر سلانے کا کام لیاجاتاتھا۔ اب سلانے کا نہیں بلکہ جگانے کا زمانہ ہے کیونکہ سوکر اور خواب غفلت میں رہ کر ہم نے بہت کچھ بلکہ سب کچھ کھودیاہے۔ اور اب جاگنے کا اور جگانے کا وقت آگیاہے۔ چنانچہ اس خطبہ میں فرماتے ہیں:

"ہماری کسوٹی پر وہ ادب کھرااترے گا جس میں تفکر ہو، آزادی کا جذبہ ہو، حسن کا جوہر ہو، تعمیر کی روح ہو، زندگی کی حقیقتوں کی روشنی ہو، جو ہم میں حرکت اور ہنگامہ اور بے چینی پیداکرے سلائے نہیں کیونکہ اب اور زیادہ سونا موت کی علامت ہے"۔[33]

اس طرح نہ صرف ان تمام افراد کو جو اس اجلاس میں شریک تھے بلکہ مستقبل میں آنے والے تمام افراد کو جو ادب سے وابستہ ہونے والے ہیں انہیں یہ تلقین کرتے ہیں کہ ادب کیاہے اور اس کا منصب کیا اقتباس ملاحظہ ہو:

"---- ادیب وہی کام تحریر کرتاہے۔ ہاں اس کے سننے والوں کا دائرہ بہت وسیع ہوتاہے۔ اور اگر اس کے بیان میں حقیقت اور سچائی ہے تو صدیوں اور قرنوں تک اس کی تحریریں دلوں پر اثر کرتی رہتی ہیں۔ میرا منشا نہیں کہ جو کچھ سپرد قلم ہوجائے وہ سب کا سب ادب ہے۔

ادب اس تحریر کو کہتے ہیں جس میں حقیقت کا اظہار ہو، جس کی زبان پختہ، شستہ اور لطیف ہو اور جس میں دل و دماغ پر اثر ڈالنے کی صفت ہو اور ادب میں یہ صفت کامل طورپر اسی حالت میں پیدا ہوتی ہے جب اس میں زندگی کی حقیقتیں اور تجربے بیان کئے گئے ہوں۔[34]

---

[33] تاثر اور تنقید، ص ۳۱

[34] تاثر اور تنقید، ص ۲۸

اس طرح منشی پریم چند کے اس خطبے سے ترقی پسند افرادم یں ایک جان پڑگئی اور انہوں نے خواہ وہ شاعر ہو یا افسانہ نگارہر میدان میں اس سے کام لیا اور ہم دیکھتے ہیں کہ اس تحریک کے تحت خصوصی طورپر یعنی نظم اور افسانہ نگاری بڑی حدتک مستحکم ہوگئیں اور معاشرہ پر بہت اثرانداز ہوئیں۔ کیونکہ یہ عوامی جذبات کی ترجمانی تھیں اس لئے عوام کے دلوں میں گھر کرگئیں۔

زمانہ جوں جوں ترقی کرتاگیا ویسے ویسے ادب میں بھی تبدیلیاآتی گئیں۔ اور خاص طورپر افسانے میں بہت تجربے ہونے لگے۔ جہاں ترقی پسند تحریک کا مقصد معاشرے کے مسائل بیان کرنا تھا وہیں بعد کے حالات یا بعد کی تحریکیں، رویے اور رجحانات جو آئے ان کے مسائل اور دیکھنے کا اندازہ الگ ہوگیا۔ یہ سب عالمی تبدیلیوں کے پیش نظر تھا۔ بجائے جماعت کے فرد کی اہمیت پر زور دیاجانے لگا۔ کیونکہ ہمارا معاشرہ بھی تبدیل ہوگیا۔ اب دیہات ہمارے پیش نظر نہیں رہے بلکہ شہر اور شہری زندگی ہمارے ادب کا حصہ بنتی گئی۔ اس طرح شاعری ہوکے افسانہ نگاری اس میں بھی تبدیلی ہوتی گئی۔ اتناہی نہیں جدیدیت کے تحت جو ادب تحریر کیاگیا وہاں بہت کچھ تجربے ہوئے خاص طورپر افسانے میں کہ اب بیانیہ نہیں بلکہ تجریدی اور علامتی افسانے لکھے جانے لگے۔ جب تک بیانیہ تھا اس میں تشبیہات و استعارات سے کام لیاجارہاتھا۔ مگر اب علامت اور پیکر تراشی، ساتھ ساتھ تجریدی آرٹ کا بھی عمل دخل ہونے لگا۔ اور اس طرح افسانےلکھے جانے لگے۔ بعد میں اس میں بھی بہت اچھے اور معیاری افسانے منظر عام پر آئے۔

ترقی پسند تحریک کے تحت لکھے گئے افسانے آج بھی وہی اہمیت رکھتے ہیں جو اس زمانے میں رکھتے تھے۔ وہ خواہ بیدی کے ہوں کے منٹو کے، عصمت کے ہوں کہ حیات اللہ انصاری کے۔

بعدکے افسانہ نگاروں میں بہت سے نام آتے ہیں۔ جن میں اہم نام یہ ہیں قرۃ العین حیدر، انتظار حسین، جوگندرپال، سریندر پرکاش، جتندر بلو، قیصر تمکین، مصطفیٰ کریم، ہرچرن چاولہ،

خالد سہیل، سلطانہ مہر، سلام بن رزاق، حمید سہروردی، مظہر الزماں خاں، بیگ احساس وغیرہ وغیرہ۔

انھیں کی کھیپ سے تعلق رکھنے والے حیدرقریشی بھی ہیں۔ جنہوں نے علامتی افسانے تحریر کئے اور جن میں عصری حالات کو اسطواری طورسے پیش کرنے کا دلکش انداز میں موجود ہے۔ اساطیر کے حوالے سے آج کے عہد کو دیکھتے ہوئے آئندہ کی خبر دیتایا آئندہ کا اندازہ لگانا یہ حیدرقریشی کے افسانوں کی خصوصیات ہیں۔

حیدرقریشی کے افسانے ہوں یا دیگر تحریریں ان میں دنیاوی حقیقیتیں بھی ہیں اور لاشعوری احساسات جسے باطنی کیفیات سے تشبیہ دی جاسکتی ہے کیونکہ ان کے افسانے خاص طورپر اس کی غمازی کرتے نظر آتے ہیں۔ ایک موقعہ پر انہوں نے انٹرویو کے دوران کہاتھاکہ:

> "میری زندگی کے سارے نشیب و فراز لاشعوری طورپر میرے شعور کی تعمیر میں اہم کردار ادا کرتے رہے ہیں۔ لہٰذا میری عملی زندگی میں پیش آنے والے مسائل اور سوالات ہی میرے کسی نظام فکرکی تشکیل کا باعث بنے ہوں گے۔ اور لاشعوری طورپر سہی کسی نہ کسی رنگ میں میری تخلیقات میں در آئے ہونگے"۔[35]

جیساسطور بالا میں بتایاگیا کہ منشی پریم چند نے جس حقیقت نگاری کا ذکر کیاکہ ادب میں یہ صنعت کامل طورپر اسی حالت میں پیدا ہوتی ہے۔ جب اس میں زندگی کی حقیقتیں اور تجربے بیان کئے گئے ہوں۔ بلاشبہ اگر اس کو درست مان لیاجائے تو حیدرقریشی کی تخلیقات اور افسانے کچھ اسی طرز پر نظر آتے ہیں۔ دیکھئے فرحت نواز کیا فرماتے ہیں:

> "حیدرقاریشی اپنی تمام تخلیقات میں خود سانس لیتے ہوئے اور زندگی بسر کرتے ہوئے موجودہیں۔ خود اس طرح کہ ان کی اپنی زندگی

---

35 جواز جعفری سے گفتگو، مشمولہ حیدرقریشی کے انٹرویو : مرتبہ سعید شباب

کے ساتھ ان سے وابستہ تمام اہم کردار بھی ان کی تخلیقات میں موجود ہیں۔ بعض کھلی کتاب کی طرح ہیں۔ لیکن ایسی کھلی کتاب جس کے معنی مسلسل کھتے چلے جاتے ہیں"۔

ان کے افسانوں کا خاصہ یہی رہا کہ اپنے معاشرے وہ خود سے الگ نہیں سمجھتے اور نہ خود کو معاشرے الگ تصور کرتے ہیں۔ کبھی خود میں معاشرے کو کبھی معاشرے میں خود کو سمجھنا معمولی بات نہیں اور یہ ایک سچے فنکار کی نشانی ہوتی ہے۔ حیدرقریشی کے بیشتر افسانوں میں کہانی پن موجود ہے مگر ان کہانیوں میں بھی کہانیاں ہوتی ہیں۔ گوکہ کہیں تجریدی ہیں اور کہیں علامتی اس کے باوجود تسلسل برقرار ہے۔ پاکستان کے مشہور افسانہ نگار،رشیدامجد، حیدرقریشی کی افسانہ نگاری کے تعلق سے فرماتے ہیں۔

"ہرکہانی کے اندر ایک اور کہانی ہوتی ہے اور افسانہ نگارکہانی کی ظاہری سطح کے اندر ایک اور کہانی پیداکرنے کا فن جانتاہے وہ بڑا افسانہ نگار ہے۔ حیدرقریشی کی اکثر کہانیوں میں یہ خوبی موجود ہے"۔ [36]

حیدرقریشی کے افسانوں کا معاملہ یہ ہے کہ اس میں جہاں حقیقی صورتحال درآتی ہے وہیں دور جدید کے سائنسی اور تکنیکی انقلاب اور موجودہ دور کی تہذیب کی تنقیدی تفہیم بھی اس میں مل جاتی ہے۔ مگر ایک اچھے اور سچے ادیب کی پہچان رشید امجد ان معنوں میں کرتے ہیں۔

"سچاادیب آگہی کی جس اذیت سے گزرتاہے اس کا اظہار حلاج کی طرح ہوجائے تو موت کا پھندا ہر وقت منتظر ہے اور اظہارنہ ہوتو سچائی کا کرب اندر ہی اندر کاٹتارہتاہے۔ توڑتارہتاہے۔ اس اندرونی توڑ پھولڑ کا اظہار کسی سطح پر ہو یہی ادیب کے مقام کا تعین

[36] سہ ماہی عکاس، کتاب نمبر ٤، یکم اکتوبر 1995

کرتاہے۔ خود حیدرقریشی کو بھی اس کا احساس ہے۔ ڈاکٹر وزیرآغا سے ایک گفتگو میں انہوں نے کہا، "لکیر کے بقیر معاشرہ میں آزادانہ غوروفکر کرنے والوں کیلئے ایک طرف آگہی کی اذیت ہوتی ہے اور دوسری طرف معاشرے کی ملامت" اور یہ تو بالکل سچ ہے کہ آگہی کی اذیت ہی سے گزر کر بڑا ادب تخلیق ہوتاہے۔ اب اس حوالے سے حیدرقریشی کی کہانیوں کو دیکھ لیں تو صورت حال واضح ہوجاتی ہے۔ ان کی کہانیاں بظاہر سیدھی سادی ہوں یا کسی فکری مکاشفہ کی دریافت ان میں آگہی کا کرب پوری طرح موجودہے یہی ایک سچے فنکار کی پہچان اور جواز ہے۔[37]

اس طرح افسانوی حوالے سےجائزہ لیاجائے تو حیدرقریشی ایک سچے فنکار کی حیثیت سے ہمارے سامنے آتے ہیں جنہوں نے معاشرے میں ہورہی اتھل پتھل کو اور نشیب و فراز کو اپنے افسانوں میں پیش کیا۔ یہی کچھ منشی پریم چند بھی پیش کررہے تھے تو سوال یہ پیدا ہوتاہے کہ سترکی دہائی کے بعد افسانہ نگاری میں قدم رکھنے والا فنکار کیا ترقی پسند ہے؟ مگر ان کے افسانوں کی بنت جدیدیت کے زیر نظر لگتی ہے۔ اور مواد موضوع ترقی پسند۔ آخران کا شمار کس میں ہو۔ جبکہ ناصر عباس نیر نے ایک جگہ لکھا کے سترکی دہائی والی نسل نے اولاً جدیدیت کے اثرات قبول کئے اور بعد ازاں اس جدیدیت کا محاسبہ کیا۔ محاسبہ کرنے والوں میں حیدرقریشی بھی شامل ہیں۔

اب دیکھیں کے حیدرقریشی آیا ترقی پسند ہیں یا جدیدیت کے حامی اس تعلق سے رشید امجد کا اپنا ذاتی خیال کیاہے؟

"حیدرقریشی کو فکری طورپر میں ایک جدید ترقی پسند افسانہ نگار سمجھتاہوں کیونکہ ان کے

---

37 عکاس، 2005ص، ۲۷

> افسانے سماجی زندگی کے خمیر سے تیار ہوتے ہیں۔ اور معاشرے کے دکھ اور مظلوم کی بے بسی ان میں موجود ہے۔ اس حوالے سے کہاجاسکتاہے کہ ان کے موضوعات ترقی پسند ہیں اور معاشرے کو بدلنے کا آدرش رکھتے ہیں۔ لیکن انہوں نے اپنی کہانیوں کو سیدھے بیانیہ میں پیش نہیں کیابلکہ تخلیقی تجربے سے گزرکر ان کیلئے اظہار کی ایسی زبان وضع کی ہے جس میں استعارہ اور علامت دونوں موجود ہیں۔ بلکہ اکثر انہوں نے تصوف کی اصطلاحات اور اساطیری حوالوں سے بھی کام لیاہے۔ جو انھیں جدید بناتے ہیں۔ حلقہ ارباب ذوق نے موضوع کے ساتھ ساتھ فن پارے کی ادبی حیثیت کو بھی ضروری قرار دیاتھا۔ سات اور بعد کی (دہائی) ادبی نسلوں کی تربیت زیادہ تر حلقہ ہی میں ہوئی۔ حیدرقریشی بھی فکری طورپر حلقہ ہی کے پروردہ ہیں اس لئے ان کے افسانوں میں موضوع کی وسعت کے ساتھ ساتھ فنی حوالے بھی موجود ہیں۔ اور وہ فنی جمالیات کے پوری طرح قائل ہیں"۔ [38]

اس تناظر میں حیدرقریشی ترقی پسند بھی ہیں، حلقہ سے بھی وابستہ ہیں، جدیدت کے حامی بھی اور جدیدت کے بعد بھی کہاجاسکتاہے۔ یہ کچھ بھی ہوں یا کسی سے بھی وابستگی ہویا نہ ہو مگر ایک اچھا اور سچا فنکار ضرور ہے۔ اور فنکار کسی حدود میں قید نہیں رہتا وہ تو لامحدود ہوتاہے۔ چنانچہ وہ معاشرے سے بھی وابستہ ہے۔ فرد سے بھی، سائنس اور تکنالوجی سے بھی، فنی جمالیات سے بھی غرض ادب کیلئے جن چیزوں کی ضرورت ہوتی ہے وہ سب کی سب حیدرقریشی میں موجود ہیں۔ اور انھیں کو کام میں لاتے ہوئے افسانے بھی خلق کئے ہیں۔ ان

---

[38] عکاس : اکتوبر 2005، ص ۲۹



میں بیانیہ بھی ہے۔ تجریدی بھی، استعارہ بھی ہے اور علامتیں بھی۔ اور جمالیاتی کیفیات بھی اسطرح حیدرقریشی ایک منجھاہوا فنکار اور افسانہ نگار کی حیثیت سے ہمارے سامنے آتے ہیں۔

چنانچہ آخر میں رشید امجد نے حیدرقریشی کے دونوں افسانوی مجموعوں پر مجموعی رائے دیتے ہوئے فرماتے ہیں:

"حیدرقریشی کے دونوں افسانوی مجموعے ان کے فنکارانہ سفر کے دومرحلے ہیں۔ ان میں ایک فنی اور فکری ارتقاء ہے جو اگلی منزل کی نشاندہی کررہاہے۔ اس کے ساتھ ساتھ اردو افسانے کے مجموعی سفر میں بھی یہ دونوں مجموعے اپنی اہمیت اور پہچان رکھتے ہیں"[39]

حیدرقریشی کی کہانیوں کا جائزہ لیتے ہوئے دیوندر اشر نے کچھ اسطرح کا خیال پیش کیاہے۔

"حیدرقریشی کی کہانیوں کی دنیا ایسے کرداروں سے آباد ہے، سچائی کا المیہ جن کی قسمت بن چکاہے۔ ایسی کہانیوں میں اس نوع کا سچ نہیں جسے اکثر ہم مجسم سچ، کائناتی سچ، سماجی سچ یا نام نہاد بھوگا ہوا سچ کہتے ہیں۔ کیونکہ ایسی کہانیوں میں دل کا بے انت پاتال ہے روح کا سارا آکاش ہے۔ جسم کی حدود کو توڑتاہوا تفکر اور قوت متخیلہ ہے"۔ [40]

ان تمام کے بعد آیئے حیدرقریشی نے اپنے عہد کے اردو افسانے پر کیا خیال ظاہر کرتے ہیں دیکھیں ایک انٹرویو میں جدید افسانے پر آپ نے یہ ارشاد فرمایاہے:

---

[39] عکاس : ص ۲۹
[40] عکاس : ۳٦

جدید افسانے کے حوالے سے اردو میں بہت ترقی ہوئی۔ جدید افسانہ، حقیقتاً اردو کاافسانہ ، مغرب سے بھی نسبتاً بہتر لکھاجارہاہے"۔

حیدرقریشی کی افسانہ نگاری کامجموعی جائزہ لیا جائے تو یہی نتیجہ اخذ کیاجاسکتاہے کہ وہ اردو افسانہ کی پوری تاریخ پر گہری نظر رکھتے ہیں۔ ادبی صورتحال سے نہ صرف واقفیت بلکہ اس پر دسترس بھی رکھتے ہیں۔ ادب میں ہونے والی تبدیلیوں کو صرف سنا اور پڑھا ہی نہیں بلکہ عملی طورپر اس سے وابستہ رہے ہیں۔ پاکستان میں حلقہ احباب ذوق کی محفلوں میں حاضر رہنے۔ انور سدید، وزیر آغا، انتظار حسین، احمد ندین قاسمی، رشید امجد وغیرہ جیسی ادبی شخصیتوں کے ساتھ زندگی گذاری اور اب انٹرنیٹ کے حوالے سے وہ ساری دنیا کے ادیبوں سے نہ صرف ان کا رابطہ ہے بلکہ ان کے فن سے اور ادب سے واقف ہیں، بہرحال حیدرقریشی ایک جہاندیدہ ادیب و فنکار ہے اور بنیادی طورپر قلمکار بھی، محقق بھی اس لحاظ سے ان کے افسانوں میں بھی دنیا وجہاں کا ادب، فکری سطح پر ہوکے جذباتی سطح پر سائنسی اور جمالیاتی سطح پر ان کی دسترس میں ہے اور اسی کا استعمال کرتے ہوئے افسانے خلق کئے۔ اس طرح وہ ایک بہترین افسانہ نگار اور کامیاب فنکار کی حیثیت سے ہمارے سامنے آتے ہیں ان کے چند ایک افسانوں کا تجزیہ پیش کرنا مناسب لگتاہے۔

*****



میں انتظار کرتاہوں

اس افسانے میں "میں" کا جو استعمال ہوا وہ دراصل خلیفہ الارض یعنی اشرف المخلوقات کے لئے استعمال ہوا۔ تاریخ شاہد ہے اور کلام رحمانی اس کی گواہی دے رہا ہے یا حشر ۃ علی العباد.......... کے خدا نے جب کبھی اپنے ہادی و رسل بھیجتارہالوگوں نے ان کا مذاق اڑایا، ان سے ٹھٹھاکیا اور انھیں الزامات و تہمات سے نوازتارہا، کیوں کہ ان کی روشن خیالی زمانے والوں کو پسند نہیں آتی اور ان خدائی فرستادوں کو اور ان کے ماننے والوں کو اذیتیں دی گئیں۔ انھیں دھتکاراگیا، ذلیل و رسوا کیاگیا۔ اس کے باوجود ان خدائی فرستادوں اور ان کے ماننے والوں نے صبر کا دامن ہاتھ سے جانے نہیں دیا۔ اور وہ اپنے مخالفین کے حق میں دعاہی کرتے رہے کہ اے خدا یہ جانتے نہیں ہیں تو ہی انھیں عطا فرما اور حق کی توفیق دے۔ یہ ایک دفع نہیں ہوا۔ جتنے خدائی فرستادے آئے ان تمام کے ساتھ ہوا۔ اس افسانہ میں افسانہ نگار نے گویا تاریخ عالم کو سمودیا۔ اسطرح تجریدی افسانہ کی بہترین مثال ہے۔ اس زمانہ میں تجریدی رنگ رکھتے ہوئے تسلسل کو برقرار رکھاہے۔ افسانہ نگار کی فنکاری بے مثال ہے۔ اور تخلیقیت کی داد دینی پڑتی ہے کہ ایک مختصر افسانے میں سات قرنوں کی تاریخ کو پنہاں کردیا۔ اور تمام مذاہب کے ماننے والوں کو سوتیلے رشتہ میں باندھا۔ کیوں کہ سب خدا کے بندے ہیں اور ہر نبی کو ماننے والے اپنے اپنے قبیلوں سے تعلق رکھتے ہیں جن میں تھوڑے بہت فرق تو موجود ہیں۔ یہاں رامچندرجی، لکشمن، (رامائن) اور مہابھارت سے لے کر حضرت ابراہیمؑ، اسحٰقؑ، اسمٰعیلؑ، موسیٰؑ، عیسیٰؑ، تک اور آخرمیں وجہ تخلیق کائنات حضرت محمد رسول اللہ صلعم تک کی تاریخ کا ذکر انتہائی اختصار اور جامع انداز میں کیاہے۔ اور افسانہ نگار پرامید ھیکے بہرحال آخروقت میں غلبہ اسلام ہی کا ہوگا اور وہاں وہی کیفیت ہوگی جب فتح مکہ

کے وقت خاتم الانبیاء حضرت محمد صلعم نے جس طرح عام معانی کا اعلان فرمایا تھا کہ لاتشریب علیکم الیوم۔ بقول حسرتؔ :

فطرت میں سلسلہ ہے کمال وزوال کا
گھٹنا ہے بدرکا تو ہے بڑھنا ہلال کا

اس طرح افسانے دریا کو کوزہ میں بند کرنے کی عمدہ مثال ہے۔

اتناہی نہیں اس افسانے میں سوتیلے جذبوں کی جوبات کی گئی ہے اس تناظر میں دیکھاجائے تو ساری دنیا اور خاص طورسے اہل کتاب وہ تمام سوتیلے جذبوں کے تحت ہی آتے ہیں۔ اسطرح سے عراق، افغانستان وغیرہ پر جو امریکی حملے ہورہے ہیں وہ بھی اس روشنی میں دیکھے جاسکتے ہیں۔ گوکے آج زمانے نے بہت ترقی کرلی ہے۔ سائنس اور ٹیکنالوجی کی ترقیات نے انسان کو موت کے دہانے پر کھڑا کردیاہے۔ اور جنگ بھی امن کی خاطر کا نعرہ لگایاجاتاہے۔ امریکہ نے اپنی چودھراہٹ کو برقرار رکھنے کیلئے اور اپنی بنائی ہوئی ٹیکنالوجی مصنوعات کو جیسے تیسے استعمال کرنے کیلئے مختلف بہانے تلاش کرکے وہ کسی اور پر نہیں اپنے ہی سوتیلے بھائیوں کو زیر کرنے اور ان پر رعب جمانے کیلئے استعمال کیا۔ اس کے ساتھ ساتھ اپنے دوسرے بھائیوں اور وہ بھی سوتیلے جذبوں کے تحت اکٹھا کرلیا اور اسطرح مسلم ممالک پر قبضہ یارعب جمانے میں کامیاب رہا۔

تھوڑا سا اور پیچھے چلے جائیں اور تاریخ کے صفحات کو الٹ پھیر کردیکھیں تو ہندوستان میں سب سے پرانی تاریخ اس کو کہیں تو بے جانہ ہوگا۔ جسے مہابھارت کی جنگ کہاجاتاہے وہ بھی انہی سوتیلے جذبوں کے تحت ہی لڑی گئی۔ وہاں بھی سوتیلا پن ہی کارفرمارہا اور اسطرح سے ایک بڑی جنگ لڑی گئی۔ جس میں سری کرشن جی نے، ارجن کو جوپاٹھ پڑھایا یا



سکھایا وہ ہی تو بعد کو بھگوت گیتا کی شکل میں منظر عام پر آئی۔ جس میں انسانی قدروں اور تہذیب کو پیش کیاگیا۔ پھر کیا ہوا وہی بعد میں وقت کے گذرنے کے ساتھ انسانوں نے اس کو بھلادیا اور ان تعلیمات کو نہ صرف پس پشت ڈال دیابلکہ اس میں تصرف کرنے لگے۔ آج بھی وہی ہورہاہے۔ ورنہ تعلیمات اپنی جگہ بہت درست ہیں۔ جب ان میں انسانی تصرفات ہوتے ہیں تو وہیں سے خرابیاں پیدا ہوجاتی ہیں جو امن کو برباد کردینے والی بن جاتی ہیں۔ ان میں انسانی انا بہت حدتک کام کرجاتی ہے۔ جس سے حق و باطل میں تمیز کرنے کی صلاحیت ختم ہوجاتی ہے بالآخر حق کو دنیا باطل اور باطل کو حق کا جامہ پہناتے اترانے لگتی ہے۔ اس کے باوجود وہ عالمی امن، وہ انسانی اقدار، وہ تہذیب کا بے مثال نمونہ اگرکہیں ملتاہے تو بس وہیں ملتاہے جنھیں خلاصہ کائنات کہاگیا اور جن کے نمونے کو تمام عالم انسانیت کے لئے بطور نمونہ پیش کیاگیا۔ اس ہستی کے یہاں ہی ملے گا۔ کیونکہ آپ صلعم نے ان تمام سوتیلے جذبوں کے باوجود، جنھیں دنیا صفحہ ہستی سے مٹانے کے درپہ تھی انھیں بھی جو خون کے پیاسے تھے، انھیں بھی جنہوں نے آپ کے ماننے والوں کی عصمتیں لوٹیں، جنکی اولادوں کو املاک کو مٹادیا، اور وطن سے بے وطن کردیا اس کے باوجود لاتشریب علیکم الیوم کہہ کر معاف کردیا اور آج بھی اگر یہ ساری چیز میں اور ہیں تو افسوس ہوتاہے کہ بھلا ان کے ماننے والے کیسے ان کے مخالفین کے طرز کو اپنائے ہوئے ہیں-------؟

* * * * *

گلاب شہزادے کی کہانی

افسانے کو پڑھتے ہوئے قاری کا ذہن داستان باغ و بہار کی طرف چلاجاتاہے۔ علم کی ایک کیفیت یہ بھی ہوتی ہے کہ وہ ایک واقعہ سے کسی دوسرے واقعہ یا دوسرے علوم کی طرف ذہن کو موڑدے اور علم کی وسعتوں سے ہمکنار کردے۔ بلاشبہ اس افسانے سے ذہن مختلف جگہوں کی یا علوم کی سیر کرواتاہے۔ جہاں یہ ماضیٰ کی یاد دلاتاہے وہیں اپنے حال کی اطلاع دیتاہے۔ اور مستقبل سے روشناس بھی کرواتاہے۔ افسانہ نگار نے بری چابکدستی سے اپنے دور کے معاشرتی مسائل کو بڑے اچھے اور عمدہ پیرایہ میں بیان کردیاہے۔ عموماً ۷۰ کی دہائی کے افسانہ پر یہ الزام لگایا جاتاہے کہ اس میں کہانی پن نہیں ہے یا اس دور کے افسانوں سے کہانی پن غائب ہوگیاہے۔ مگر یہاں اس دور میں جو بھی ہوا وہ دانستہ اور تجربوں کی خاطر کیاگیا یا ہوا۔ مگر بعض افسانہ نگاروں نے اپنی روش نہیں بدلی۔ کہانی پن کو ہاتھ سے جانے نہیں دیا۔ ان میں حیدرقریشی بھی ایک ہیں۔ گوکہ انہوں نے بھی تجریدی افسانے لکھے مگر اس میں تسلسل کو برقرار رکھا، کہانی پن کو برقرار رکھا۔ عصری مسائل کو اتنے بہترین انداز میں پیش کیا کہ حیرت ہوتی ہے۔ بلاشبہ یہ افسانے حیدرقریشی کے بہترین افسانوں میں سے ایک ہے بلکہ انہوں نے جو فضابنائی ہے وہ قابل تعریف ہے۔ اس افسانہ کو آپ باغ و بہار کی توسیع بھی قرار دے سکتے ہیں۔ منشی پریم چند کے گئودان کے کردار کو توسیع کرتے ہوئے سریندر پرکاش نے بجوکا لکھا، تو حیدرقریشی اس قصہ میں تو سیع کرتے ہوئے اپنے عصر کو پیش کیا، اس کے مسائل کی طرف اشارہ کیا اور ہونے والے واقعات کو بتادیا۔

رات بتانے کے لئے ضروری تھا کہ کوئی تو مشغلہ ہو۔ چنانچہ ان چاروں درویشوں نے کہانی سنانے کی تجویز پیش کی کے ہر شخص اپنی اپنی کوئی کہانی سنائے اسطرح رات بھی گٹ جائے گی اور واقفیت بھی حاصل ہوتی۔ اس سے اندازہ یہ ہوتا



ہے کہ کہانی سننے اور سنانے کا وقت رات ہی کا ہوتاہے کہ ماضی میں داستان گوہمیشہ رات کو ہی داستایں سنایا کرتے تھے۔ یہ رات گذاری کا مشغلہ ہونے کے ساتھ ساتھ تھکن دور کرنے کا ذریعہ بھی تھا۔ چنانچہ پہلے درویش نے اپنی کہانی شروع کی اور کہا کہ میری کہانی گلاب شہزادے کی کہانی ہے۔ گلاب کا رنگ جو گلابی ہونے کے ساتھ ساتھ سرخ رنگ کی چغلی کھارہاہوتاہے۔ کے خون کارنگ سرخ ہوتاہے اگر اس میں پانی ملایا جائے تو وہ گلابی بن جاتاہے۔ بڑی معنی خیز بات کہہ دی کے اگر خون میں پانی آجائے تو وہ محاورۃ بے مروتی کی دلیل بن جاتی ہے۔ یہ کہتے ہوئے پہلے درویش نے اپنے تھیلے سے گلاب کی ایک قلم نکالی اور اسے ریت میں گاڑدیا۔ اور یہ کہنے لگا کہ میری کہانی کا باقی حصہ اس قلم کے بڑھنے تک ادھورا رہے گا۔ اس لئے بہتر ہے کہ آپ لوگ باری باری اپنی کہانیاں سنائیں۔ میں آخری میں اپنی کہانی مکمل کروں گا۔

یہاں افسانہ نگار نے فلیش بیک کی تکنیک کا استعمال کیاہے۔ اول کو آخرکردیا اور آخر کو اول۔

اب دوسرا درویش اپنی کہانی کا آغاز کرتاہے۔

"میری کہانی عام سی ہے۔ میری بیوی نے اپنی آنکھوں کے جادو اور ہونٹوں کے منتر سے مجھے گدھا بنادیاتھا اور میں کئی صدیوں سے بوجھ اٹھاتا چلاآرہاتھا۔ پھر ایک دن مجھے ایک اسم مل گیا۔ میں گدھے سے انسان بن گیا اور تب سے میں نے اپنے اسم کے زور سے اپنی بیوی کو گھوڑی میں تبدیل کردیا"۔ [41]

تیسرا اور چوتھا درویش اس کی کہانی کو دلچسپی سے سن رہے تھے جبکہ پہلا درویش گلاب کی اس قلم کو دیکھ رہا تھا جس کے ارد گرد چھوٹے چھوٹے کانٹے سے چپکے ہوئے تھے۔ قلم آہستہ آہستہ بڑھ رہی تھی۔

"اب مجھے صحیح طورپر یاد نہیں رہا کہ پھر میں نے اسے تانگے میں جوت دیا تھا، گھوڑ

---

[41] عمر لاحاصل کا حاصل، ص ٦٠ اور ٦١

دوڑ کے کلب میں لے گیا تھا یا ویسے ہی اسے
سرپٹ دوڑا تارہا۔ پھر پتہ نہیں وہ خود ہی سرپٹ
دوڑتی رہی، دوڑتی رہی۔

اس دوسرے درویش کی کہانی میں دور حاضر کا ایک بہت بڑا مسند درآیاہے وہ دراصل یہ کہ مرد اپنی بیوی کا خیال رکھتا تو ہے مگر جب اس خواہشات کا سمندوسیع ہوجاتاہے تو مرد بے بس ہوجاتاہے یا تو وہ خودکشی کرلیتاہے یا پھر غلط کاموں میں پڑجاتاہے۔ اور خاص طور سے وہاں جہاں مرد ایک متوسط طبقے سے تعلق رکھتاہو اور بیوی اس سے کسی قدر آمیر طبقہ سے ہو یا پھر بلاوجہ اپنے حسن پر اترانے والی ہو۔ جب مرد پریشان ہوتو وہ چاہتاہے کہ بیوی بھی اس کی مدد کرے چنانچہ جب اس کو مالزمت یا اس طرح کی کسی مصروفیت میں لگادیتاہے گوان کے گھریلو اخراجات کسی حدتک سدھرنے لگتے ہیں اور ان کی بجاوبے جاخواہشات کی تکمیل بھی ہوتی نظر آتی ہے۔ مگر افسانہ نگار نے ایک جملے سے اس (مرد) کی انا پروار کردیاکہ

"میری اور اس کی تنخواہ سے ہمارا گھر خاصا
خوشحال ہوگیا۔ البتہ وہ اپنے باس کی بہت تعریفیں
کرتی رہیں تھیں۔ وہ اس کا ضرورت سے زیادہ
ہی خیال رکھتے تھے"۔[42]

البتہ کہہ کر افسانہ نگار نے زمانی روش پر طنز کردیا کہ عموماً وہ خواتین جو پرسنل سکریٹری کے طوپر کام کرتی ہیں اور اگر ان کی آنکھوں میں جادو اور ہونٹ کے منتر بھی ہوں تو پھر کیا کہتے۔ بے چارہ مرد سب کچھ برداشت کرلیتا اور طنز یہ مسکراہٹ لئے جیتا تو ہے مگر اس کا ضمیر اسے کچھ کے لگارہاہوتاہے۔ جب اپنی داستان سنانے پر وہ آئے تو بس گلے میں کانٹے چبھنے لگتے ہیں اور وہ مردہ ہوجاتاہے۔ اور --------

تیسرے درویش نے اپنی کہانی سنانی شروع کردی اس میں دراصل دورحاضر کا وہ مسئلہ سامنے آیا جہاں خاندانی منصوبہ

---

42 عمر لاحاصل کا حاصل، ص ٦١

بندی پر ساری دنیا میں بڑیا تیزی سے عمل کیا جائے گا۔ یہ دراصل قدرتی اصول کے خلاف سورۃ بنی اسرائیل میں/ سورۃ کہف میں ذکر آیا کہ تم رزق کی تنگی کی وجہ سے اپنی اولادوں کو قتل مت کرو۔ کیونکہ رزق دینے والا وہ ہے۔

چنانچہ افسانہ نگار نے اس کو بڑے اچھوتے رنگ میں پیش کردیا کہ تیسرے درویش نے بھی اپنی بیوی کی بات مان کر غباروں کا استعمال شروع کردیا ور انھیں کونے میں پڑی میز کے پیچھے پھینک دیتاتھا۔ ایک دفعہ کسی کھنڈر سے کئی ہزار سالہ پرانی کھوپڑی دریافت ہوئی تو اس کے مطالعہ کیلئے مجھے بلایاگیا۔ (ابتداء میں اس نے بتایا کہ میرا تعلق آثار قدیمہ سے ہے اور مجھے تاریخ اور جغرافیہ سے خاصی دلچسپی ہے) کھوپڑی کے مطالعہ کے بعد جب میں گھرآیا تو اپنی میز کے نیچے کباڑمیں سے کوئی چیز ڈھونڈتے ہوئے مجھے ایک سو کھاہوا مڑاتڑاسا غبارہ مل گیا۔ میں نے اسے دیکھا تو دیکھتا ہی رہ گیا۔ یوں لگ رہاتھا جسے وہ کھوپڑی اس غبارے میں موجودہ ہو اور وہ میرے اپنے بیٹے کی ہو۔

> "میں خوف سے کانپ اٹھا۔ مجھے لگا میں نے اپنے بیٹے کو قتل کرکے اس کے سر کو محض کھوپڑی بنادیاہے۔ میں نے اپنی بیوی کو اپنا خوف بتایا۔ پہلے تو اس نے شور مچادیا۔ خاندانی منصوبہ بندی ختم نہیں کرنے دوں گی۔ مری صحت پھر تباہ ہوجائے گی۔ لیکن بالآخر میرا خوف اس کے ضد پر غالب آگیا"۔

جس دن اس نے مجھے خوشخبری سنائی۔ مجھے یوں لگا جیسے ہزاروں برس پہلے کھوجانے والی میری کوئی قیمتی چیز مجھے دوبارہ ملنے والی ہے۔

اچانک اس کی نظر گلاب کی اس قلم پر پڑی جو اب پودے میں ڈھل گئی تھی۔ اسے یوں لگا جیسے گلاب کا پودا اس کے اندر ہے اور کوئی اس کے حلق سے باہر کھینچ رہاہے--- وہ خوف سے چلایا۔ "پانی"--- پہلے درویش نے کوزہ اس کے منہ



سے لگایا اور گلاب کے پودے کو بڑھتے دیکھ تیسرے درویش نے دم توڑ دیا۔

چوتھے درویشن نے مشکوک نظروں سے پہلے درویش کو دیکھا اور قدرے چوکنا ہوکر اپنی کہانی بیان کرنے لگا۔ یہ سراسیمگی کے عالم میں ہے اور ڈرتے ڈرتے کہا کہ یہ کہانی دراصل میری نہیں میرے ایک دوست کی ہے اور میں اسے اسی کی زبان میں بیان کروں گا۔ کہہ کر سنانے لگتاہے۔

میرابھائی گہری نیند میں سویاہواتھا۔ میں اس کے کمرے میں بیٹھا کوئی کام کرہاتھا۔ اچانک میں نے دیکھا کہ میرے بھائی کی ناک سے شہد کی ایک مکھی نکلی۔ قریب ہی پانی کا ایک ٹب پڑا تھا۔ جس میں لکڑی کا ایک ٹکڑا تیررہاتھا۔ جو شاید کسی بچے نے اس میں ڈال دیا تھا۔ شہید کی مکھی اڑکر اس ٹکڑے پر جابیٹھی۔ کچھ دیر بعد پھر اڑی اور مرے بھائی کی ناک میں داخل ہوگئی۔ میں یہ منظر بڑی حیرت سے دیکھ رہاتھا-------

پھر میرا بھائی بیدار ہوا۔ اس نے اپنا ایک حیرت انگیز خواب سنایا۔ کہ وہ کسی دریا کے کنارے کھڑا تھا کہ لکڑی کا ایک بڑا سا تختہ تیرتاہوا اس کے سامنے آیا۔ وہ اس پر سوارہوگیا۔ جب وہ تختہ اسے دوسرے کنارے پر لے گیا تو اس نے دیکھا کہ وہ جگہ خزانوں سے بھری پڑی ہے۔ مگر وہ اکیلا یہ خزانے نہ اٹھاسکتاتھا اس لئے دوسرے ساتھیوں کو لینے کیلئے واپس آگیا۔

حیرت ہے، حیرت ہے، پہلا درویش بڑے مکارانہ انداز میں بولا۔ اس کی نظریں اب بھی گلاب کے اس پودے پر گڑی تھیں۔ جو اب بڑی شان سے لہلہارہاتھا۔ چوتھا درویش گھبرائے ہوئے لہجے میں بولا۔

> "میں بھائی کا خواب سمجھ گیا۔ میں نے اسے قتل کردیا اور وہ جگہ جہاں ٹب پڑا تھا ور شہد کی مکھی لکڑی پر تیرتی رہی تھی اسے کھود ڈالا۔
> وہاں واقعی خزانے تھے---- مگر ---- مگر-----[43]

اس افسانے کے اس درویش کی کہانی میں بھی مکاری، دغابازی اور دولت کی ہوس میں سگے بھائی کا قتل بتایا گیاہے۔

---

43 عمرلاحاصل کا حاصل ص ٦٢

وہ بھی اب رات کی اس تنہائی اور صحرا کی خموشی میں جب اس نے اس گلاب کے پودے کو دیکھا اور پہلے درویش کی سفاکانہ ہنسی کو دیکھا تو حلق میں کانٹے پڑگئے اور شدت سے پیاس محسوس کرنے لگا اور چلایا۔ پانی--- پہلے درویش نےپانی کا کوزہ اس کے منہ سے لگایا۔ اس نے پانی پی لیا اور پھر اس گلاب پودے کو دیکھا اس میں سے ایک سرخ پتے کو ابھرتے دیکھا ور خوف سے جھرجھری لی، --- پھر کیاہوا، پہلے درویش نے جھنجھوڑ تے ہوئے پوچھا۔ تو اس نے کہا یہ کہانی میرے دوست کی نہیں بلکہ میری اپنی ہے۔ اور پھر اس نے دم توڑ دیا۔

اب رات کا آخری پہر گذرچکاتھا۔

پہلے درویش نے اس صحرا میں قہقہے لگانے شروع کردئے۔ اب اس صحراتی علاقے کی تیل کی دولت کا میں تنہا مالک ہوں ایٹھی جنگ میں جتنے لوگ بھی بچ گئے ہوں گے سب میری رعایا ہیں۔ اور میں اس نئے عہد کا حکمران ----- عظیم حکمران ------- ہاہاہا-----

دوپہر تک اس صحرا میں دوڑتارہا۔ اسے شدت سے پیاس کا احساس ہوا۔ اس نے کوزے کو دیکھا کوزہ خالی ہوچکاتھا۔ اور وہ گھبرایاہوا، دوڑنے لگا۔ مگر کہیں پانی نہیں تھا۔ اس کے سامنے تیل کے چشمے تھے۔ مگر پانی -------؟ وہ نیل کے چشمے پر ہی پیاس بجھاے کے لئے جھک گیا۔ اس کی مردہ آنکھیں بھی پانی کے چشمے کو تیل کا چشمہ سمجھ رہی نہیں۔[44]

گلاب کے پودے پر ایک بڑا ساپھول اگ آیا تھا۔ گلاب کے اس پول کا رنگ غیر معمولی حدتک گہرا سیاہ تھا۔ گلاب شہزادے کی کہانی مکمل ہوچکی تھی۔ مگر نہ کوئی اسے سنانے والا تھا نہ سننے والا۔

---

44 عمر لاحاصل کا حاصل ص ٦٢

اس افسانے میں جیسا سطور بالا میں کیاگیاکہ چار کہانی کار ہیں اور چاروں نے اپنی اپنی کہانیاں سنائیں۔ مگر اس میں گلاب ایک علامت کے طورپر استعمال کیا گیاہے۔ گلاب جیسے ہمارے شعراء نے کبھی محبوب کے چہرے اور اس کی ناز کی کے طورپر استعمال کیاتھا تو کسی نے اس کی رنگت اور ملائمت کو بتایاتھا۔ مگر افساہ نگار نے اسے جمالیاتی سطح سے لے کر مکاریت بڑھتے دیکھتے ہیں تو انہیں صداقت کا اندازہ ہوتاہے اور اپنے حلق میں اس کی کانٹے دار قلم کو چبھتے پاتے ہیں۔ کہاجاتاہے کہ جب روح قبض ہوتی ہے تو انسان کو ایسے محسوس ہوتاہے۔ جیسے کانٹے دار پودوں سے اسے کھینچا جارہاہو۔ واللہ وعالم۔

دوسرے درویش، تیسرے درویش اور چوتھے درویش کی اپنی اپنی کہانیاں مگر سنانے والا یعنی زبردستی سنانے والا وہ پہلادرویش، یہ بھی اپنی دانست میں علامتی رنگ رکھتے ہیں۔ پہلا درویش دراصل مطلق العنان اور جابر حکمران ہے جو ان تینوں سے ان کا بھید حاصل کررہاہے۔ چنانچہ دوسرے درویش نے جو داستان سنائی اس میں تہذیبی سطح پر کاری ضرب ہے اور جہاں عورت سے بھی کام لیاجارہاہےبلکہ عورت سے کام لیاجائے اور انہیں مردوں کے شانہ بہ شانہ رکھاجائے تو اسے مہذب قوم سمجھاجاتاہے۔ اس طرح یہ تہذیب پر یا نئی تہذیب کو پیش کرناہے۔ خاص طورپر وہ عورت جو آنکھوں کے جادو اور ہونٹوں کے منتر سے مرد کو گدھا بناسکتی ہے۔ یہ دراصل سارفی سماج میں جہاں اپنے مال کو یا اپنی اشیاء کو بہتر بتاکر فروخت کرسکیں ایسی کمپنیوں میں وہاں کر سیز(گرلز) یا سکربڑی ہوں تو پھر منافع بھی کمایا جاسکتاہے اور اس عورت کو اپنے باس کا ہر طرح سے خیال بھی رکھناپڑتاہے۔ یہاں پس پردہ جسیت کو پیش کیاگیا مگر ایسا نہیں کہ کامران کاظمی نے اسے صرف اور صرف طوائف کے حسن سے تعبیر کیاہے اور کہا ہے کہ عورت خود بھی محض جنسی آسودگی کا ذریعہ بننے کے اپنے لئے اور کوئی کردار بسا اوقات پسند نہیں کرتی۔۔ طوائف کا معاملہ الگ ہے اور یہاں اپنے وقار، اپنے منصب اور

اپنی اناکو برقرار رکھنے یا سماج میں ایک اونچے درجے پر برقرار رہنے کیلئے وہ اگر اعلیٰ عہدے پر رہتے ہوئے اپنے باس کو خور نظر بننے سے دریخ بھی نہیں کرتیں یہ ان خواتین پر طنز ہے اور یہ ہمارے معاشرے میں ہوبھی رہاہے۔ اس آڑ میں بیجاپوری دوسری باعصمت اور پاکدامن عورتوں پر حرف بھی آتاہے۔

اس طرح تیسرے درویش نے جو داستان سنائی اس میں بھی اسلامی تہذیب پر وار ہے اور یہ مغربی دین ہے کہ خاندانی منصوبہ بندی کیلئے بہت ساری ترکیبیں نکالی گئیں اور یہ کہہ کر کہ اولادیں زیادہ ہوں تو ان کی کفالت مشکل ہوجاتی ہے اور انھیں دنیوی نعمتیں نہیں مل سکتیں۔ کبھی ہم دو ہمارے دو اور کبھی ہم دو ہمارا ایک کا نعرہ دیاگیا۔ انھیں خطوط پر چلتے ہوئے ہر کوئی جنسی تلذذ میں گرفتار ہونے لگاہے۔ یہ بھی مغرب ہی کی دین۔ اور مشرق اس کا شکار، مشرق جسے اپنے اسلاف کے کارناموں پر اور اپنے ماضی پر ناز۔ مگر اس کھوپڑی میں جب وہ اپنے بیٹے کی کھوپڑی کو محسوس کرتاہے تو اسے احساس ہوتاہے کہ اسے ایسا نہیں کرنا چاہئے تھا۔ لہٰذا جب اس کی بیوی اسے خوشخبری سناتی ہے تو اسے اپنے مرد ہونے کا بھی احساس ہوتاہے اور خود میں یہ محسوس کرتاہے کہ وہ اولاد کا قاتل نہیں ہے تب اسے اپنے ماضی کا احساس ہوتاہے کہ میں نے کس قدر غلط کام کیا وہ اس گلاب قلم کو پودہ بنتے دیکھتاہے تو ایک عجیب خوف سے جھرجھری لیتااور ختم ہوجاتاہے۔

چوتھا درویش جو اپنے بھائی کو صرف دولت کی ہوس میں ماردیتاہے۔ اس کہانی کو بھی کہانی کار نے استعاراتی یا علامتی رنگ میں ظاہر کیا۔ اور پہلا درویش دراصل ان تینوں کے مرنے کا انتظار کررہاتھا وہ خود بھی اس صحراء میں اکیلا اور تنہا رہتاہے مگر یہ کہہ کر کہ

"اب اس صحرائی علاقے کی تیل کی
دولت کا میں تنہا مالک ہوں۔ ایٹمی جنگ
میں جتنے لوگ بھی بچ گئے ہوں گے
سب مری رعایاہیں---- اور میں اس نئے



عہد کا حکمران--- عظیم حکمران---
ہاہاہا---"

بتادیاکہ اشارہ کس طرف ہے اور کس کے ہاں ایٹمی ہتھیار ہیں اور کون ساری دنیا کا حکمران بننا چاہتاہے۔ اس لفظ سے یہ بھی اندازہ ہوا کہ مشرقی تہذیب پر کس طرح ان مغرب والوں نے حملہ کردیا۔ پہلے خواتین کو بے پردہ اور پھر انہیں مردوں کے شانہ بہ شانہ کھڑا کرنے کی سازش، خاندانی منصوبہ بندی اور غباروں کے استعمال کی طرف ان کے رجحان کو موڑ دینا، پھر اپنوں میں پھوٹ ڈال کر ایک دوسرے کا قتل کروانا اور تیل کے ذخیروں پر قبضہ جمانا یہ امریکہ کی چال ہے جسے افسانہ نگارنے بڑی چابکدستی سے اس ایک افسانے میں واضح کردیا۔

میری دانست میں حیدرقریشی اگر وہ تمامافسانے نہ بھی لکھتے اور صرف یہ ایک ہی افسانے تحریر کرتے تو بھی ادب اور افسانوی ادب میں اپنا نام درج کرانے میں کامیاب ہوتے۔ یہ ان کا شاہکار افسانہ ہے اور آج کے افسانہ نگاروں کے درمیان حیدرقریشی کا نام بھی درج ہے۔ گوکے یہ افسانہ لکھے تیس سال سے زائد ہوگیا۔ مگر اس اسلوب اپنے قاری کو باندھے رکھنے میں کامیاب ہے۔

*****

حیدرقریشی بحیثیت خاکہ نگار

اردو میں خاکہ نگاری ایک صنف کا درجہ رکھتی ہے۔ مرزا فرحت اللہ بیگ نے "نذیر احمد کی کہانی کچھ انکی کچھ میری زبانی" جیسا عمدہ خاکہ لکھ کر ادب میں اولیت کا سہرا اپنے سر باندھوالیا۔ محمد حسین آزاد کی آب حیات میں لکھی تاریخ یا تنقید کو بھی خاکوں کے زمرے میں لایا جاتاہے۔ مگر وہ ہمارے ناقدین کی نظر میں تنقید (تذکرہ) اور محقق اردو پروفیسر گیان چند جین کے بقول ایک عمدہ ادبی تاریخ ہے۔ تحریرفرماتے ہیں:

> ہماری پہلی تاریخ ادب آب حیات (طبع ۱۸۸۱ء) ہے۔ زبان پہ بارخدایایہ کس کان ما آیا۔ آب حیات ہماری صنف غزل کی طرح ہے۔ اس میں لاکھ کیڑے نکالئے لیکن اس سے مفر ممکن نہیں۔ شبلیؔ نے آزاد کے لئے کہا تھا کہ اگر وہ گپیں بھی ہانک دیتاہے تو لوگ اسے وحی مان لیتے ہیں۔ آب حیات کے مصنف نے دل کشی اور دلچسپی پر اپنی توجہ مرکوزرکھی۔ وہ حکایت کو لذیذ بنانے کیلئے دراز تر کردیتاہے۔ گواس میں اپنے تخیل رسا سے عبارت آرائی بلکہ حاشیہ آرائی ہی کیوں نہ کرنی پڑے۔ ذاد نے اردو ادب کے زرین دور کے زعمائے ادب کے آنکھیں دیکھی تھی۔ اس نے ان آنکھوں دیکھی اور کانوں سنی کو سپردقلم کرکے بڑی خدمت کی ہے۔ آج ہمارے سامنے اٹھاروویں اور انیسویں صدی کے ہراہم شاعر کا جو تصور ہے وہ آب حیات ہی کا عطا کردہ ہے۔ تاریخ اعتبار سے آب حیات ہر جگہ درست نہ سہی لیکن ہماری ہر تاریخ ادب پر بھاری ہے۔ اس میں جو چھکتی

بولتی زندگی جو روح جہذہ ہے وہ دوسری
تاریخوں میں کہاں۔ یہ تاریخ بھی ہے تخلیق
بھی ۔ اس نے آب حیات پیاہے، پلایا ہے۔ [45]

اس کے بعد خاکہ نگاری کی ایک لمبی فہرست ملتی ہے۔ یہ دارصل انگریزی زان میں Sketch سے اردو میں درآئی ہے۔ جس میں کسی بھی شخص کو موضوع بناکر اس کی جملہ صفات کو اچھے اور برے سبھی ادبی انداز میں تحریر کئے جاتے ہیں۔ جس سے پڑھنے والے پر اس شخصیت کا مکمل پرتو عیاں ہوجاتاہے۔ قاری اس شخص کو اپنے خاکہ نگار کی مدد سے نہ صرف دیکھ لیتاہے بلکہ جان لیتاہے۔ ہاں خاکہ نگار کا اپنا انداز بیان اس شخصیت کو ستاروں سے آگے بھی لے جاسکتاہے۔ اور کبھی کبھی خاک میں ملادینے والا بھی ہوجاتاہے۔ چہ جائیکے ایسی مثالیں بہت کم ملتی ہیں۔ ہاں مزاح نگاروں نے جن کے خاکے لکھے البتہ وہاں ہمیں تھوڑی بہت پرلطف اور انبساط والی کیفیت مل جاتی ہے۔ بعض نے واقعی ادبی لحاظ سے خاکے لکھے ہیں۔ جن سے ان کی ادبیت اور معاشرتی خصائص کا خاص جاننے میں بہت مدد ملتی ہے۔ یہ حقائق کے قریب بلکہ حقائق ہی ہوتے ہیں مگر تخیئل کے پردے میں نہاں ہوکر تخلیقی بن جاتے ہیں۔ بابائے اردو مولوی عبدالحق نے چند ہم عصر کے عنوان سے جو خاکے لکھے ان میں اپنے پیش رو اور ہمعصر سبھی شامل ہیں۔ خاکہ کے لئے یہ بھی ضروری نہیں کہ وہ شخصیت نامور ہی ہو۔ ایک عام انسان/آدمی کا خاکے بھی لکھا جاسکتاہے۔ مثال کے طورپر مولوعبدالحق نے ایک مالی پر خاکہ لکھا اور پروفیسر رشید احمد صدیقی نے ایک چپراسی پر۔ مگر دونوں نے عام شخص کو خاص بنادیا۔ ہرپڑھنے والا ان شخصیات سے ہمدردی کا اظہار کرتاہے۔ اور ان کی سیرت سے سیکھتاہے۔ کہ ہر شخص کو اپنے کام میں لگن، محنت اور جستجو ہوتو اس کی توقیر ہوتی ہے۔ اور وہ بھی یادرکھنے کے قابل ہوتاہے۔ عموماً بہت سارے ادباء نے مشہور و معروف شخصیتوں یاادبی فنکاروں کو اپنے خاکوں کا موضوع بنایاہے۔

---

[45] ادبی اور لسانی تحقیق اصول اور طریق کار، مرتبہ پروفیسر عبدالستار دلوی صفحہ ۲۰۹

جن میں منٹو، رشیداحمد صدیقی، مجتبیٰ حسین، شاہد احمد دہلوی، وغیرہ کے نام آتے ہیں۔

حیدرقریشی نے بھی خاکہ نگاری کے میدان میں قدم رکھا۔ اور جملہ 25 خاکے تحریرکئے۔ ان خاکوں کو خود انھوں نے دوحصوں میں تقسیم کردیا۔ یہ خاکے میری محبتیں کے عنوان سے عمرلاحاصل کا حاصل میں درج ہیں۔ دوحصہ اسطرح ہیں۔

۱) اول خویش
۲) بعد درویش

اول خویش کے تحت (۱۰) دس خاکے ہیں جو اپنے خاندان سے متعلق ہیں۔ جن میں (۱) اباجی (برگدکاپیڑ)، (۲) امی جی (مائے نی میں کنوں آکھاں)، (۳) داداجی (ڈاچی والیا موڑ مہاروے)، (٤) نانی جی (مظلوم متشدد)، (٥) تایاجی (مصری کی مٹھاس اور کالی مرچ کا ذائقہ) (٦) ماموں ناصر (رانجھے کے مامو) (۷) آپی (محبت کی نمناک خوشبو) (۸) مبارکہ (پسلی کی ٹیڑھ)، (۹) چھوٹا بھائی (اجلے دل والا)، (۱۰) پانچوں بچے (زندگی کا تسلسل)

میری دانست میں اردو ادب میں شاید یہ پہلی مثال ہے کہ اپنے پورے خاندان کے افراد پر خاکے لکھے گئے ہوں۔ میری نظر سے آج تک یہ نہیں گزرا کہ کسی ادیب نے اپنے افراد خاندان پر خاکے لکھے ہوں۔ ہاں یہ ہوسکتاہے کہ کسی نے تاریخ لکھی ہو یا لکھوائی ہو مگر ان کو خاکوں کے تحت شاید ہی لکھاہو۔ اسطرح حیدرقریشی ماہیے کی طرح خاندانی خاکہ لکھنے والوں میں اولیت کا مقام رکھتے ہیں۔ یہ دوسری بات ہے کہ آیا وہ خاکے کس اہمیت اور مقام یا مرتبہ کے ہیں۔ کیونکہ خاکہ انہی کا لکھاجاتاہے جن سے زیادہ مانوسیت ہوتی ہے۔ یا پھر وہ شخصیت متاثر کرنے والی ہو۔ چنانچہ حیدرقریشی کو یہ تمام شخصیات متاثر بھی کررہے تھے اور ان سے وہ مانوس بھی رہے۔ شاید اس لئے انہوں نے ان پر قلم اٹھایا اور قدم بھی اٹھایا۔

برگد کا پیڑ (اباجی)

اس خاکہ میں حیدرقریشی نے اپنے والد بزرگوار کی وہ تصوری کھینچی ہے کہ ہر پڑھنے والا یہ ضرور سوچتا ہوگا یا سوچنے پر مجبور ہوتاکہ اسے بھی ضرور اپنے ابوپر لکھنا چاہئے۔ گوکہ اس خاکے میں وہ تمام واقعات درج ہیں جو حیدرقریشی کو ان کی زندگی میں پیش آئے۔ مگر انداز پیش کش سنجیدہ بھی ہے اور مزاحیہ بھی، ادبی بھی ہے اور فلسفیانہ بھی اس سے یہ معلوم ہوتاہے کہ حیدرقریشی کی گرفت اپنے قلم پر بھی مضبوط ہے اور شخصیات پر بھی۔ اس میں جذباتیت بھی ہے مگر اپنے ادبی حدود میں وہ اس حد میں رہ کر ہی اپنے کردار تخلیق کرتے ہیں۔ کہتے ہیں:

"اپنی پیدائش سے پہلے میں اباجی کے لہو میں رواں تھا تو اباجی اپنی وفات کے بعد بھی میرے دل میں دھڑک رہے ہیں"۔

"اباجی وضع دار انسان تھے، روایات سے محبت رکھتے تھے۔ مگر زمانے کے ارتقاء کی سچائی کو مانتے تھے۔ ۱۹۶۰ء تک پھندنے والی رومی ٹوپی پہنتے رہے۔ اس ٹوپی کو ترکی ٹوپی بھی کہتے تھے۔ پھر کلاہ کے سات لنگی باندھنی شروع کی اور جناح کیپ بھی استعمال کرتے رہے۔ آج ابا کی ساری زندگی پر نظر دوڑاتاہوں تو مجھے ان کے اندر بیک وقت ایک دراوڑ، ایک آریا، اور ایک عرب بیٹھا نظر آتاہے"۔

اس خاکے میں حیدرقریشی نے اپنے والد محترم کی زندگی کے نشیب و فراز، ان کے بزنس اور شوگرمل کی ملازمت، اہل خانہ سے ان کے تعلقات، ان کی فہم وفراست دینی و دنیوی معلومات، عوام الناس سے روابط کو بڑھے اچھے اور پراثرانداز میں رقم کیاہے۔ ان کی خداترسی اور کشفی کیفیات کو بھی بتایاہے۔ آخر میں ایک واقعہ کو حیدرقریشی نے لکھا کر اس خاکے کا اختتام کیا جو اس خاکے کو اور خاکہ نگار کو ساتھ ہی قاری کو بھی باندھ کر رکھ دیتاہے۔ یہ اور بات ہے کہ بعض اسے



مجذوب کی بڑ سے تعبیر کریں مگر ایسے واقعات رونما ہوسکتے ہیں۔

"اباجی کی وفات کے بعد ہم نے ان کی میت کو سرسے پیروں تک گلاب کے پھولوں سے بھردیاتھا۔ اور پھولوں سمیت ہی دفن کیاتھا۔ وفات کے تیئسویں دن، رات کے نوبجے کے بعد اس کمرے کی کھڑکی سے گلاب کی خوشو کی تیز لپٹیں اٹھنے لگیں جو اباجی کا ذاتی کمرہ تھا۔ یہ خوشبو پہلے امی جی نے محسوس کی اور مجھے کمرے میں بلایا۔ کمرے میں داخل ہوتے ہی مجھے گلاب کی تیز خوشبو کا احساس ہوا۔ میں نے حیرت سے ادھر ادھر دیکھتے ہوئے لمبے لمبے سانس لینے شروع کردیئے۔ میری ایک کزن خالدہ کے دیور شاہد حسین بھی اس وقت ہمارے گھر آئے ہوئے تھے۔ میں نے انھیں بھی کمرے میں بلالیا۔ انھوں نے بھی حیرانی کے ساتھ خوشبو کی موجودگی کی تصدیق کی۔ خوشبو اتنی تیز تھی کہ باہر کی گلی میں بھی ہلکی ہلکی محسوس ہورہی تھی۔ جبکہ کھڑکی سے تو خوشبو کا سیلاب امڈرہاتھا۔ ایک دن کے وقفے کے بعد دوپہر کو تقریباً ساڑھے بارہ بجے اسی کمرے میں پھر گلاب کے پھولوں کی تیز خوشبو پھیل گئی۔ اس خوشبو کو میں نے کمرے میں آکر محسوس کیا ور پھر آوازیں دے کر سارے افراد خانہ کو جمع کرلیا۔ سب نے ہی خوشبو کو محسوس کیا۔ چند منٹ کے بعد خوشبو غائب ہوتی چلی گئی۔ دونوں دفعہ خوشبوکا جانا ایسے لگا جیسے کوئی انسان



آہستہ آہستہ قدم اٹھاتے ہوئے کمرے سے نکل رہاہو۔
باباجی نے مجھے کہا کہ اگر تم اس معاملہ میں دوسروں سے بات نہ کرتے تو یہ خوشبو وقتاً فوقتاً تمہاری ماں کو اور تمھیں ملتی رہتی۔ شاید خوشبو سے بڑھ کر بھی کچھ رونما ہوجاتا۔ مگر تم نے اس کا بھید افشا کر کے خود کو اس سے محروم کرلیا ہے۔ باباجی کی باتیں باباجی جانیں۔ لیکن یہ خوشبو کیاتھی؟۔ اتنی سی بات ہی سمجھ میں آتی ہے کہ اگر آنکھ خواب تخلیق کرسکتے ہیں تو قوت شامہ بھی خوشبو تخلیق کرسکتی ہے۔ [46]

دنیائے ادب پر نظر ڈالیں تو دیگر ادباء و شعراء نے اپنے والدین پر اپنی تخلیقات پیش کی ہیں۔ دورحاضر کے معروف شاعر اور ہندوستانی فلموں کے اسکرپٹ رائٹر و نغمہ نگار نداافاضلی نے اپنے والد کی وفات پر بہت اچھی نظم لکھی۔ جس میں اپنے احساسات اور جذبات کو جس شدومد کے ساتھ پیش کیا ہے وہ واقعی عمدہ ہے اور ہر کسی کو پڑھنے پر مجبور کرتی ہے۔ ملاحظہ ہو،

تمہاری قبر پر میں فاتحہ پڑھنے نہیں آیا
مجھے معلوم تھا تم مر نہیں سکتے
تمہاری موت کی سچی خبر جس نے اڑائی تھی
وہ چھوٹا تھا
وہ تم کب تھے
کوئی سوکھا ہوا پتہ ہوا سے ہل کے ٹوٹا تھا
مری آنکھیں تمہارے منظروں میں قید ہیں اب تک
میں جو بھی دیکھتاہوں
سوچتا ہوں

[46] عمر لاحاصل کا حاصل صفحہ نمبر ۱۱۱، کالم نمبر ۲۔۱۔



وہ وہی ہے جو تمہاری نیک نامی اور بدنامی کی دنیا تھی
کہیں کچھ بھی نہیں بدلا
تمہارے ہاتھ میری انگلیوں میں سانس لیتے ہیں
میں لکھنے کیلئے
جب بھی قلم کاغذ اٹھاتاہوں
تمہیں بیٹھا ہوا میں اپنی ہی کرسی میں پاتا ہوں
بدن میں میرے جتنا بھی لہو ہے
وہ تمہاری نفرشوں، ناکامیوں کے ساتھ بہتاہے
مری آواز میں چھپ کر تمہارا ذہن رہتاہے
مری بیماریوں میں تم
مری بیماریوں میں تم
مری لاچاریوں میں تم
تمہاری قبر پہ جس نے تمہارا نام لکھاہے
وہ جھوٹا ہے
تمہاری قبر میں
میں دفن ہوں
تم مجھ میں زندہ ہو
کبھی فرصت ملے تو فاتحہ پڑھنے چلے آنا[47]

ندؔانےجہاں نظم کے پیرائے میں اظہار خیال کیا وہیں حیدرقریشی نے اپنے والدین کےلئے باقاعدہ خاکے کی صنف کا انتخاب کیا۔ ویسے غزل کے اشعار اور ماہیوں میں بھی تذکرہ آیاہے۔ مگر کسی کے خدوخال کے صحیح انداز میں بیان کرنے کیلئے خاکہ بہت مناسب صنف ہے اور انہوں نے اسی کا انتخاب کیا۔

مائے نی میں کنوں آکھاں (امی جی) کے عنوان سے اپنی والدہ محترمہ کا خاکہ جس میں اپنے بچپن سے لے کر آخر تک مختلف واقعات اور اپنی امی کی وضع قطع، ان کے عادات و اطورا، حوصلہ مندی، خوشی اور غم کے حالات کو پیش کیا۔ خاص طورپر اس لوری کا ذکر جس سے خاکہ کا آغاز ہوا اور اختتام بھی۔ مگر اختتام واقعی بہت دلکش ہے جس میں جن لفظیات

---

[47] رزنامہ سالار۔ ادبی ایڈیشن مورخہ ۰۲/فروری ۱۹۸۳

کا استعمال ہواہے وہ پڑھنے اور سننے سے تعلق رکھتے ہیں پورا اقتباس پیش خدمت ہے۔

"امی جی مجھے ڈاکٹر بنانے کی خواہش مند تھیں۔ میرا ذہن شروع سے ہی "نان میڈیک" بلکہ "نان سائنس" تھا۔ ایک مرحلہ پر سوچا کہ اردو میں پی ایچ ڈی کی ڈگری لے لوں۔ نام کے ساتھ ڈاکٹر تو لکھاجاسکے گا۔ پھر دیکھا کہ ایسے ایسے لوگ بھی ڈاکٹریٹ کرگئے ہیں کہ پی ایچ ڈی کہلانا باعث افتخار نہیں باعث ندامت محسوس ہونے لگاہے۔ اس سے بہتر ہے آدمی "گھربیٹھے ہومیوپیتھک ڈاکٹر بنئے، کورس کرلے۔ اس سے خلق خدا کو فائدہ بھی نہیں ہوگا تو نقصان بھی نہیں ہوگا۔ آخر یہ طے ہوا کہ جہاں امی جی کی اور بہت سی خواہش اور خوشیاں پوری نہیں کرسکا وہیں اس خواہش کی عدم تکمیل پر بھی ہلکے سے دکھ اور افسوس کے ساتھ ماندہ زندگی گزار لوں گا۔

امی جی کی گائی ہوئی لوری کا ایک ایک لفظ الٹ ہوگیاہے۔ ان کی اکھیوں کے تارے کی اپنی قسمت کا ستارہ ہی کہیں گم ہوگیاہے۔ امی کے باغ کا البیلا پھول وقت کے صحرا میں خود دھول ہورہاہے۔ جس کے مکھڑے کے آگے چاندنی میلی لگتی تھی۔ اس کا رنگ روپ بگڑ چکاہے۔ حالات کا تپتا، دہلکتا سورج سوانیزے کے فاصلے پر آن کھڑا ہے۔ اب تو صرف اس جنت کی امید ہےجو ماں کے قدموں تلے ہوتی ہے۔

ماں! تیرے قدموں تلے جب راکھ اڑتی ہے
تو سینے میں خلاجیسی کوئی شئے گونجتی ہے
وہ گیت اب کھوگیا ہے
تو بھی اب چپ ہوگئی ہے اور خلا ویسے کا ویسا ہے
مرے سینے میں تیری مامتا کا نور اترتاہے
مگر کچھ بولتابھی تو نہیں
اقرار کی ساعت ہمیشہ سے ادھوری ہے
نہ جانے کونسا کورہ گراں ہے تیرے ہاتھوں پر---
یہ تو ہے کوئی خیمہ طنابوں کی شکست آثار مٹی سے نکل کر
زرد موسم کی ہوا میں لڑکھڑاتاہے

یہ میں ہوں یا کوئی سایہ تری ممتا کی ٹھنڈی روشنی سے ٹوٹ کر
پاتال اندر ڈوبتا جاتاہے
ہم دونوں
محبت کی گواہی کی طلب میں
اپنے اپنے دل کی جانب رخ کئے اپنے خدا سے پوچھتے ہیں
حشر کب تک آئے گا"[48]

اس تناظر میں اگر شاعر مشرق کی وہ نظم جس کا عنوان ہی والدہ مرحوم کی یاد میں ہے پڑھیں تو عجیب تاثر پیدا ہوگا۔ کہ شاعر مشرق نے اس نظم میں جن جذبات کا اظہار کیاہےوہ آفاقی ہیں اور ہر پڑھنے والے پر ایک سحر کی کیفیت طاری ہوجاتی ہے اور وہ کھوجاتاہے۔ خاص طورپر چوتھا بند متاثر کرنے والا ہے۔

کس کو اب ہوگا وطن میں آہ! میرا انتظار
کون میرا خط نہ آنے سے رہے گا بے قرار

خاک مرقد پر تری لے کر یہ فریاد آؤں گا
اب دعائے نیم شب میں کس کو میں یادآؤں گا

تربیت سے تیری میں انجم کا ہم قسمت ہوا
گھر مرے اجداد کا سرمائیہ عزت ہوا

دفتر ہستی میں تھی زریں ورق تیری حیات

[48] عمر لاحاصل کا حاصل صفحہ ۱۱٤



تھی سراپا دین و دنیا کا سبق
تیری حیات

عمر بھر تیری محبت میری خدمت
گررہی
میں تری خدمت کے قابل جب ہوا تو
چل بسی

وہ جواں قامت میں ہے جو
صورت سروبلند
تیری خدمت سے ہوا جو مجھے
سے بڑھ کر بہرہ مند

کاروبار زندگانی میں وہ ہم پہلو
مرا
وہ محبت میں تری تصویر، وہ
بازو مرا

تجھ کو مثل طفلکِ بے دست و
پاروتا ہے وہ
صبر سے نا آشنا صبح و مسار
روتا ہے وہ

تخم جس کا تو ہماری کِشتِ
جاں میں بوگئی
شرکت غم سے وہ الفت اور
محکم ہوگئی[49]

اس کے بعد دادا جی، ناناجی، تایاجی، ماموں ناصر، آپی، مبارکہ (بیوی) چھوٹا بھائی اور پانچوں بچے کے عنوان سے

[49] کلیات اقبال ص ١٨٦، ١٨٧،

خاکے لکھے ہیں۔ جو ان کے اپنے رشتہ دار اور خاندانی افراد سے متعلق ہیں۔

میری دانست میں شاید حیدرقریشی وہ پہلا فنکار ہے جس نے اپنے افراد خانہ، اور خاندان والوں کو خاکوں کا موضوع بنایا۔ ورنہ جیسے ابتدا میں ذکر ہواہے کہ مشہور معروف شخصیتوں یا اپنے چاہنے والوں کو موضوع بناکر لکھے جاتے رہے۔

حیدرقریشی کے خاکوں میں دوسرا پڑاؤ وہ ہے جہاں انہوں نے ادبی شخصیتوں کو موضوع بنایاہے۔ جن میں میرزا ادیب، فیض احمد فیض، ڈاکٹر وزیرآغا، غلام جیلانی اصغر، اکبر حمیدی، عذرا اصغر، سعید شباب، محمد اعجاز اکبر، طاہر احمد، خانپور کے ادبی احباب۔ اسطرح ۱۰ خاکے جنہیں مختلف عنوانات کے تحت تحریر کئے ہیں۔ جسے بعد درویش کا نام دیا۔

مرزا ادیب کا خاکہ جس عنوان کے تحت لکھا وہ "اردو ادب کے نوبل پرائز" ہے۔ حیدرقریشی کے خاکے ہوں گے، انشائیے، افسانے ہوں کہ یادداشت نگاری سب کے سب کسی نہ کسی شعر سے شروع ہوتے ہیں یا پھر کسی ماہیےسے۔ گویا انہوں نے یہ ثابت کردیا کہ شعر کی قوت کیا ہوتی ہے۔ کیونکہ شعر بھی ایسا لکھ جاتے ہیں جس میں اس پورے مضمون کا سیاق و سباق اس کے اندر آجاتاہے۔ خاکوں میں بھی یہی صورتحال ہے۔

مرزا ادیب کے اس خاکے پر جو شعر ہے وہ یہ ہے

خاموشیوں کے لب پہ کوئی گیت تھا رواں
گہری اداسیوں کے کنول جھومتے رہے

مرزا ادیب کی ادب دوستی، ادب سے وابستگی، شرافت اور انسان دوستی کا تذکرہ کرتے ہوئے اس کی سادگی اور بے نیازی کو بتایا۔ وہ آج کی دنیاداری میں پڑنے والے نہیں فرماتے ہیں:

"مرزا ادیب سادہ دل اور سادہ مزاج کے انسان ہیں۔ اپنے اوپر کوئی دوسرا روپ نہیں چڑھاتے۔ میں نے کئی ایسے ادیبوں

کو دیکھا ہے جن کی اتنی ادبی حیثیت نہیں ہوتی جتنی وہ اپنی اداکاری سے ظاہر کرتے ہیں"۔[50]

ہماری ادبی دنیا کی حالت بھی عجیب ہے۔ بس اسی کی تہنیت بھی ہوتی ہے اور اس کا جشن بھی بنا لیتے ہیں جو خود کو ادیب یا شاعر کہلوانے کیلئے کچھ بھی کرتاہے۔ مگر ایسے خاموش اور واقعی ادیب و شاعر کو فراموش کردیتے ہیں۔ اور اس کا احساس حیدرقریشی کو ہے اور یہی تذکرہ اس خاکے میں کردیا۔

"میرزا ادیب نے ادب کی بڑی خدمت کی ہے۔ ادب والوں نے اس کا صلہ صرف اتنا دیا کہ ان کی بعض کتابوں پر مختلف انعامات دیئے۔ لیکن مرزا ادیب کی ادبی خدمات کا ابھی تک صحیح طورپر اعتراف نہیں کیاگیا۔ اب وقت آگیاہے کہ ادباء کرام اور ادبی ادارے اس طرف توجہ کریں۔ مرزا ادیب کی ادبی خدمات نصف صدی کا قصہ نہیں ہیں۔ اس سے بھی زیادہ مدت کا قصہ ہیں۔ ہماری مجموعی عمر پچاس سال سے کوسو ں دور ہے جبکہ مرزا ادیب اپنی ادبی زندگی کے پچپن سال بھی کبھی کے پورے کرچکے ہیں۔ کیا ہمارے ادبی اداروں کو کم از کم اتنی توفیق بھی نہیں ہے۔ کہ مرزا ادیب کی "ادبی گولڈن جوبلی" منا ڈالیں؟

اگر "نوبل پرائز" عالمی سیاست کی بھینٹ نہ چڑھ گیا ہوتا اور نوبل صاحب خود بھی زندہ ہوتے تو میں خود نوبل صاحب کو خط لکھتا، مرزا ادیب کی کل کتابیں انھیں بھجواتا۔ مجھے یقین ہے انھیں نوبل پرائز ضرور دے دیاجاتا۔

---

[50] عمر لاحاصل کا حاصل صفحہ نمبر ۱٤۰، کالم نمبر ۱۔

ویسے مرزا ادیب اتنے شریف، محنتی،
سادہ اور نوبل انسان ہیں کہ ان کا وجود
خود اردو ادب کیلئے نوبل پرائز کا
درجہ رکھتاہے۔[51]

"ہم کی ٹہرے اجنبی "کے عنوان سے فیض احمد فیض کا خاکہ لکھا ہے۔ اس میں ان کی ابتدائی حالات زندگی اور ادب و شاعری کا مختصر سے تعارف کے بعد خود کی ملاقات کا تذکرہ ان الفاظ میں کرتے ہیں۔

"فیض سے میری ملاقات ان ایام میں ہوئی جب وہ وزیراعظم کےمشیر تھے۔ لاہور میں ان کے آفس میں سادہ سے کمرے، عام فرنیچر اور سخت گرمیوں کے باوجود چھت کے پنکھوں کے سوا کچھ نظر نہیں آیا۔ نہ اعلیٰ فرنیچر، نہ خوبصورت قالین، نہ ایرکنڈیشنڈ...... میں ادب میں نووارد تھا۔ خانپور میں ہماری محدود ادبی سرگرمیاں تھیں۔ روزنامہ "مغربی پاکستان" لاہور کا ایک شمارہ میرے پاس تھا۔ جس میں خانپور کی ادبی ڈائری چھپی تھی۔ اس میں بیک وقت فیض اور نثری نظم کی تحریک کا ذکر خیرتھا۔ میں نے اپنا مختصر سا تعارف کرایا۔ اخبار پیش کیا۔ فیض نے ہلکے سے انداز میں حوصلہ افزائی کی پھر کہنے لگے آپ نوجوان لوگ ہیں نثری نظم کے جھمیلے میں کہاں پڑرہے ہیں۔ سو میں فیض کے پاس سے ہی نثری نظم سے تائب ہوکر اٹھا"۔[52]

ابتدائی دنوں میں جب حیدرقریشی نے جدید ادب کا آغاز فرمایا تو اس کی پذیرائی بہت ہوئی۔ چنانچہ آج پروفیسر مظہر امام کی کتب میں اس کا تذکرہ مل جاتاہے۔ اور فیض کی آزاد غزل کا قصہ بھی جدید ادب سے جوڑ دیاگیا مگر اس کا اعتراف حیدرقریشی نے کچھ اس انداز میں کیا کہ واقعی تحقیق یونہی نہیں ہوتی بلکہ اسے چاہیے کہ حقائق کا پتہ لگانے کے بعد کوئی بات منظر عام پر آئے اور آنی چاہئے۔ اس خصوص میں یہ خاکہ پڑھنے کے بعد اندازہ ہوتاہے کہ جدید غزل کی تحریک میں کیوں فیض کو بھی گھسیٹاگیاتھا۔ اس کا منظر نامہ کچھ یوں ہے۔

---

[51] دوسرا کالم صفحہ ۱٤۰
[52] عمر لاحاصل کا حاصل، کالم ۲، صفحہ ۱٤۱

"بھارت میں برادرم مناظر عاشق ہرگانوی آزاد غزل کی تحریک کو بڑھانے میں سرگرم ہیں۔ ایک بارانھوں نے مجھے آزاد غزلوں کا ایک انتخاب بھجوایا۔ جس میں فیض کی ایک آزاد غزل بھی شامل تھی۔ مجھے حیرت ہوئی تاہم میں نے فیض کی آزاد غزل سمیت انتخاب چھاپ دیا۔ یہی آزاد غزل پھر ماہنامہ شاعر ممبئی کے آزاد غزل و نثری نظم نمبر میں بھی شائع ہوئی۔ بعد میں معلوم ہوا کہ یہ تو فیض کی "شام شہریاراں" کی ایک نظم تھی جسے قطع و برید کرکے بڑی عمدگی سے آزاد غزل بنادیاگیاتھا۔ فیض صاحب نے کسی محفل میں وضاحت کی کہ میں آزاد غزل اور نثری نظم دونوں "خوبیوں" سے پاک ہوں۔ کچھ عرصہ بعد فیض کی آزاد غزل کے سلسلہ میں آزاد غزل کے بانی مظہر امام سے جنگ لاہور میں چھپنے والے انٹرویو میں سوال کیاگیا تو انھوں نے کمال محبت سے فیض کی آزاد غزل کی دریافت و اشاعت کا سہرا "جدید ادب" کے سرباندھ دیا۔ ممکن ہے انھیں واقعی علم نہ ہو۔ لیکن ڈاکٹر مناظر عاشق ہرگانوی زندہ ہیں وہ یقیناً اعتراف کریں گے کہ فیض کی آزاد غزل مجھے انہوں نے بھجوائی تھی سو اس دریافت کا سہرا انہیں کے سرہے"۔ [53]

---

[53] عمر لاحاصل کا حاصل، کالم نمبر ۱، صفحہ ۱٤۲

عہدساز شخصیت کے عنوان سے (ڈاکٹر وزیر آغا) کا خاکہ ہے۔ جہاں تک وزیر آغا کا معاملہ ہے۔ حیدرقریشی کی پسندیدہ شخصیتوں میں سے ایک، بلکہ یہ ان کے ادبی رہنما بھی رہے ہیں۔ خود حیدرقریشی نے اس بات کا اعتراف کیا کہ ان سے بہت کچھ اکتساب کیا۔ ایسی نابغہ روزگار شخصیت کا خاکہ لکھا اور ان کے ادبی معیار و وقار کو اس میں پیش کرنے کی کوشش کی۔ اس خاکہ میں لکھتے ہیں۔

> "---- پہلی ملاقات کے وقت میرا پہلا تاثر یہ تھا کہ میں اس عہد کی بہت بڑی ادبی اور علمی شخصیت سے ملنے کا اعزاز حاصل کررہاہوں۔ پھر کبھی بہاولپور، کبھی لاہور اور کبھی سرگودھا میں ان سے ملاقاتیں ہوئی اور یہ سلسلہ تاحال جاری ہے"۔[54]

اسطرح ان کی ملاقاتیں اور ادبی محفلیں سجتی رہی پھر تعلقات مزید بڑھتے گئے اور انھیں قریب سے دیکھنے کا موقع ملتاگیا۔ چنانچہ ان کی ایک عادت کو کس انداز سے پیش کرتے ہیں ملاحظہ فرمائے۔

> "وزیر آغا دشمن کے تیر سہنے کا حوصلہ رکھتے ہیں۔ مگر دوستوں کے مارے ہوئے پھول نہیں سہہ سکتے۔ ہاں اگر دوست کھل کر دشمن بن جائے تو پھر اس کی زہریلی مخالفت کو بھی ایک ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ گھول کر پی جاتے ہیں۔ سطحؔ قسم کے مخالفین کے انداز مخالفت پر انہیں غصہ نہیں آتا بلکہ مخالفوں کی ذہنیت پر رحم آتاہے۔ البتہ جو لوگ مکارانہ اور سازشی انداز اختیار کرتے ہیں ان کے رویے پر وزیر آغا کو افسوس بھی ہوتاہے اور رنجیدہ

---

[54] عمر لاحاصل کا حاصل، کالم نمبر ۲، صفحہ نمبر ۱٤۳

بھی ہوتے ہیں۔ علمی اور فکری اختلاف رائے کو وزیر آغا نے ہمیشہ کشادہ بازوؤں کے ساتھ سینے سے لگایاہے۔[55]

طاہر مجید (جرمنی) حیدرقریشی کے خاکوں کے متعلق فرماتے ہیں:

"حیدرقریشی نے لفظوں سے بیس مختلف پورٹریٹ بنائے ہیں۔ ان میں نصف کاتعلق جسمانی رشتوں سے ہے اور باقی نصف کا معاملہ اس کے روحانی رشتوں تک جاپہنچتاہے۔ روحانی رشتوں سے میری مراد ان شاعروں، ادیبوں اور ایسے لوگوں سے ہے جو کسی نہ کسی طور اس کی روح سے سابقہ رکھتے ہیں۔ مجھے یہ دیکھ کر خوشی ہوئی کہ اس نے ان خاکوں اور یادوں میں اس توازن کو برقرار رکھا ہے جو اس کی محبتوں کا حسن ہے"۔[56]

اس طرح دیگر خاکوں میں حیدرقریشی کی علمیت کا اندازہ لگایا جاسکتاہے۔ اور وہ خالص انسانی جذوں کے تحت لکھتے ہیں۔

*****

---

[55] عمر لاحاصل کا حاصل، کالم نمبر ۱، صفحہ ۱٤٤

[56] میری محبتیں صفحہ ۱۱۷، حیدرقریشی فن اور شخصیت مرتبین نذیر فتح پوری اور سنجے گوڑبولے

فاصلے، قربتیں (انشائیے)

حیدرقریشی نے اصناف نثر میں تقریباً اصناف پر طبع آزمائی کی۔ ان میں انشائیہ بھی ایک ہے۔ ویسے انشائیوں کے متعلق اب تک بہت سی بحثیں ہوئیں۔ اور بتایاگیا کہ محمد حسین آزاد نے نیرنگ خیال کے تحت جو انشائیے لکھے وہ انشائیے اردو کے اولین انشائیے ہیں۔ مگر پھر یہ بتایاگیا کہ مرزا فرحت اللہ بیگ نے جو انشائیہ لکھا "نذیراحمد کی کہانی کچھ ان کی کچھ میری زبانی" دراصل یہ انشائیہ پہلاہے۔ پھر سب اس کے حوالے سے یہ بتایا گیا کہ اس میں ملاوجہی نے وہ رنگ اختیار کیا ہے کہ انشائیوں کی جھلک پائی جاتی ہے۔ لہٰذا اسے انشائیے ثابت کئے جاسکتے ہیں۔ یہ ساری چیزیں درست مگر اصل میں انشائیہ کہاکسے جاتاہے۔ کیا انگریزی طرز کے Essays کو یا پھر کوئی اور چیز ہے؟ جو بھی ہو مولانا ابوالکلام آزاد کی غبار خاطر کو بھی انشائیہ کہاگیا۔ اسطرح ادب میں بہت ساری تحریریں ملیں گی جن پر انشائیے کا اطلاق ہوگا۔ واقعتاً کسی نے انشایہ صنف کو اختیار کرتے ہوئے لکھا تو وہ قابل غوٖر ہے۔ اس تناظر میں پطرس کے مضامین کو انشائیوں کی صف میں رکھاجاسکتاہے۔ مشتاق احمد یوسفی کی تحریروں کو انشائیہ کہاجاسکتاہے۔ مگر پاکستان میں باقاعدہ اس پر بحث ہوئی تو متفقہ طورپر وزیر آغا کو انشائیہ کا بانی قرار دیاگیا۔ کیونکہ انہوں نے شعوری طورپر اس فن کو برتا اور لکھ کر بتادیا کے آخر انشائیہ کیا ہوتاہے۔ وزیر آغا کے پروردہ احباب میں سے ایک حیدرقریشی بھی ہیں۔ جنہوں نے بھی شعوری طورپر کوشش کی اور اچھے انشائیے قارئین کے آنے پیش کردیئے۔ ان کی انشائیوں کی کتاب فاصلے قربتیں کے عنوان سے منظر عام پر آئی اور اس میں ۱۰/ انشائیے درج ہیں۔ ان کو پڑھنے سے اندازہ ہوتاہے کہ فن کے تقاضوں کو حیدرقریشی نے کس حدتک اپنایا اور ان کا حق ادا کردیا۔ چنانچہ اس فن میں بھی حیدرقریشی کامیاب نظر آتے ہیں۔ انشائیوں کی فہرست کچھ اس طرح ہے۔

۱۔ خاموشی ۲۔ نقاب



۳۔ وگ ۴۔ فاصلے قربتیں
۵۔ بڑھاپے کی حمایت میں ٦۔ اطاعت گذاری
۷۔ یہ خیروشر کے سلسلے ۸۔ چشم تصور
۹۔ اپنا اپنا سچ ۱۰۔ تجربہ کاری

ان تمام کا اگر اجمالی طورپر بھی جائزہ لیاجائے تو اندازہ ہوگا کہ انشائیے کیلئے جس طرز ادا اور جس قسم کی زبان کی ضرورت ہوتی ہے اس کو حیدرقریشی نے اپنایا بھی ہے اور استعمال بھی کیاہے۔ انشائیوں کی بھی یہی خوبی کے وہ شعر ہی سے شروع ہوتے ہیں۔ پہلا انشائیہ "خاموشی" کے عنوان سے ہے۔ اور اس کا آغاز شعر سے کرتے ہیں۔ شعر ہے ؂

گیت سناتے ہیں جھرنے کے گر نے کا
حرف جو خاموشی کی صدا میں گرتے ہیں

اس کے بعد خاموشی سے متعلق تحریر کرتے ہوئے اس کے فوائد بتاتے جاتے ہیں۔ لکھتے ہیں۔

> "ہنگامہ اور شور زندگی کے صحیح عکاس نہیں۔ اسی طرح سناٹا اور ویرانی بھی زندگی کے ترجمان نہیں ہیں۔ ان کے برعکس خاموشی زندگی کی حقیقی عکاسی کرتی ہے۔ جو لوگ سناٹے اور خاموشی میں فرق نہیں کرپاتے وہ خاموشی کی اہمیت نہیں جان سکتے۔ سناٹا بے روح اور بے آواز ہوتاہے جبکہ خاموشی زندگی کی عکاس ہی نہیں ، زندگی کو جنم بھی دیتی ہے"۔[57]

یہ کہ خاموشی زندگی کو جنم دینے والی ہوتی ہے یہ ایک سائنسی نقطہ سے بھی اس کو واضح کرتے ہیں۔ خاموشی کو مختلف انداز سے پیش کرتے ہوئے اپنے قاری کے ذہن کی گتھیوں کو سلجھادیتے ہیں۔ ماضی اور حال کے کئی واقعات کو

---

[57] عمر لاحاصل کا حاصل، صفحہ نمبر، ۲۱۷

اس مختصر سے انشائیہ میں سمو کر بات میں بات پیدا کردیتے ہیں۔ کہتے ہیں۔

"نئی تہذیب شور اور ہنگامے سے عبارت ہے"

اور آگے چل کر اسی خاموشی کو خیر کی اور شور کو شر کی علامت بتاتے ہیں۔

* * * * *

"نقاب"

حیدرقریشی نے اس لفظ کی مناسبت سے معاشرے کے کئی افراد کو بے نقاب کرتے نظر آتے ہیں۔ مگر اس نقاب کو پہلے انہوں نے اسی انداز میں اختیار کیا اور برتا ہے جن معنوں میں قاری لیتاہے۔ اور نقاب بہ معنی برقعہ اس کے بہت سے نمونوں کو بھی واضح کروایاہے۔

"شٹل کاک برقع اس دور کی بات ہے جب انسان خود کو اور کائناتی رموز کو جاننے کیلئے سرگرداں ہونے لگاتھا۔ پھر جب ریشمی برقعے پورے نقاب کے ساتھ آیا تو گویا انسان (ایک حدتک) اپنی ذات اور کائنات کی گتھیاں جان چکاتھا اور انھیں سلجھانے میں مشغول تھا۔ ریشمیں برقعہ پورے نقاب سے آدھے نقاب تک آیا تو انسان بھی حیرت انگریزانکشافات اور ایجادات کے دور میں آگیا۔ جوں جوں خواتین کا نقاب ارتقا کے مزید مرحلے طے کرتا جائے گا انسانی ذہن بھی اپنی اور کائناتی دریافت کے عمل میں اسی رفتار سے آگے بڑھتاجائے گا۔[58]

اپنے روزمرہ معاشرے میں ہونے والے حالات واقعات کو بڑی چابکدستی سے نقاب کے حوالے سے پیش کرتے ہیں۔

"ویسے دنیا میں ہر شخص نے نقاب اوڑھ رکھاہے۔ تاجر، ادیب، ملا، پنڈت، افسر، ملازم، دکاندار، خریدار، سیاستدان۔ کیا یہ سب لوگ بظاہر جیسے نظر آتے ہیں حقیقتاً ویسے ہیں؟ یہ سب لوگ محبت، خلوص، ایمان اورسچائی وغیرہ کےنقاب اوڑھ کر نفرت،

---

[58] عمرلاحاصل کا حاصل ۔ کالم نمبر۱، صفحہ نمبر ۲۱۹

ریاکاری اور جھوٹ کے کھیل کھیلتے ہیں۔ لیکن ان کے نقابوں نے ان کے عیوب کو ڈھانپ رکھاہے"۔[59]

اس انشائیہ میں ایک جملہ یا فقرہ ایسا ہے جو واقعی حیدرقریشی کو ادب میں ذہانت وفطانت کے اعتبار سے ممیز کرتاہے۔ Wit & Humour کے لحاظ سے۔ اور میری دانست میں ایسے جملوں کی اردو ادب میں سخت ضرورت ہے۔ اس تناظر میں یہ جملہ دیکھئے:

"نقاب معلومات کے جہنم اور نامعلوم کی جنت کے درمیان عالم برزخ ہے"

اس طرح کئی ایسے فقرے انہوں نے اس انشائیہ میں لکھے ہیں جو یاد رکھنے کے قابل ہیں۔ لکھتے ہیں:

"---- -- مستقبل کے پورے مگر باریک نقاب میں سے ہر لحظہ جھانکتاہوا "حال" پلک جھپکتے ہی ماضی کے آدھے نقاب کی اوٹ میں چلاجاتاہے اور ہم اس لمحے کو چھونے کی، پوری طرح دیکھنے کی خواہش دل میں ہم ہی لئے رہ جاتے ہیں۔[60]

آخرمیں دورحاضر اور اسی طرح ادب پر بھی طنزیہ انداز میں واضح کرتے ہیں کہ کسطرح کا ادب لکھا جارہاہے۔

"خوشامد اور چاپلوسی کا نقاب اوڑھ کر لوگ بڑے بگڑے کام بھی ٹھیک کرلیتے ہیں۔ یہ ایسا خوبصورت اور دلآویز نقاب ہے جو کسی بھی طرح کے بڑے سے بڑے اور اصول پرست رہنما کو بھی مغلوب کرلیتاہے۔ دبیزنقاب جب کسی معقول انسان کی عقل پڑتاہے تو وہ عاشق زار بن کر محلے کے شرفا کیلئے متعدد مسائل پیدا کردیتاہے۔ لیکن جب یہی نقاب کسی ادیب کی عقل پر پڑتاہے

---

[59] عمرلاحاصل کا حاصل، کالم ۲، صفحہ ۲۱۹
[60] عمر لاحاصل کا حاصل، کالم ۱، صفحہ ۲۲۰

تو وہ بے سروپا نظمیں یا مضمون
نماخط قسم کے چیزیں لکھ کر اپنے آپ
میں ایک مسئلہ بن جاتاہے۔ شاید نفسیاتی
مسئلہ!" [61]

"وگ"

یہ بال و پر تو چلو آگئے
حیدر
بلا سے پہلے سے وہ خال
و خد نہ رہے

اس انشائیہ میں حیدرقریشی نے اپنے اندر کا سفر کیا۔ اپنے من میں ڈوب کر پاجا سراغ زندگی کی کیفیت ملتی ہے اور وہ ایک عجیب کیفیت سے سرشار نظر آتے ہیں۔ کہ جب سے انہوں نے ہوش سنبھالا اپنے والد کے سرپر بالوں کو ندارد پایا۔ اور ان کے دل میں یہ خواہش رہی کہ وگ خریدلی جائے اور اس کا اظہار بھی اپنے والد سے کردیا مگر ان کے والد مسکراکر رہ گئے کیونکہ اس وقت وسائل نہیں تھے۔ اور جب حالات سدھر گئے تب والد نہیں رہے۔ مگر اس کمی کو انہوں نے خود کو وگ پہناکر پورا کردیا۔ اس وگ کو وہ مختلف انداز میں دیکھ کر کبھی اسے بہار سے تشبیہ دیتے ہوئے اور کبھی خود آگہی سے تعبیر کرتے ہوئے بیان کرتے نظر آتے ہیں۔

"فاصلے، قربتیں"
جب سرکار کی جانب سے
منظوری ہوتی ہے
فاصلہ کتنا بھی ہو عین
حضوری ہوتی ہے

[61] عمر لاحاصل کا حاصل، کالم نمبر ۱، صفحہ ۲۲۰

اس انشائیہ میں بہت ساری معلومات اکٹھا ہوگئی ہیں۔ تخلیق کائنات سے لے کر سائنسی مشاہدات تک کا سفر بڑے دلچسپ انداز میں کرادیاہے۔

"تخلیق کے امکانات کو قربت یکجا کرتی ہے اور فاصلہ تخلیقات کے انبار لگاتا چلاجاتاہے"۔[62]

"فاصلہ اور قربت ایک دوسرے کیلئے اسی طرح لازم و ملزوم ہیں جس طرح ایٹم کا ہر اینٹی پارٹیکل اور پارٹیکل۔ رات اور دن، اہرمن ویزداں، اور میری بیوی اور میں ایک دوسرے کے لئے لازم و ملزوم ہیں"۔ [63]

اسی طرح آگےتحریر فرماتے ہیں:

"قربت کا ایک رنگ مرد اور عورت کے تعلق سے عبارت ہے۔ اس قربت کے مختلف مراحل میں آخری مرحلے کے اختتام پر فاصلہ وجود میں آتاہے۔ بے دم ہوں میں ادھرتو ادھر وہ نڈھال ہے"۔

اب بھلا اس نکتے کو دنیا بیزار لوگ کیا سمجھیں۔ نہ برہم چاری نہ برہم کماری

"بڑھاپے کی حمایت میں"

یہ ڈھلتی عمر بھی شعلے مرے بجھانہ سکی
لہو میں اپنے ابھی اشتعال باقی ہے

بچپن، جوانی اور بڑھاپے کا ذکر کرتے ہوئے بڑھاپے کو تجربے سے تعبیر کرتے ہیں۔

---

[62] عمرلاحاصل کا حاصل، صفحہ ۲۲۲
[63] عمرلاحاصل کا حاصل، صفحہ ۲۲۲



"بچپن معصومیت سے عبارت ہے۔ جوانی حیرت و تجسس سے، جبکہ بڑھاپا فکرودانش کے انوار کے ساتھ معصومیت اور حیرت و تجسس کو بھی اپنے جلو میں لئے ہوتاہے"۔[64]

آگے چل کر ایک حقیقت کا انکشاف کرتے ہوئے بڑی حیرت انگیزبات بتاتے ہیں۔

"بڑھاپا بزرگی اور متانت عطا کرنے کے ساتھ زندگی کے تجربات کا نچوڑ نکال کر ایک رہنما کا کردار بھی ادا کرتاہے۔ بڑھاپے میں گرگِ ظالم بھی پرہیزگار بن جاتاہے اور یہ پرہیز گاری اسے قویٰ کے اضمحلال اور زندگی کے تجربات کے نچوڑ کے بعد نصیب ہوتی ہے"۔[65]

اطاعت گزاری،یہ خیروشرکے سلسلے، چشم تصور، اپنا اپنا سچ، تجربہ اور تجربہ کاری وغیرہ ان تمام انشائیوں میں حیدرقریشی کی ذہانت جھلکتی ہے اور غیر معمولی اقوال ان سے برآمد ہوتے ہیں۔ جو قارئین کیلئے ان کی زندگیوں میں کام آنے والے ہیں۔

*****

[64] عمر لاحاصل کا حاصل، صفحہ ٢٢٤
[65] عمر لاحاصل کا حاصل، صفحہ ٢٢٤

حیدرقریشی کی یادداشت نگاری

حیدرقریشی نے یادداشت نگاری کے طورپر ان تمام یادوں کو قلمبند کردیا جو ان کا ماضی رہی ہیں۔ جسے انہوں نے کھٹی میٹھی یادیں کہہ کر ہمارے سامنے رکھ دیا۔ ان کا انداز دلکش ہے۔ کیونکہ یہ حیدرقریشی کے واقعات ہونے کے باوجود قاری اسے اپنے سمجھ سکتاہے کیوں کہ وہ بھی اس طرح کے واقعات سے گذرا ہوتاہے۔ اس میں ادبیت آگئی ہے۔ ورنہ ادب کیا ہے ادب بھی آپ بیتی اور جگ بیتی ہی تو ہوتاہے۔ ہاں انداز پیش کش الگ الگ ہوتاہے۔ اس یاد نگاری سے حیدرقریشی کے اور انکے رشتہ داروں کے حالات سے آگہی ملتی ہے۔ ان یادوں کے ساتھ حیدرقریشی کا تحت شعور کیا کام کرتاہے۔ تحت شعور کو شعوری انداز سے حیدرقریشی کے کلام کا اپنا طریقہ ہے۔ اس کی تحریریں اپنے قاری کو باندھ کر رکھ دیتی ہیں۔ نہ ان سے بوریت محسوس کرتاہے اور نہ طبیعت اکتاجاتی ہے۔ بلکہ ایک خاص قسم کا تجسس پیدا ہوتا ہے اور قاری اس تحریر کو ختم کرکے ہی دم لیتاہے۔ اتنا ہونے کے باوجود اس میں کہیں صناعی ہے اور نہ کہیں مبالغہ، حقیقت نگاری کو پراثر انداز میں تحریر کردیاہے۔ بزم جاں کے تحت جرمنی کے سائنسی ترقی یافتہ ملک خود ایک (پاکستانی) جیسی حالت میں جاتاہے تو کیا حالت ہوتی ہے اس کو جن الفاظ میں پیش کیاہے واقعی اچھا لگتاہے۔ یوں محسوس کرتے ہیں جیسے بچپن میں اپنی امی سے سنی ہوئی کہانیوں کی یاد انے لگتی ہے۔

"پہلی بار ایک مارکیٹ میں داخل ہونا
تھا۔ میں دروازے کے قریب پہنچا تو
آٹومیٹک دروازہ اپنے آپ کھل گیا اور
میرا منہ حیرت سے کھل گیا"۔ [66]

مشرقی اور مغربی تہذیب میں کس قدر بعد ہے اس کو بھی اس یاد میں لکھ دیا۔ کہ

---

[66] عمر لاحاصل کا حاصل، صفحہ نمبر ۱٦۲

"اپنے ہاں تو غالبؔ اس چارہ گرہ کپڑے کا افسوس کرتے رہے جس کی قسمت میں عاشق کا گریباں ہوناتھا۔ ادھر مغرب میں اس تین گرہ کپڑے کی قسمت پر رشک آتاہے جو گرمیوں میں حسینانِ مغرب نے زیب تن کررکھا ہوتاہے"۔[67]

دوسرا مضمون "دوھیال کے رشتہ دار" کے عنوان سے ہے۔ اسے پڑھنے سے اندازہ ہوتاہے کہ انسان جب تک اپنے رشتہ داروں یا ہمسایوں کے ساتھ رہتاہے تو اسے اتنا لگاؤ نہیں رہتا۔ جتنا بچھڑنے یا دور ہونے کے بعد ان کی یاد ستاتی ہے۔ انھیں یادوں کو بساکر زندگی گذارنے میں بڑا مزا آتاہے۔ کوئی تو اس شخص سے پوچھے کہ جب وہ اپنے گھربار، وطن اور رشتہ داروں کو چھوڑ کر پردیس جاتاہے تو وہاں اس کی کیا حالت ہوتی ہے اور رہ رہ کر وہ کیسے یاد آتے ہیں ؎

نہیں آتی تو یاد ان کی مہینوں تک نہیں آتی
مگر جب یاد آتے ہیں تو اکثر یاد آتے ہیں

کچھ اسی قسم کا منظر اس یادنگاری میں ملتاہے، وہ اپنے تایاہوں کے بوا، ان رشتہ داروں نے ان کی کس قسم سے اور کس انداز سے مدد کی تھیں۔ کن حالات سے یہ دوچار تھے۔ یہ بڑی بات ہے کہ انسان اپنے ماضی کو یاد رکھے اور حالات بدلنے کے بعد بھی یاد رکھے اور بڑی بات ہے۔ حیدرقریشی کی زندگی یعنی ابتدائی زندگی بھی بڑی کسمپرس میں گذری۔ محنت مزدوری کرنے پر بھی صحیح طورگذربسر نہیں ہوسکتی تھی۔ مگر کافی محنتوں کے بعد جب یہ جرمنی پہنچے تو کسی حدتک کشادگی آگئی۔ وہ دن گذرگئے۔ قرض جیتنے بھی تھے ادا ہوگئے۔ اب زندگی اس راہ پر تھی جہاں یہ بخوشی اسے گذر رہے تھے۔ ان حالات میں عموماً لوگ اپنے ماضی کو نہ یاد کرتے ہیں اور نہ

[67] عمر لاحاصل کا حاصل،صفحہ نمبر ۱٦۳

اپنے ان رشتہ داروں کو بلکہ اگر وہ سامنے آبھی جائیں تو پہنچانے سے بھی گریز کرتے ہیں۔ مگر حیدرقریشی کا معاملہ ایسا نہیں انہیں نہ صرف پہنچاننے بلکہ انھیں اپنے دل و دماغ میں بسائے ان کی یادوں کے سہارے زندگی گذاررہے ہیں اور اب تو انھیں اپنی تحریر میں زندہ کردیا۔ ان کے ساتھ وہاں کے رسم و رواج، عقیدتیں اور دیگر امور کا پتہ بھی ان سے چلتاہے۔ شادی بیاہ کے وقت کیسے کیسے رسموں کا طریق رائج ہے۔ اج سن کر حیرت ہوتی ہے۔

"کزنز" تیسرا مضمون ہے یہ بھی دلچسپی سے خالی نہیں اس میں خالہ زاد بہنوں کے ساتھ گذرے واقعات کا تذکرہ ہے، اور ماموں اور ماموں زاد بھائیوں، بہنوں کے حالات کا تذکرہ ہے۔

"پڑھنے سے پڑھانے تک" اس مضمون میں حیدرقریشی کے تعلیمی زندگی کا حال ہے۔ کیسے اور کن حالات میں انہوں نے زندگی گذاری۔ اور یہاں پر انکے اپنے رشتہ داروں نے کس کس انداز سے انکی مدد کی واقف کرایا۔ شوگرمل کی نوکری، ابو کے کپڑوں کا بزنس اور اس کاٹھپ ہوجانا، غربت بلکہ بھیانک غربت کی زد میں آجانا، ایسے محسوس ہوتاہے کہ انھوں نے زندگی کی نشیب و فراز کو بہت قریب سے دیکھا، اسے جانا اور گذاراہے۔

اس مضمون میں وہ واقعات بھی درج ہوئے ہیں جب انہوں نے پرائیوٹ طورپر ایم اے کرلیا اور ابیٹ آباد میں لکچررشپ اختیار کرلی۔ پڑھنے سے گذر کر پڑھانے کے مقام پر آئے تو یہ تجربہ کیساتھا۔ اور بچے آج کل کے بچے کسقدر ذہین اور معلومات کتنی زیادہ رکھتے ہیں۔ چنانچہ اس کو بھی انہوں نے رقم کیا۔ لکھتے ہیں:

"---- جملے بنانے کی مشق کے دوران
بے تکلف طلبہ کچھ زیادہ ہی کھلنے
لگتے بعض جملے جان بوجھ کر غلط
بناتے، جو غلط ہوکر بھی بامعنی ہوتے

تھے- اور ان سے جملہ بنانے والے کی
ذہانت عیاں ہوتی تھی- اس وقت مجھے
جو جملے یاد آرہے ہیں، درج کرہاہوں-

پیٹھ پیچھے برائی کرنا: کسی کے پیٹھ پیچھے برائی کرنے سے گناہ ہوتاہے اور ایڈز کی بیماری بھی ہوتی ہے-

کارگذاری : بارش کی وجہ سے بہت کیچڑ ہوگیا تھا اور میں نے بڑی مشکل سے پل پر سے کار گذاری-

مت ماری جانا: ڈاکونے اپنی بہن کو سمجھاتے ہوئے کہا تم مفت میں میرے ساتھ مت ماری جانا-

پوپھٹنا : جنگل میں شیر کو دیکھتے ہی میری پوپھٹ گئی-[68]

اس قسم کے تجربوں سے گذرے ہیں اور یہ یادرکھنے قابل ہی تو ہیں- بھلا یہ بھلادیئے تھوڑی جائینگے- البتہ آج کے تعلیمی ادارے، خواہ وہ پاکستان ہوکے ہندوستان تقریباً ایک سے ہوگئے ہیں- اور ان کی ایک دوڑ لگی ہوئی کہ خانگی اداروں میں تعلیم حاصل کرنا باعث فخر ہوگیاہے- اور خود حیدرقریشی فرماتے ہیں کہ میں ایک سرکاری اسکول سے فارغ طالب علم مگر اتنے غیر معمولی کالج میں پڑھارہاتھا جہاں لکھ پتی اور کروڑ پتیوں کے بچے تعلیم حاصل کرتے - لکھتے ہیں:

"میری تعلیم سرکاری اسکولوں کے جس ماحول میں ہوئی تھی- پاکستان انٹرنیشنل پبلک اسکول اینڈ کالج کا ماحول اس سے بالکل مختلف تھا- اعلیٰ تعلیمی معیار کی حامل اس درسگاہ میں لکھ پتیوں اور کروڑ پتیوں کے بچے زیادہ تھے- میں ٹاٹ اسکول سے اپنی پڑھائی شروع کرنے والا- انگلش میڈیم ماحول میں پڑھا رہاتھا- وہ بھی زندگی کا ایک تجربہ تھا اور یہ بھی زندگی کا ایک تجربہ تھا"-[69]

"بندہء مزدور کی اوقات"

---

[68] عمر لاحاصل کا حاصل، صفحہ نمبر ۱۷٤

[69] عمر لاحاصل کا حاصل، صفحہ ۱۷٤

اس مضمون میں حیدرقریشی نے اپنی پہلی ملازمت جو ایک شوگر فیکٹری سے شروع کردی تھی اور وہ بھی اپنے والد کا ہاتھ بٹانے کیلئے اور اپنے دیگر برادران کی تعلیم کی غرض سے انھوں نے میٹرک پر ہی تعلیم سلسلہ کو منقطع کردیاتھا۔ اس شوگر فیکٹری کے حالات اور شفٹ وائز ڈیوٹی اور ٹریڈیونین کے جھگڑے وغیرہ کا ذکر یہاں ہوا۔ جس سے ان کی زندگی کے تلخ تجربے اور حقیقتیں سامنے آتے ہیں۔ دوسرا یہ کہ اس کارخانہ حیات میں امراء اور غرباء یا اہل ثروت اور مزدور کے مابین کیا فرق ہے واضح ہوجاتاہے۔ اس کے ساتھ ساتھ یہ بھی ہوتاہے کہ حکومت اور حکمران طبقہ کسطرح ان امراء کا ساتھ دیتے ہیں اور مزدوروں کو کن مشکلات سے گذرنا پڑتاہے۔ یہ سب کچھ فلموں میں دیکھایاجاتاہے۔ مگر حقیقت میں انھوں نے اس کو بھگتا اور انھیں کو سپرد قلم کردیا۔

"گراموفون سے سی ڈی تک"

اس مضمون میں پوری نصف صدی کا قصہ درآیاہے۔ اپنے بچپن سے لے کر اپنے بچوں کے اور اپنے پوتے اور نواسوں کے بچپن تک کا۔ جب یہ بچہ تھے تو گراموفون انھوں نے دیکھا تھا۔ ان کے باباجی گراموفون کے قریب بیٹھے کچھ رکارڈز پھیلارکھے تھے۔ شاید اپنی پسند کے ریکارڈ الگ کررہے تھے۔ تھوڑی دیر کے لئے وہ اٹھ کر چلے گئے تو یہ ابھی بچہ تھے وہاں بیٹھے اور پھر گھٹنوں کے بل ایک طرف بڑھے تو چار پانچ گراموفون ریکارڈز گھٹنے کے نیچے آکر ٹوٹ گئے۔ اس پر انکے باباجی نے انھیں ڈانٹا نہیں۔ مگر پریشان ضرور ہوئے۔ کہتے ہیں ایک عرصہ بعد اس کا تذکرہ اس انداز میں کرنے لگے۔

> "ایک عرصہ بعد باباجی میری اس غلطی کو یوں مزے سے بتایا کرتے جیسے میں نے کوئی کارنامہ انجام دیاتھا۔ زندگی بھر تو مجھ سے ڈھنگ کا کوئی کام نہیں ہوسکا۔ تاہم اتنا تو میں کہہ



سکتاہوں کہ میں نے اپنے بچپن میں ہی چار پانچ ریکارڈز توڑدیئے تھے۔ یہ غالباً 1957-58 کا زمانہ تھا"۔[70]

اتناہی نہیں اس مضمون میں مختلف حوالوں سے گراموفون سے سی ڈی تک کے سفر کا ارتقائی اور تدریجی عمل کو بھی اچھے طریقے سے سنایاہے۔ ان میں رونماہونے والی تبدیلیوں کو کچھ اس انداز میں بتایا کہ

"گراموفون اور ریڈیو کے زمانے میں گویا ایک انقلاب سا حائل تھا۔ ٹی وی نے آکر پہلے تو یہ نقاب اتارا، پھر اور بھی بہت کچھ اتاردیا۔ سیٹلائٹ نے کثرت کا ایسا تماشہ دکھایا کہ چینل کا انتخاب کرنا مشکل ہوگیا۔۔۔۔ گراموفون مشین اور سی ڈی پلیئر میں اتنا فرق ہے جتنا بیسویں صدی کی پہلی ربع صدی اور آخری ربع صدی میں فرق ہے۔ زمانہ وہی ہے، صدی وہی ہے، بس گراموفون مشین اب سی ڈی پلیئر کا روپ اختیار کرگئی ہے۔۔۔۔ اور ہاں۔۔۔۔ میری ذاتی زندگی بھی تو گراموفون سے سی ڈی جیسی ہوگئی ہے"۔[71]

"اخلاقی قدریں اور ویاگرا"

اس مضمون میں عنوان ہی سے اندازہ لگایاجاسکتاہے۔ کہ اس میں اخلاقی اقدار کی بابت بات ہوئی، مشرق و مغرب کے مابین فرق کیا ہے اور اب کس قدر ان کی نوعیت بھی بدل رہی ہیں۔

"اخلاق قدروں کا سفر وقت کے ساتھ ساتھ خود ہی اپنے آپ کو بدلتا چلاگیا"[72]

---

[70]عمر لاحاصل کا حاصل، صفحہ نمبر ۱۷۹
[71]عمر لاحاصل کا حاصل، صفحہ ۱۸۲
[72]عمر لاحاصل کا حاصل، صفحہ ۱۸۲

مغرب کے حوالے سے تحریر فرماتے ہیں:

"یورپ میں باہمی رضامندی سے ہونے والا جنسی عمل کوئی سماجی یا اخلاقی مسئلہ نہیں ہے"۔

ان کے علاوہ، دعائیں اور قسمت کے تحت اپنے ذاتی قسم کے عرفانی تجربوں کا ذکر کیاہے۔ پھر شوخیاں؛ بچپنامیں ان کے بچپن کی یادیں اور دیگر رشتہ داروں کا ذکر، علتیں علالتیں میں خود کی کمزوریوں اور بیماریوں کے ذکر کے ساتھ پاکستانی آب و ہوا کی کیفیات پھر جرمنی پہنچنے کے بعد مزید علتوں کا تذکرہ، ان دیکھے پرجانے دوست میں اپنے چاہنے والوں کا تذکرہ اور ان سے خط و کتابت، فون اور انٹرنیٹ کے ذریعہ ان سے روابط کا ذکر کیاہے۔ ابتدائی ادبی زمانے میں جو شرارتیں اور چالاکیاں ہوئیں ان کو بڑے اچھے انداز میں۔ اس کے بعد ادب کی بڑی شخصیتوں سے ملاقاتیں۔ جدید ادب کی اشاعت، دیگر ادباء سے نوک جھونک وغیرہ کا تذکرہ ملتاہے۔

میری عمر کا ایک سال کے تحت جرمنی کے قیام اور اپنی شاعری، جدیدادب کی اشاعت کا تذکرہ ملتاہے۔ ان کے بعد ایک رپورتاژ بعنوان "ماریش میں ورلڈ اردو کانفرنس" تحریر کیاہے۔ اسے پڑھنے سے ایسا لگتاہے کہ اپنے قلم سے حیدرقریشی نے یہ اردو ورلڈ کانفرنس اپنے پڑھنے والوں کو خود کی آنکھوں سے دکھادیاہے۔

غرض یادنگاری بہت دلچسپ تحیریزوں سے مزین ہے۔

* * * * *



سفرنامہ (سوئے حجاز)

حیدرقریشی کا یہ سفرنامہ بہت اہم ہے۔ کیونکہ انہوں نے جو سات عمرے اور ایک حج کیا اس کی مکمل روداد تحریر کردی۔

ادب میں اب تک بہت سارے سفرنامے لکھے گئے۔ اس خیال سے حیدرقریشی فرماتے ہیں کہ "ادب میں بہت اچھے اور بہت برے سفرمانے لکھے گئے"۔ سفرنامہ نگاری کے ایسے ماحول میں میرا سفر نامہ لکھنے کا کوئی ارادہ نہیں تھا۔ کیونکہ میں اچھے سفرناموں کو پڑھ کر خود کو بے مایہ محسوس کرتاہوں اور برے سفرناموں کو پڑھ کر عبرت پکڑتاہوں"۔[73]

اس سفرنامے کے متعلق مختصر ہی سہی مگر بہت جامع انداز میں پروفیسر اکبر حمیدی نے بڑے اچھے انداز میں ذکر کیاہے۔ اور اس کا نچوڑ پیش کردیاہے۔ اور ان کو باقاعدہ نکات کے طورپر ترتیب دیاہے۔

۱۔ یہ سفرنامہ حیدرقریشی کے ظاہری ہی نہیں باطنی اور روحانی سفرنامے بھی ہیں۔

۲۔ ان سفرناموں میں ان کیفیات کو والہانہ اظہار ہے جو اس دوران حیدرقریشی کو محسوس ہوتی رہیں۔

۳۔ ان سفرناموں میں ان مقامات کے تاریخی پس منظر بھی بیان کئے گئے ہیں جو مصنف کے مشاہدے میں آئے یا جہاں جہاں سے وہ عمرہ اور حج کی ادائیگی کے دوران گزرتے رہے۔ یہ تاریخی پس منظر محض مذہبی نقطہ نظر ہی نہیں رکھتے بلکہ تاریخی اور جغرافیائی حوالے بھی بنتے دکھائی دیتے ہیں۔ جن کی اس لئے بھی خاص اہمیت

---

[73] عمرلاحاصل کا حاصل، صفحہ نمبر ۲۳۳



ہے کہ جو لوگ مسلمان نہیں ہیں وہ بھی علمی سطح پر ان معلومات سے مستفید ہوسکتے ہیں۔ یوں یہ سفرنامہ محض مذہبی حیثیت ہی نہیں رکھتا جو ہمارے نزدیک نہایت قابل قدر ہے۔ بلکہ ایک تاریخی اور علمی حیثیت بھی رکھتاہے۔ جو ان لوگوں کیلئے بھی ہے جو مذہب اسلام سے تعلق نہیں رکھتے، جنھیں مذہب سے زیادہ دلچسپی نہیں ہے۔

٤۔ اس سفرنامے میں ان مشکلات کا بھی ذکر ہے جو دوران حج یا عمرہ پیش آتے ہیں۔ اس سفرنامے کے ذریعہ وہ ان متوقع مشکلات کی پیش بندی کا اہتمام بھی کرسکتے ہیں۔

٥۔ تاریخی اعتبار سے یہ سفرنامہ معلومات کا خزانہ ہے جس کے گہرے مطالعے سے وہاں کے اہم مقامات کے بارے میں قیمتی تاریخی معلومات حاصل ہوتی ہیں۔

٦۔ اس سفرنامے میں موضوعات کی رنگارنگی اور انداز بیان کا بہت لطف شامل ہے۔

٧۔ یہ سفرنامے اپنے صفحات کے لحاظ سے طویل نہیں مگر معنی، معلومات، کیفیات، تاریخی تعارفات، اور پیش آمدہ مسائل و معاملات نیز مشاہدات کے باعث بہت بسیط ہے۔ دیوان غالب کی طرح جو حجم میں قلیل ہے مگر معنی میں طویل۔ [74]

ان تمام خیالات کے تناظر میں دیکھاجائے تو یہ سفر نامہ واقعی بہت عمدہ اور اپنی جانب راغب کرنے والاہے۔ اس میں ادبیت بھی درآئی ہے، جذباتیت بھی، عشق بھی ہے۔ اور حسن بھی، غرض بہت عمدہ ہے۔

* * * * *

[74] عکاس، حیدرقریشی نمبر۔ کتاب نمبر ٤، ٢٠٠٥، صفحہ نمبر ٥٩، ٦٠،اور ٦١۔

حیدرقریشی : جہت نقد و تحقیق

"تنقید" ادب کا یہ وہ گوشہ ہے جہاں اچھے اور نکھرے ہوئے فکری فن پارے ادب کے قاری کے سامنے آجاتے ہیں۔ فن پارے کو پرکھنے اور اس کے وقار کو برقرر رکھنے ونیز اس کی قدرکا تعین کرنے میں تنقید کا اہم رول ہوتاہے۔ تنقید کے بغیر فن پارے کی قدرکا تعین ممکن ہی نہیں ہے۔ ہر فنکار اپنے فن کو پیش کرنے کیلئے اس تنقید ی شعور کا رہون منت ہوتاہے۔ جبکہ زمانی و مکانی اعتبار سے ہوکہ، زبان اور اسلوب کے اعتبار سے اسے پرکھنے کا کام نقاد کا ہوتاہے۔ ادب کی طرح تنقید کےبھی کئی اقسام ملتے ہیں۔ بہرحال ہمیں اس بحث میں پڑنا نہیں ہے۔ کیونکہ ادب کا ایک عام قاری بھی جانتاہے۔ مگر اس میں کوئی شک نہیں کہ تنقید غیر جانبدار ہو تو یقیناً ادب کو جلا بخشنے والی ہوسکتی ہے ورنہ اسکو جلابھی سکتی ہے۔ کیونکہ اب صورتحال کچھ ایسی ہوگئی ہے جہاں سکہ بند نقاد سامنے آرہے ہیں۔ اور انھیں ادب سے نہیں بلکہ کسی اور سے سروکار ہے تو ایسی صورت میں جانبدارانہ سطح سے کام لے کر ادب کو نقصان پہنچایا جارہاہے۔ (بلکہ پہنچایاگیاہے) یہ کسی بھی صورت مناسب نہیں۔

تنقید کے متعلق مختلف آراملتی ہیں۔ مگر ایلیٹ کا وہ قول بہت مناسب لگتاہے جسے اس نے زندگی اور سانس کے باہمی رشتہ سے استوار کیاہے یعنی اس نے کہا تھا کہ — "ادب کیلئے تنقید اتنی ہی ضروری ہے جتنی کے زندگی کیلئے سانس" اب اگر کوئی سانس بھی مصنوعی لے رہاہو تو وہ زندگی بھی بھلا کس کام کی جس میں نہ تحرک ہوگا اور نہ وہ کچھ کرسکے گا۔ اسی لئے تنقید بھی مصنوعی نہ ہوکر قدرتی ہو تو اس میں زندگی کے آثار بھی نمایاں رہیں گے اور اس میں تحرک بھی رہیگا۔

اچھی اور غیرجانبدارانہ تنقید ادب میں اضافے کا باعث بن سکتی ہے۔ یہ جہاں ادب کی تفہیم میں معاون ثابت ہوتی ہے وہیں ادب کو ایک نئی راہ اور منزل سے آشنا بھی کرتی ہے۔ ادب کی



گتھیوں کو سلجھاتی ہوئی اپنے قاری کو مطمئن کرانے میں کامیاب ہوتی ہے۔ یہ تشریح کا کام بھی کرتی ہے اور تفہیم کا بھی، تفسیر کا کام بھی کرتی ہے اور تحلیل کا بھی۔ ادب کو ایک نئے منظر سے آشنا بھی کرتی ہے۔

چنانچہ اس تناظر میں ہم حیدرقریشی کا جائزہ لیتے ہیں تو محسوس ہوتاہے کہ حیدرقریشی کی تنقید وہی تنقید کہلاتی ہے۔ جسے ہم ادب میں اضافے کا باعث قرار دے سکتے ہیں۔ یہ بنیادی طورپر ایک تخلیق کار ہیں اور ہر تخلیق کار تنقیدی شعور سے متمتع ہوتاہے۔ پھر حیدرقریشی جس نے ادب کی تقریباً اصناف پر طبع آزمائی کی۔ اور نہ صرف طبع آزمائی کی بلکہ اپنے عصر کے اہم نقادوں کو اپنی طرف متوجہ کیا۔ اور جو شخص یا جو فنکار اپنے عہد کے نقادوں کو اپنی طرف متوجہ کرنے میں کامیاب ہووہ بذات خود ایک اہم فنکار کہلاتاہے۔ اور یہ ساری خوبیاں حیدرقریشی میں بدرجہ اتم موجود ہیں۔ چنانچہ وہ فنکار ہے تو ایک مثبت فکر رکھنے والا وہ فنکار بھلا تنقیدی شعور یا فکر سے پرے کیسے رہ سکتا۔ یہ ممکن ہی نہیں۔ جسے کہ کہاگیاہے کہ وہ مثبت اور سچی فکر رکھنے والا فنکار ہے تو اچھا نقاد بھی ہے۔ اچھا نقاد ان معنوں میں کہ ان کے تنقیدی مضامین ہوں کہ کتب پر تبصرےوہ ہرلحاظ سے اہم نظر آتے ہیں۔ اور ہاں ان کی تنقیدی کاوشوں کو دیکھنے سے اندازہ ہوتاہے کہ وہ بے جانہ کسی کی تعریف کرتے ہیں اور نہ کسی پر طنز۔ وہ تو اصولی بات کرتے نظر آتے ہیں اور ادب کے کسی بھی پہلو کو ہاتھ سے جانے نہیں دیتے۔ اسطرح بااخلاق، باکردار، بے لاگ اور شفاف تنقید حیدرقریشی کی پہچان بنتی ہے۔

حیدرقریشی نے تنقیدی میدان میں بہت اثاثہ چھوڑا ہے۔ جو اسطرح ہے:

۱۔ وزیر آغا : عہد ساز شخصیت
۲۔ اردو میں ماہیا نگاری
۳۔ اردو ماہیےکی تحریک
٤۔ اردو ماہیے کے بانی : ہمت رائے شرما
۵۔ تاثرات



٦۔ حاصل مطالعہ
٧۔ ڈاکٹر گوپی چند نارنگ اور مابعد جدیدیت
٨۔ اردو ماہیا (پیش لفظ)
٩۔ اردو ماہیا۔ تحقیق و تنقید (ماہیاکی تحقیق و تنقید کی پانچوں کتابیں ایک جلد میں

ان کے علاوہ تنقیدی مضامین کی ایک لمبی فہرست ہے۔ جو دنیا بھر کے رسائل اور جرائد، انٹرنیٹ، اخبارات اور خود کے جریدے جدید ادب میں شائع ہوئے ہیں۔ ان تمام سے حیدرقریشی کی نہ صرف تنقیدی صلاحیت کا اندازہ ہوتاہے بلکہ، انکی مثبت فکر، فن پر گہری نظر، ادب پر اور زبان و بیان پر دسترس عیاں ہوتی ہے۔

وزیرآغا۔ عہد ساز شخصیت

"ڈاکٹر وزیر آغا" دنیائے ادب میں کسی تعارف کی محتاج نہیں۔ ان کی معیت میں ادبی سفر کرنا بذات خود ایک معتبر کام ہے۔ اور وہ حیدرقریشی کے حصہ میں آیا۔ وہ بڑے ہی خوش بخت رہے اس معاملے میں کہ وزیر آغا جیسی عبقری اور نابغہ روزگار شخصیت کے زیرسایہ ان کی ادبی تربیت ہوتی رہی اور ان کی شخصیت پروان چڑھی۔ جس کا برملا اعتراف واظہار حیدرقریشی نے جابجا نثر میں بھی کیا اور شاعری میں بھی۔

سارے اساتذہ ہیں مجھے محترم مگر
غالبؔ کا معتقد ہوں محبت ہے میر سے
حیدرنئے ادب میں تو گھائل انہیں کا ہوں
رشتہ بہت ہی گہرا ہے آغا وزیر

سے[75]

چنانچہ تنقیدی سفر کا آغاز ہی وزیر آغا ایک عہد ساز شخصیت سے ہوتاہے۔ یہ کتاب دراصل حیدرقریشی کے تنقیدی مضامین پر مشتمل ہے۔ ویسے یہاں یہ تذکرہ بے جانہ ہوگا کہ وزیرآغاکی اب تک 90سے زائد کتب منظر عام پر آئیں۔ جن میں ادب کی تقریباً اصناف پر مشتمل اور پاکستان میں یہ انشائیہ کے بانی قرار دیئے گئے ہیں۔ انگریزی میں بھی 15 کتب منظر عام پر آئیں۔ خیر، ایسی نابغہ روزگا رشخصیت کے فن پر حیدرقریشی نے جو مضامین لکھے ان کو یکجا کرکے کتابی صورت میں شائع کروائی یہ کتاب 1995ء میں نایاب پبلی کیشنز، خان پور سے شائع ہوئی۔ اس کے ابتدائیہ میں وہ یوں رقمطراز ہیں:

"ڈاکٹر وزیرآغا ہمارے ادب کی عہدساز شخصیت ہیں۔ عہد ساز شخصیت کے الفاظ میں نے محبت یا مروت میں نہیں لکھے بلکہ ایک حقیقت بیان کی ہے۔ یوں ان کے مجموعی ادبی کارکردگی کے اثرات پاکستان اور ہندوستان کے ادب پر اتنے نمایاں ہیں کہ سنجیدہ ترقی پسند ناقدین نے بھی برملا طورپر اس کا اقرار کیاہے۔ تاہم جیسے جیسے وقت گزرے گا ان کے گہرے اثرات کا دائرہ وسیع ترہوتاجائے گا"۔[76]

اسی کتاب کے دوسرے ایڈیشن 2011ء کے عرض حال میں کچھ اسطرح رطب اللسان ہیں:

"میں نے اپنی ابتدائی ادبی زندگی میں وقفہ وقفہ سے ڈاکٹر وزیرآغا کی

---

75 عمر لاحاصل کا حاصل ص ۳۳

76 ڈاکٹر وزیرآغا۔ عہدساز شخصیت (دوسرا ایڈیشن ۲۰۱۱) ص ۱۲ غیرمطبوعہ

شخصی، فکری اور مختلف تخلیقی جہات پر مضامین لکھے تھے۔ یہ مضامین ایک وقفہ کے بعد 1995ء میں ڈاکٹر وزیر آغا۔ عہد ساز شخصیت" کے نام سے کتابی صورت میں شائع کئے گئے۔ اب ڈاکٹر وزیرآغا 18/مئی 2011ء کو 89 ویں برس کے ہوکر 90ویں برس میں قدم رکھ رہے ہیں تو 90ویں برس کے پہلے دن ہی میں ان کی 90ویں سالگرہ کے استقبال کے طورپر اپنی اسی کتاب کا نیا ایڈیشن نئے اضافوں کے ساتھ پیش کررہاہوں"۔[77]

اسی عرض حال میں وہ آگے یوں لکھتے ہیں:

"میں پورے وثوق سے لکھ رہاہوں کہ ڈاکٹر وزیرآغا کے مخالفین میں سے پچانوے فیصد ایسے لوگ ہیں۔ جنہوں نے انھیں پڑھے بغیر ان کی مخالفت میں اخباری سطح کی جملہ بازی کی۔ جن لوگوں نے وزیر آغا کو کچھ پڑھنے کے بعد مخالفت کی، ان میں شروع سے لے کر اب تک (یعنی 2011 تک) ایسے مخالفین شامل تھے جو جملہ علوم سے بے بہرہ محض کسی ایک علم تک محدود تھے اور اس میں بھی ان کا مطالعہ درسی نوعیت کا تھا۔ موسیقی سے لے کر نفسیات و فلسفہ تک کے جن طلبہ نے اس قسم کا کار خیر انجام دیا ان کے رویے پر مجھے وہ مثال یاد آگئی کہ مختلف لوگوں کی آنکھوں پر پٹی باندھ کر انھیں ہاتھی کو چھوکر بتانا تھا کہ ہاتھی کیسا ہوتاہے؟ چنانچہ کسی کو ہاتھ بڑے کان

[77] ڈاکٹر وزیرآغا۔ عہدساز شخصیت (دوسرا ایڈیشن ۲۰۱۱)ص ۹ غیر مطبوعہ

والا سجھائی دیا تو کسی کو ٹھوس ستون جیسا، کسی لجلجاسا محسوس ہوا تو کسی کو پہاڑ جیسا۔ یعنی جس نے اپنا ہاتھ جہاں مس کیا اس نے صرف اتناہی اسے سمجھ لیا۔ وزیرآغاکے معاملے میں پڑھے لکھے کہلانے والوں کی طرف سے یہی خرابی ہوئی کہ کسی ایک شعبہ میں ہلدی کی گانٹھ ملنے پر پنساری بن بیٹھنے والوں نے وزیرآغا کو کھلی آنکھوں سے دیکھنے کی بجائے اپنے اپنے محدود نصابی دائرے کی پٹی باندھ کر انہیں دیکھنے کی کاوش کی۔ یوں وزیرآغاکے ہاں دریا میں کوزے کو بند کرنے کا متزاجی منظر دیکھنے کی بجائے یار لوگ اپنے کوزوں میں سے دریا بہانے کے منظر دکھاکر اپنی شعبدہ بازی پر خود ہی بغلیں بجاتے رہ گئے۔[78]

اس بیان سے اندازہ ہوتاہے کہ وزیرآغا کی شخصیت کسی اور کسقدر وسیع رہی۔ اور انھیں قریب سے دیکھنے اور پرکھنے کے ساتھ ساتھ انھیں پڑھ کر، سمجھ کر اور مخالفین کی صف میں سے مجاہدانہ گزرکر اپنی ایک راہ بنانا یقیناً حیدرقریشی کو دشوار تھا۔ مگر انھوں نے اس کی پرواہ کئے بغیر اپنی راہ نکالی اور وزیر آغا کے فن پر کھل کر لکھا۔

اس کتاب میں جملہ 13 مضامین ہیں۔ وہ اس طرح ہیں:

۱۔ مختصر کوائف ڈاکٹر وزیرآغا۔
۲۔ عہد ساز شخصیت۔
۳۔ شام کی منڈیر سے
٤۔ دونظموں کا مطالعہ
٥۔ چہک اٹھی لفظوں کی چھاگل
٦۔ وزیرآغا کی غزلیں
۷۔ پہلاورق
۸۔ اردو انشائیہ اور اس کے بانی کی انشائیہ نگاری

78 ڈاکٹر وزیرآغا۔ عہدساز شخصیت (دوسرا ایڈیشن ۲۰۱۱)ص ۱۰

۹۔ ڈاکٹر وزیرآغا کی تنقید نگاری کا اجمالی جائزہ
۱۰۔ ڈاکٹر وزیر آغا ایک مطالعہ
۱۱۔ وزیرآغا سے کچھ باتیں
۱۲۔ اوراق اور ماہیا
۱۳۔ اوراق اور میں

ان مضامین کو دیکھنے سے اندازہ ہوتاہے کہ وزیرآغا کی شخصیت کس قدر گہری اور ادب کی فنی اور فکری جہتوں سے آشنا اور ادبی منظر نامہ کے ساتھ ساتھ عصری تقاضوں اور بدلتے رجحانات سے واقف اور علمی ادب پر گہری نظر رکھنے والی شخصیت تھی۔ ان کی مطالعہ کے لئے بھی ادب پر گہری نظر رکھنا ضروری ہوجاتاہے۔ ساتھ ہی عالمی ادب کے منظر نامے سے واقف ہونا بھی ازحدضروری ہوتاہے اور وہ حیدرقریشی میں ہمیں نظر آتی ہے۔ حیدرقریشی نے نہ صرف وزیرآغا کا مطالعہ کیا بلکہ ان کے ادب کو پرکھا، جانچا اور پھر لکھا۔ لکھا اور بہت خوب لکھا۔ وزیرآغا کی خوبی یہ تھی کہ اپنے دوستوں کو مطالعہ کی طرف توجہ دلانے اور ان کا انداز بھی کیسا ملاحظہ کیجئے:

"ڈاکٹر وزیرآغا میں ایک خوبی یہ ہے کہ اپنے دوستوں کو مطالعہ کی طرف توجہ دلاتے رہتے ہیں۔ عالمی ادب اور بالخصوص انگریزی ادب کی رفتار سے باخبر رہنے کی تلقین کرتے ہیں"[79]

وزیرآغا کی شخصیت کا ایک اور پہلو یہ بھی دیکھئے۔ حیدرقریشی فرماتے ہیں:

"۔۔۔وزیرآغا باغ و بہار شخصیت کے مالک ہیں۔ شگفتگی ان کے مزاج کا حصہ ہے۔ لطیفہ

[79] ڈاکٹر وزیرآغا عہد ساز شخصیت : دوسرا ایڈیشن غیر مطبوعہ ص ۲۳



بازی ہنسنے ہنسانے کا اکتسابی عمل ہے۔ لطیفہ بازادیبوں پر بعض اوقات اس کا اتنا گہرا اثر پڑتاہے کہ ان کی تخلیقات بھی اکتسابی عمل دکھائی دینے لگتی ہیں۔ لطیفہ بازی کی کئی عبرتناک مثالیں لاہور میں موجود ہیں۔ وزیرآغا لطیفہ باز ہیں نہ فقرہ باز۔ وہ توجملہ تخلیق کرتے ہیں اور اس میں ایسا بے ساختہ پن ہوتاہے کہ نشانہ بننے والا بھی لطف اندوز ہوتاہے۔ شاید اس لئے بھی کہ ان کے جملے میں ڈنک نہیں ہوتا"۔ [80]

اس سے اندازہ ہوتاہے کہ وزیرآغا کی شخصیت کیسی تھی۔ وہ تحفظ ذہنی کا شکارنہ تھے۔ اور ہ کسی کو بے جا تکلف پہنچانا ان کا مقصد ہوتاتھا۔

اس مضمون کے آخرپر مضمون نگار نے خلاصہ تحریر کے طوپر وزیرآغا کی تبحرعلمی، اور مشفقانہ انداز کو پیش کرتے ہوئے اپنے قاری کو مشورہ بھی دیا۔

"جولوگ مختلف علوم کے ادب کے ساتھ ربط کی نوعیت کو جاننا چاہتے ہیں انہیں وزیرآغا کی کتب ضرور پڑھنی چاہئے اور طلب زیادہ ہوتو ملاقات بھی کرنی چاہئے۔ علم کے جو ایسے دلدادہ تاحال وزیرآغا کی کتابیں نہیں پڑھ سکے یا ان سے ملاقات نہیں کرسکے ان کے بارے میں یہی کہوں گا:

افسوس تم کو میر ؔسے صحبت نہیں رہی

اردو انشائیہ کے بانی، جدید تر نظم کے پیش رو، اردو تنقید کی منفرد اور عالمانہ آواز، ڈاکٹر وزیرآغا عہدساز شخصیت ہیں، اپنی بعض بشری کمزوریوں کے باوجود ہمارے ادب اور ہمارے عہد کا بہت بڑا سرمایہ ہیں۔ مجھے فخر

---

80 ڈاکٹر وزیرآغا عہد ساز شخصیت : دوسرا ایڈیشن غیر مطبوعہ ص ۲۵



ہے کہ مجھے ان سے کتساب علم اور نیازمندی کا شرف حاصل ہے۔[81]

اس کتاب کے دیگر مضامین میں حیدرقریشی نے وزیرآغا کی مختلف الجہات شخصیت کے گرہوں کو کھولنے کی کوشش کی اور اس میں ہو کامیاب نظر آتے ہیں۔ "شام کی منڈیرسے" یہ وزیرآغا کی خودنوشت سوانح عمری ہے۔ مگر اس میں کیا نہیں ہے۔ اس میں بہت کچھ ہے، ادب، سماج، روحانیت، سائنس وغیرہ وغیرہ۔ حیدرقریشی اس کتاب کے متعلق فرماتے ہیں:

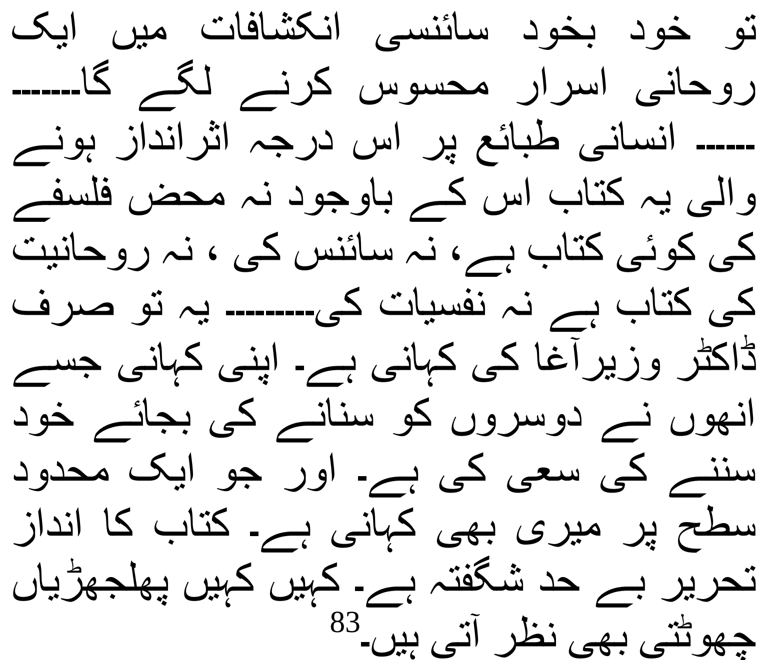
"شام کی منڈیر سے" ادب کے ان قارئین کیلئے گائیڈ بک کا کام بھی کرتی ہے۔ جنھیں عام طورپر یہ شکایت ہے کہ وزیرآغا کی شاعری پوری طرح انھیں سمجھ میں نہیں آتی۔ مجھے یقین ہے اگر ایسے قارئین ایمانداری سے شام کی منڈیر سے پڑھ لیں تو ان کی عدم تفہیم کی شکایت نہ صرف دور ہوجائے گی بلکہ انھیں وزیرآغا کی تصورات کو ان کے حقیقی روپ میں دیکھنے کا موقع بھی ملے گا۔ ان تصورات کو سمجھنا یا نہ سمجھنا پھر ان کی اپنی ذہنی استعداد یا نیت پر منحصر ہے"۔[82]

اتناہی نہیں بلکہ وزیرآغا کی تبحرعلمی کا اندازہ بھی اس خودنوشت سے ہوتاہے کہ ان کا مطالعہ کسقدر گہرا اور وسیع تھا۔ اس ایک کتاب سے اس کا قاری کن کن چیزوں سے متمتع ہوتاہے یہ حیدرقریشی کے خیال کے مطابق کچھ ایساہے:

"اگر کوئی ایسا شخص جسے صرف روحانیت سے دلچسپی ہو اس کتاب کو پڑھے گا تو نہ صرف اپنی دلچسپی کا بہت سارا سامان اس میں پائے گا، بلکہ سائنس اور ادب سے بھی اس کی موانست پیدا ہوجائیگی۔ اسی طرح اگر کوئی سائنس سے دلچسپی رکھنے والا اسے پڑھے گا

---

[81] ڈاکٹر وزیرآغا عہد ساز شخصیت : دوسرا ایڈیشن غیر مطبوعہ ص ٢٦
[82] ڈاکٹر وزیرآغا عہد ساز شخصیت ٢٠١١ء ص ٢٩



> تو خود بخود سائنسی انکشافات میں ایک روحانی اسرار محسوس کرنے لگے گا...... ...... انسانی طبائع پر اس درجہ اثرانداز ہونے والی یہ کتاب اس کے باوجود نہ محض فلسفے کی کوئی کتاب ہے، نہ سائنس کی ، نہ روحانیت کی کتاب ہے نہ نفسیات کی........ یہ تو صرف ڈاکٹر وزیرآغا کی کہانی ہے۔ اپنی کہانی جسے انھوں نے دوسروں کو سنانے کی بجائے خود سننے کی سعی کی ہے۔ اور جو ایک محدود سطح پر میری بھی کہانی ہے۔ کتاب کا انداز تحریر بے حد شگفتہ ہے۔ کہیں کہیں پھلجھڑیاں چھوٹتی بھی نظر آتی ہیں۔[83]

دراصل اس کتاب میں دنیا و جہان کی معلومات درآئی ہیں۔ جس میں علوم بھی ہیں اور فنون بھی، مخالفین کے لئے انتہائی سنجیدہ انداز میں جواب بھی ہے اور اپنے چاہنے والوں کیلئے مژدہ جاں فزابھی۔ اس میں روحانیت بھی سائنسی انکشافات بھی۔ ان کے علاوہ اور کیا کیا ہے اسے حیدرقریشی نے اختتامیہ کے طورپر کچھ اس طرح رقم کیاہے:

> "شام کی منڈیر سے" اپنے اسلوب کے لحاظ سے سوانح عمری، سیاحت نامہ، اور سفر نامہ نگاری کا خوبصورت امتزاج ہے۔ وزیرآغانے عمر رفتہ کو آواز نہیں دی بلکہ اب تک کی بیتی ہوئی زندگی کے نہاں خانے میں اپنے سارے سفر کو دہرایاہے۔ یہ سفر کہیں ایک مسافر کے انداز میں سرہواہے۔ توکہیں کسی سیاح کے روپ میں"۔ [84]

دونظموں کا مطالعہ میں حیدرقریشی نے وزیرآغا کی دونظموں کا جائزہ پیش کیاہے۔ جو طویل نظمیں ہیں۔ ان میں ۱) آدھی صدی ۲) اک کتھا انوکھی، ہے۔

---

83 ڈاکٹر وزیرآغا عہد ساز شخصیت ۲۰۱۱ء ص ۲۹ اور ۳۰

84 ڈاکٹر وزیرآغا عہد ساز شخصیت ۲۰۱۱ء ص ۳۲

ان کے متعلق فرماتے ہیں:

"آدھی صدی کے بعد" وزیرآغا کی منظوم آپ بیتی جبکہ "ایک کتھا انوکھی" منظوم جگ بیتی ہے۔ آپ بیتی کا کمال یہ ہے کہ اس میں جگ بیتی کی ایک زیریں لہر ساتھ ساتھ چلتی ہے۔ جبکہ موجودہ جگ بیتی کا کمال یہ ھیکہ اس میں آپ بیتی کی ایک زیریں لہر ساتھ ساتھ چلتی ہے۔ دونوں نظموں کے سفر اندر کے رستے سے طے ہوئے ہیں۔ آدھی صدی کے بعد میں پانی کا دھارا ایک تمثیل کے طورپر آیاہے جو جھرنا، ندی اور دریا کے چینل سے گزرکر سمندر کا روپ بنتاہے"۔ اک کتھا انوکھی" میں بھی ابتداً پانی کے طوفان کا ذکر آیاہے۔"[85]

ان نظموں کے جائزے سےحیدرقریشی کی تبحرعلمی کا اندازہ ہوتاہے کہ ان میں مستعمل تلمیحات اور تمثیلات کو جس آسان اور عام فہم انداز میں آپ نے سمجھانے کی کوشش کی یہ حیدرقریشی ہی کا خاصہ ہے اور اس سے آپ کے تحقیقی ذہن اور تنقیدی فکر کا اندازہ بخوبی لگایاجاسکتاہے، کیوں کہ وہ خود بتاتے ہیں کہ ان دونوں نظموں کی خوبی یہ ہے کہ اپنے ثقافتی پس منظر سے ابھرتی ہیں اور عالمی ثقافتی دائرہ تک جاتی ہیں۔ ان میں برصغیر کے حوالے درآئے ہیں جیسے، سوئمبر، لچھمن ریکھا، اور یم راج وغیرہ اور برصغیر سے ہٹ کر باہر کے حوالے جن میں یونانی، مصری، سمیری وغیرہ جیسے اوڈیس، قاف، شانگریلا، اور کشمیری حوالے بھی جیسے، ماں پتر، اور کنڈکا نگڑی، اور انکے علاوہ آئس، شمس، زبوس، شیو، وغیرہ تلمیحات اور تمثیلات کا ذکر ہواہے۔ اس سے حیدرقریشی کے تنقیدی فکر کو بھی سراہا جاسکتاہے۔ کہ ان کا مطالعہ کبھی کسقدر گہرا اور وسیع ہے۔

ان سے قطع نظر دیگر مضامین میں وزیرآغا کے مجموعہ کلام "چہک اٹھی لفظوں کی چھاگل" اور ان کی غزلوں پر تبصرہ

85 ڈاکٹروزیر آغا عہد ساز شخصیت ۲۰۱۱ء ص ۳٤

ملتاہے۔ پھر پہلاورق کے تحت وزیرآغا کے عہد آفرین رسالے "اوراق" پر دقیع مضمون ہے۔ ان کے بعد وزیر آغا کے انشائیوں سے متعلق بحث ملتی ہے۔ اور انھیں انشائیہ نگاری کا باقی بتایاگیاہے۔ وزیرآغا کی تنقید نگاری کا اجمالی جائزہ بہت عمدہ مضمون ہے۔ جس میں وزیرآغا کی تنقید کی انفرادیت، انگریزی اور دوسری زبانوں کے علم سے واقفیت، ساتھ ہی سائسی علوم پر گرفت اور فن پارے پر غیر جانبدارانہ تنقیدی افکار عیاں ہوتے ہیں۔ انور سدید کے حوالے سے حیدرقریشی نے وزیرآغا کے ادبی مقا کا تعین یوں کیا۔

> "وہ علمی سطح کے ان عہد ساز ادیبوں کے دوش بدوش کھڑے ہیں۔ جنہوں نے ادب پر اپنے مستقل اثرات ثبت کئے اور تنقیدی مباحث سے اس کا رخ موڑنے کی کوشش کی"۔ [86]

"وزیرآغاسے ایک ملاقات" یہ دراصل انٹرویوہے جس میں عصری ادب، سائنس، فلسفہ، ادب اور خود ان کے ادب پر کھل کر بحث کی گئی اور مدلل جواب دیئے ہیں۔ جس سے ادب کی پرتیں کھل جاتی ہیں۔ آخری دومضامین اوراق اور ماہیا اور اوراق اور میں ان دونوں میں وزیرآغا کی ادارت میں نکلنے والے ماہنامہ اوراق پر لکھے گئے یہ مضامین اہم ہیں۔ جن میں ماہیا پر بحث ہے۔ اور مختلف انداز سے بحث کے علاوہ ثالثی، ہائیکو اور ماہیا کے فرق کو واضح کرنے کے ساتھ ماہیا کے اوزان پر بحث ہے اسطرح سے عالمی طورپر متفقہ رائے زنی اور فی الوقت جن اوزان پر ماہیے لکھے جارہے ہیں کا تعین ہوا۔

غرض یہ کتاب حیدرقریشی کی تنقیدی فکر کو مترشح کرتی ہے۔

* * * * *

86 ڈاکٹر وزیرآغا عہد ساز شخصیت ۲۰۱۱ء ص ۱۳۵

اردومیں ماہیا نگاری

اردو میں ماہیا نگاری حیدرقریشی کی بہت اہم کتاب ہے۔ جس میں تحقیق اور تنقید دونوں پہلو ہیں۔ یعنی اردو ماہیا کے تعین میں حیدرقریشی نے بڑی عرق ریزی سے تحقیق کی ہے۔ اردو ماہیا کے متعلق حیدرقریشی نے جن خیالات کا اظہار کیاہےاس سے ماہیا کی حقیقت سامنے آتی ہے۔ یہ بتایا کہ یہ دراصل پنجابی لوک گیت ہے اور پنجابی میں ماہی، بھینس کو کہتے ہیں۔ بھیس چرانے والا اپنی محبوبہ کی یاد میں جس دھن میں گاتاجاتاہے دراصل وہی ماہیا ہے۔ اس دھن کے مطابق اردو میں اوزان متعین کئے اور اسے باقاعدہ ادبی صنف کا درجہ دلانے میں کوشش کی۔ جو کسی حدتک کارگر بھی رہی۔

اردو میں ماہیہ نگاری کی ابتدا کے بارے میں حیدرقریشی کا یہ موقف کہ آیا چراغ حسن حسرت اور قمر جلاآبادی میں سے کون پہلے ہے۔ جائزہ لیتے ہوئے بحث کی ہے۔ چراغ حسن حسرت کے ماہیوں کے متعلق رقمطراز ہیں:

> "چراغ حسن حسرت نے 1937ء میں پنجابی ماہئے کے حسن سے متاثر ہوکر اردو میں چند ماہیئے کہے--- پنجابی ماہیئے کی جادوگری اور چراغ حسن حسرت کی ماہیئے سے محبت سے انکار نہیں کیاجاسکتا۔ لیکن حسرت پنجابی ماہیئے کے وزن کی نزاکت کا خیال نہیں رکھ سکے"۔[87]

چراغ حسن حسرت اردو ماہیے تو لکھ رہے تھے۔ مگر یہ وزن کے اعتبار سے مناسب نہیں تھے۔ تقریباً ۲۰ سال بعد جوماہیئے ہندوستانی فلموں میں نغمائے گئے جنھیں محمد رفیع اور آشابھونسلے نے گائے تھے وہ فلم پھاگن کے تھے۔ جسے قمرجلال آبادی نے لکھے تھے۔ ان ماہیوں کے متعلق حیدرقریشی

[87]) اردو میں ماہیا نگاری ص ۔۲۱۔



کا یہ خیال کہ یہ پنجابی وزن پر پورے اترنے والے اردو کے پہلے ماہیے قرار دیئے جاسکتے ہیں۔ وہ ماہیئے دراصل یہ ہیں:

تم روٹھ کے مت جانا   کیوں ہوگیا بے گانہ
مجھ سے کیا شکوہ   ترا مرا کیا رشتہ
دیوانہ ہے دیوانہ   یہ تو نے نہیں جانا[88]

ان کے متعلق حیدرقریشی کی یہ رائے ہے کہ

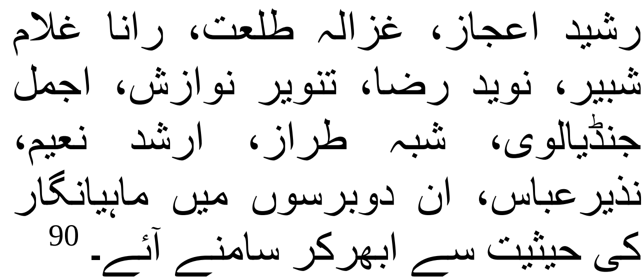
"یہ ماہیے اردو کے سب سے پہلے ماہیئے ہیں جو پنجابی ماہیے کے وزن پر پورے اترتے ہیں۔ اس لحاظ سے قمر جلال آبادی اردو کے سب سے پہلے ماہیا نگار قرار پاتے ہیں"[89]

جب ماہیے پر بحث چھڑی تو اس کے میرکارواں تو حیدرقریشی ہی تھے۔ لیکن اس کارواں کے مسافر مختلف ممالک سے شریک سفر ہوئے۔ اور یہ بحث سالہاسال تک چلی۔ 1992 اور 1993 ان دوسالوں میں مختلف مضامین چھپے اور ان تمام مضامین کا حیدرقریشی نے بڑی عرق ریزی سے جائزہ لیا اور ان مباحث میں حصہ لینے والوں کے نام بھی گنائے اقتباس ملاحظہ ہو:

"1992-93ء اردو ماہیئے کی تاریخ میں اس لحاظ سے بے حد اہم برس ہیں۔ کہ ان دوبرسوں میں ماہیئے کے خدوخال اور مزاج کی بحث کے سلسلے میں نومضامین لکھے گئے اور ہر مضمون میں ہمارے بیان کردہ وزن کو بہرحال تسلیم کیاگیا۔ ان دوبرسوں میں درست وزن میں ماہیا نگاری کی طرف سے بھی پیش قدمی ہوئی۔ امین خیال، سعید شباب، خاور اعجاز، نذیر فتح پوری،

---

[88] اردو میں ماہیا نگاری ص ۲۱
[89] اردو میں ماہیا نگاری ص ۲۲



رشید اعجاز، غزالہ طلعت، رانا غلام شبیر، نوید رضا، تنویر نوازش، اجمل جنڈیالوی، شبہ طراز، ارشد نعیم، نذیرعباس، ان دوبرسوں میں ماہیانگار کی حیثیت سے ابھرکر سامنے آئے۔[90]

اس طرح یہ بحث کا سلسلہ جاری رہا۔ اور حیدرقریشی نے اسے درمیان میں نہیں چھوڑا بلکہ اردو میں ایک صنف کے طورپر جگہ دلانے میں کامیاب رہے۔ چنانچہ 1994تا 1996 کے دوران مختلف مضامین اور ادب دوستوں کے خطوط سے اس میں مزید نکھار لانے اور تجربوں سے آشنا کرنے کیلئے جو مباحث ہوئے اس پر اظہار خیال کرتے ہوئے اس بحث کو خوش کن صورتحال سے تعبیر کرتے ہیں۔ چنانچہ اس بارے میں ان کا خیال ملاحظہ ہو:

"1996ء کے آخر تک ماہیئے کے وزن اور مزاج کو سمجھنے کیلئے اور حقیقت کو واضح کرنے کیلئے جو مخلصانہ کوشش ہوئیں ان سے نہ صرف ان مسئلوں کے کئی پہلوکھل کرسامنے آئے بلکہ اصل حقائق بھی روز روشن کی طرح عیاں ہوگئے------- ماہیے کے مزاج کی تفہیم میں بھی پیش رفت ہوئی۔ وزن اور مزاج کو ملحوظ رکھتے ہوئے ماہیے کے موضوعات میں بتدریج وسعت پیدا ہورہی ہے۔ الفاظ کے برتاؤ میں بھی عمدہ تجربے ہورہے ہیں۔ یہ ساری صورتحال خوش کن ہے۔[91]

---

90 اردو میں ماہیا نگاری ص ۳۹-۴۰

91 اردو میں ماہیا نگاری ص ۵۹



ان تمام مباحث کے بعد تمام احباب یعنی نقاد، مضمون نگار اور ماہیا نگاروں نے جن اوزان کو شرف قبولیت بخشا وہ دراصل یکساں وزن رکھنے والے تین مصرعوں والے ماہیے نہیں کہلائے جاسکتے۔ بلکہ وہی ماہیے، ماہیے کہلائے جاسکتے ہیں جو پنجابی اور عوامی دھن اور لے پر لکھے جائیں۔

اس لئے مندرجہ ذیل اوزان مقرر ہوجاتے ہیں:

فعلن فعلن فعلن
فعلن فعلن فع
فعلن فعلن فعلن

اس کی روسے ماہیے کے دوسرے مصرعہ میں ایک "سبب" یعنی دوحرف کا کم ہونا ضروری ہے۔ اس وزن میں ماہیا پنجابی دھن کے مطابق پوری طرح رواں دواں ہوجاتاہے۔ یہ دوسرا وزن بھی ماہیے کیلئے قابل قبول ہے۔

مفعول مفاعیلن
فعل مفاعیلن
مفعول مفاعیلن[92]

"ہمارے ماہیانگار" اس مضمون میں حیدرقریشی نے اردو ادب کے ماہیانگاروں کے نام کی کل تعداد بتاتے ہوئے "قاضی اعجاز محور سے شاہدہ ناز تک درج ماہیا نگاروں کی تعداد 62 بنتی ہے۔ اس تعداد میں قمر جلال آبادی۔ ساحر لدھیانوی اور حیدرقریشی کے نام بھی شامل کرلیں تو تادم تحریر ماہیا نگاروں کی تعداد 65 تک جاپہنچتی ہے۔ ان ماہیانگاروں میں قمرجلال آبادی اور

---

92 اردومیں ماہیا نگاری ص ٦٠



ساحر لدھیانوی کواردو ماہیے کے بانی قرار دیاجاسکتاہے۔[93]

دیگر مضامین میں حیدرقریشی اردو ماہیا کے متعلق بہت مطمئن نظرآتے ہیں۔ مطمئن ان معنوں میں کہ بہرحال تمام ماہیانگاروں نے اس سے اتفاق کرلیا کہ اس کے وزن میں دوسرے مصرعے میں بہرحال ایک سبب کی کمی ہو۔ اور آئندہ ان میں مزید نکھار پیدا کرنے کی کوشش ہوتی رہے گی اور اس میں تجربات ہوتے رہیں گے تاسے مزید تقویت ملے اور ادب میں بطور ایک صنف رائج ہوجائے۔ اور لکھتے ہیں:

"اردومیں ماہیانگاری " کا یہ اختتامیہ ماہیے کی بحث کا اختتام نہیں ہے بلکہ علمی، ادبی اور تحقیق زبان میں بات کرنے والوں کیلئے ایک بڑی سطح پر یہ نقطہ آغاز ہے۔ مجھے امید ہے کہ ماہیے کے خدوخال کو نکھارنے اور سنوارنے کیلئے تخلیقی اور تحقیقی دونوں لحاظ سے مزید پیش رفت ہوگی"۔[94]

اسطرح ماہیا نگاری کے میدان میں حیدرقریشی کی کوششوں اور کاوشوں کو تسلیم کرتے ہوئے، انھیں سراہتے ہوئے عارف فرہاد یوں گویا ہیں:

"مجھ سمیت ماہیا نگاروں کا پورا قبیلہ اس بات کو تسلیم کرچکاہے کہ حیدرقریشی نے ماہیا نگاروں کو درست وزن کی نشاندہی کرانے کے ساتھ ساتھ اردو ادب کی تاریخ میں ماہیے کی ہیئت، مزاج اور وزن کے حوالے سے انفرادی نوعیت کا نہایت اہم تحقیق اور تنقیدی کام کیاہے۔"[95]

---

93 اردو میں ماہیا نگاری ص ۷٦
94 اردومیں ماہیا نگاری ص ۱۵۷
95 اردو میں ماہیا نگاری ص ۳۳



* * * * *

اردو ماہیے کی تحریک

یہ کتاب 1996ء میں فرہاد پبلی کیشنز، راولپنڈی سے شائع ہوئی۔ جس کو اردو ماہیے کی بانی ہمت رائے شرما کے نام منسوب کیاہے۔ یہ مختصر سی کتاب بڑی دقیع ہے جس میں ماہیا کے متعلق معلومات کے علاوہ دیگر شعراء کو اس جانب متوجہ کیاہے۔ اور یہ کتاب دراصل پہلی کتاب اردو میں ماہیا نگاری کی توسیع معلوم ہوتی ہے۔ اس کتاب کے حرف اول میں وہ خود رقم کرتے ہیں کہ:

"اردو میں ماہیانگاری" ایک موضوع کتاب تھی۔ اسے لکھتے وقت میں 1996 ء کے پائیدان پر کھڑا ہوکر گزشتہ چھے برسوں کی بحث کا منظر دیکھ رہاتھا۔ جب کہ "اردو ماہیے کی تحریک" کے مضامین فاصلے سے منظر کو دیکھانے کی بجائے لمحہ لمحہ کہانی سناتے ہیں۔ ماہیے کی بحث کے ریکارڈ کی درستی کیلئے چند اہم خطوط بھی اس مجموعہ میں شامل ہیں۔ ان مضامین اور خطوط سے اندازہ کیاجاسکتاہے کہ ماہیے کو سمجھنے کے عمل میں بتدریج بہتری آتی گئی۔[96]

یہ بحث 1996ء تک چلتی رہی اور مختلف جگہوں سے حیدرقریشی سے سوالات کی بوچھاڑ بھی ہوئی۔ مگر انھوں نے کبھی جذباتیت سے کام نہ لیا بلکہ سنجیدگی کو ہاتھ سے جانے نہیں دیا۔ اگر کبھی کہیں ان کے موقف

[96] اردو ماہیے کی تحریک ص ۷



کی مخالفت ہوئی اور وہ درست ہے تو اسے ماننے میں دریخ بھی نہیں کیا۔ بلاتوقف مان بھی لیتے یہ ایک اچھے اور سچے فنکار، نقاد اور محقق کا طریقہ کار ہوتاہے۔ کیونکہ جو چیز اپنی دسترس سے باہر ہو اور بعد میں وہ منظر عام پر آئے بلاشبہ ایک محقق اسے مان لیتاہے۔ وہ ہٹ دھرمی پر جمانہیں ہوتاہے۔ اس کے ہاں لچک ہوتی ہے۔ اور حسن و قبح کے پرکھنے کا معیار ہوتاہے۔ یہی وہ چیزیں حیدرقریشی میں نظر آتی ہیں۔ دوسال پہلے تک جو بحث چلی تھی اور انہوں نے اسے کتابی صورت میں بھی لایاتھا۔ اور اب وہی بحث پھر سے طول پکڑلی تو انہوں نے مزید شواہد کی بنیادوں پر مدلل اور مسکت جوابات بھی دیئے اور اپنا موقف بھی ظاہر کردیا۔ ماہیا کو حیدرقریشی نے لوک شاعری سے تعبیر کیا ور کہا کہ "ایسے تمام اردو ماہیے جو پنجابی ماہیے کی دھن پر آسانی سے گنگنائے جاسکتے ہیں وہی درست ماہیے ہیں۔ ارو میں تین یکساں مصرعوں کے ثلاثی کو اور جو نام دے دیاجائے، لیکن وہ ماہیے نہیں ہیں۔ [97]

جہاں تک ماہیے کے وزن کا تعلق ہے کئی افراد نے اسے مساوی الوزن بتایا تو کسی نے کچھ اور کہا مگر چونکہ حیدرقریشی پنجابی کلچر اور تہذیب سے واقف ہیں تو انہوں نے بتایا اور بیشتر احباب کو اپنا مرید بھی بنالیا کہ اس سہ مصرعی نظم کے پہلے اور تیسرے مصرعے کا وزن برابر ہوتاہے جبکہ

[97] اردو ماہیے کی تحریک 1999ء ص ٣٢

دوسرے مصرعے میں ایک سبب یعنی دو حرف کی کمی ہوتی ہے۔ اور یہ دھنوں اور لے کی بنیاد پر آپ نے کیا اور غیرارادی طورپر جنھوں نے اردو میں ماہیے لکھے تھے جو پنجابی دھن کےعین مطابق تھے وہ بھی مثال کے طورپر پیش کردیئے جس سے واضح ہوگیا کہ حیدرقریشی اپنے موقف میں درست ہیں۔

وزن سے متعلق کیا فرماتے ہیں حیدرقریشی:

"ماہیے کو گہری نظر سے نہ دیکھا جائے تویہ تین مساوی الوزن مصرعوں کی مختصر نظم دیکھائی دیتی ہے۔ لیکن اس کی مخصوص دھن میں چھپے ہوئے اس کے اصل وزن کو دریافت کیا جائے تو معلوم ہوتاہے کہ اس کا پہلا ور تیسرا مصرعہ مساوی الوزن ہیں لیکن درمیان والا دوسرا مصرعہ اس وزن سے دوحرف کم ہے"۔ [98]

چنانچہ خود کے ماہیوں کے مجموعہ "محبت کے پھول" کے پیش لفظ میں حیدرقریشی رقمطراز ہیں:

"اردو میں ماہیے کا وزن ابھی تک دوصورتوں میں سامنے آیاہے۔ اور یہ دونوں وزن پنجابی ماہیے کے مطابق درست ہیں۔

۱)	فعلن فعلن فعلن	کچھ رشتے ٹوٹ گئے
	فعلن فعلن فع	برتن مٹی کے
	فعلن فعلن فعلن	ہاتھوں سے چھوٹ گئے
۲)	مفعول مفاعیلن	مل مہکی فضاوں سے
	فعل مفاعیلن	یارنکل باہر
	مفعول مفاعیلن	اندر کے خلاؤں سے[99]

98 اردو ماہیے کی تحریک 1999ء ص ۲۵
99 اردو ماہیے کی تحریک 1999ء ص ۳۳،۳٤

اب حیدرقریشی نے ان تمام مباحث کے بعد اپنا فیصلہ بھی ان الفاظ میں سناتے ہیں اور ان تمام شعراء کو جو ماہیا نگاری میں مصروف نظرآتے ہیں انھیں مشورہ بھی دیتے ہیں کہ اب وزن کا معاملہ تو طے ہوگیاہے۔ اب آئندہ اس کے ادبی اور ثقافتی کرار کی اہمیت پر غور کرنا چاہئے۔۔ چانچہ فرماتے ہیں۔

> "پنجابی ماہیے کے وزن والا ماہیا اب ارود میں نہ صرف ٹھیک طرح پہچانا جاچکاہے بلکہ تمام تر مخالفتوں کے باوجود شعراء کرام میں مسلسل مقبولیت بھی حاصل کررہاہے۔ مجھے امید ہے کہ اب ماہیے کی تفہیم اور ترویج کیلئے بات اس کے وزن کی بحث سے آگے بڑھے گی اور ادب میں اس کے ادبی اور ثقافتی کردار کی اہمیت پر غور کیاجائے گا۔[100]

چنانچہ ان مباحث اور جوابات کے تناظر میں اس کتاب کا جائزہ لیاجائے تو یہی محسوس ہوتاہے کہ حیدرقریشی واقعی ایک تحقیقی ذہن رکھنے والی شخصیت ہیں اور تنقیدی فکر بھی اپنا لوہا منواتی نظر آتی ہے۔ ان دونوں کتابوں سے یعنی اردو میں ماہیا نگاری اور اردو ماہیے کی تحریک سے دنیاے ادب حیدرقریشی بحیثیت محقق ہمارے سامنے آتے ہیں اور ادب میں اضافے کا باعث بھی کہ اردو شاعری میں ایک نئی صنف کو ایجاد کیا اور اسکے اوزان بھی متعین کئے اور اس میں مزید تجربے بھی کئے۔ یعنی ماہیا اب صرف عشقیہ بیان تک محدود نہیں رہا اس میں حمدیہ، نعتیہ، منقبتی اور دیگر ثقافتی انداز اور ماحول کے پیش نظر ماہیے لکھنے کا چلن عام ہوگیا۔ اس کیلئے صرف حکم صادر نہیں کیابلکہ حیدرقریشی نے خود یہ کام کردکھایا۔ ان کے تین سو سے زائد ماہیے اس کا منہ بولتا ثبوت ہیں۔ اور وہ تمام کے تمام اس مخصوص پنجابی دھن یا لے اور

---

[100] اردو ماہیے کی تحریک 1999ء ص ۷۹



اردو کے وضع کردہ اوزان میں لکھے گئے۔ یہ کوئی معمولی بات نہیں ہے۔ اسطرح حیدرقریشی پہلے فنکار تو تھے ہی یعنی ان کے اندر ایک فنکار اور نقاد کا ذہن تھا ہی۔ اس کے ساتھ ساتھ اب تحقیق کے میدان میں انہوں نے جو قدم رکھا تو اسے بھی اونچے مقام پر لادیا۔ اور اپنے چاہنے والوں کو اور ماہیا پر طبع آزمائی کرنے والوں کو بتاتے ہیں:

"کہ ماہیا پنجابی لوک گیت ہے۔ اس کی مخصوص لے ہے اور ماہیا اپنی لے کا پابند ہے۔ اگر اس لے کے مطابق کہے گئے ماہیے تحریری صورت میں دیکھ کر کسی کو جھٹکا لگتاہے یا اس کی "موزونی طبع" متاثر ہوتی ہے تو صرف اس لئے کہ اس نے ماہیا لوک گیت کے طورپر نہیں سنا۔ [101]

بہرحال اس کا اثر دنیائے ادب پر یہ ہوا کہ مختصر سے وقت میں کئی ماہیانگار پیدا ہوئے اور اب یہ پنجاب تک محدود نہ رہتے ہوئے اردو کا حصہ بن گئے اور اسطرح اردو کے وسیع اور دقیع میدان میں ان روزان کی معرفت پنجابی لے کے قریب ہوگئے۔ اسطرح حیدرقریشی نے تمام اردو والوں کو اس پنجابی لوک گیت سے آشنا کرانے میں بہت حدتک کامیاب رہے۔ اب ماہیا لکھنے والے کیا پنجاب اور کیا دلی، کیا راجستھان اور کیا مہاراشٹرا، کیا کرناٹک اور کیا آندھرا، کیا لاہور اور کیا کراچی، کیا سندھ اور کیا بلوچستان، کیا امریکہ کناڈا اور کیا ہالینڈ، کیا جرمنی اور کیا لندن غرض اردو والے جہاں موجود ہیں انھوں نے ماہیے کی طرف توجہ دی اور صرف ماہیوں پر ہی کیا موقوف اب ماہیوں کےمجموعے تک منظر عام پر آئے۔ اس میں تنوع بھی آیا۔ یہ حیدرقریشی ہی کی کوششیں اور کاوشیں ہیں۔

اردو ماہیے کے بانی ہمت رائے شرما

اسی سال یعنی 1999ء میں ایک اور کتاب حیدرقریشی نے اپنے ماہیے لکھنے والوں اور چاہنے والوں کے حوالے سے دنیائے ادب کے سامنے پیش کیا۔ اور اس میں انہوں نے ان

---

[101] اردو ماہیے کی تحریک 1999ء ص ۱۰۳



مباحث کے تناظر میں مزید تحقیق کے منظر عام پر آنے کا شکریہ ادا کرتے ہوئے اسے قبول بھی کیا اور اس کا اظہار بھی کردیا۔ اور اس کتاب کو ڈاکٹر مناظر عاشق ہرگانوی کے نام منسوب کیا۔ کیونکہ اب تک کی تحقیق کے مطابق چراغ حسن حسرت اور قمر جلال آبادی کی بابت یہ سمجھا جارہاتھا کہ وہ اردو ماہیے کے بانی ہیں مگر ڈاکٹر مناظر عاشق ہرگانوی نے جب اس طرف توجہ دلائی کے چراغ حسن حسرت اور قمرجلال آبادی اور ساحر لدھیانوی وغیرہ کے اردو ماہیے فلم باغبان 1937ء میں آئے۔ مگر فلم خاموشی 1936 ہمت رائے شرمانے کہے۔ اسطرح ہمت رائے شرما کے ماہیوں کو اولیت کا درجہ ملتاہے۔ اس بیان پر حیدرقریشی نے ہمت رائے شرما سے براہ راست ربط کیا۔ کیوں کے مناظر عاشق ہرگانوی کی تحقیق سے بہت سارے احباب اتفاق نہیں رکھ رہے تھے اور فلم خاموشی کو بجائے 1936 کے 1939 بتارہے تھے۔ جب ہمت رائے شرماسے رابطہ ہوا تو انہوں نے اس کا سال 1936 ہی بتایا۔ اس سے بڑا ثبوت یہ ملا کہ فلم خاموشی کی بک لیٹ پر مئی 1936 کا اندراج تھا۔ جو یہ ثابت کرگیا کہ فلم خاموشی 1936 میں آئی تو اس میں جو ماہیے لکھے گئے وہ ہمت رائے شرما کے تھے۔ س لحاظ سے اب اردو ماہیے کی اولیت کا سہرا بجائے قمرجلال آبادی اور حسرت کے ہمت رائے شرما کے سربندھ گیا۔ اسے حیدرقریشی نے باضابطہ مضمون کی شکل میں بھی پیش کیا اور اسی سال جس سنہ میں ان کی کتاب اردو ماہیے کی تحریک شائع ہوئی یہ کتاب بھی شائع کروادی اور اپنی تحقیق کو مزید آگے بڑھایا۔ اس لئے کہا جاتاہے کہ تحقیق میں کوئی حرف آخر نہیں ہوتا۔ چنانچہ حیدرقریشی نے بغیر کسی تردد کے یہ ثابت کردیا کہ اردو ماہیا کے بانی ہمت رائے شرماہیں۔ اتنا ہی نہیں حیدرقریشی نے ہمت رائے شرم اکے شعری مجموعہ "شہاب ثاقب" کا تنقیدی جائزہ لیتے ہوئے اپنی رائے اسطرح ظاہر کی:

"ہمت رائے شرماجی کا یہ بیان سوفی صد درست ہے کہ شاعری فقیروں کا حصہ ہے، ہمت رائے شرمانے



خوبصورت شاعری کی جب فلمی دنیا میں مقتدرہستی تھے۔ تب اپنے اس فقیری اثاثے کو چھپائے رکھا۔ جب فلمی دنیا سے الگ ہوئے تو اپنا فقیری سرمایہ لے آئے۔ میں سمجھتاہ وں کہ 1964 ء کی بجائے 1984ء میں اپنا مجموعہ چھپوانے کی اصل وجہ یہی فقیرانہ جذبہ تھا"۔[102]

صرف یہی نہیں حیدرقریشی نے شرماجی کے مزید دوکتابوں "ہندومسلمان" اور "نکات زبان دانی" پر بھی اظہار خیال فرمایا۔ اور اس درمیان دونوں کی خط و کتابت ہوئی اسے بھی صفحہ 52پر شامل کیا۔ اور کتاب کے آخر میں شرماجی کے ماہیوں کو بھی درج کیا

ماہیے کہانی ہے — دوپھول گلاب کے ہیں
ماہیے کی دھن میں — پھنگڑا اور ماہیا
ماہیے کی زبانی ہے — تحفے پنجاب کے ہیں[103]

جی کو بہلاتے ہیں — ٹھنڈک بھی حرارت بھی
پیار بھرے ارماں — ہوتی ہے ماہیے میں
ماہیے کہلاتے ہیں — شوخی بھی شرارت بھی
[104]

یہاں ایک بات قابل ذکر یہ کہ حیدرقریشی نے مناظر عاشق ہرگانوی کی تحقیق پر تحقیق کرتے ہوئے شرماجی سے رابطہ کیا اور اس بحث کو آگے بڑھایا بالآخر یہ ثابت کردیا کہ اردو میں ماہیا کے اگر کوئی صحیح بانی ہیں تو وہ ہمت رائے شرما ہی ہیں۔ اس کے جواب میں شرماجی نے اس تحریک کے بانی حیدرقریشی ہیں یہ ایک ماہیے کے ذریعہ بتادیا اس سے بھی

---

102 اردو ماہیاکے بانی۔ ہمت رائے شرما ص ٤٥
103 اردو ماہیاکے بانی۔ ہمت رائے شرما ص٥٣
104 اردو ماہیاکے بانی۔ ہمت رائے شرما ص ٥٤



اندازہ ہوتاہے کہ شرماجی ماہیوں پر کس قدر ندرت رکھتے ہیں۔ ماہیہ ملاحظہ ہو:

فن میں لاثانی ہیں
حیدرماہیے کی
تحریک کے بانی ہیں[105]

ہمت رائے شرما پر اس طرح مکمل شواہد کی بنیاد پر کتاب منظر عام پر لانے حیدرقریشی کے چاہنے والوں نے دل کی گہرائیوں سے انھیں مبارکباد پیش کی۔ ان میں خاص طورپر اس صدی کی محترم شخصیت جو حیدرقریشی کی بھی محترم تھیں جنھیں ادب کی ہر صنف پر کمال حاصل تھا۔ علوم و فنون پر کامل دسترس رکھنے والے، شاعر، انشائیہ نگار، محقق، نقاد، مبصر، سفر نامہ نگار، شخصیت کا نام نامی تھا ڈاکٹر وزیر آغا۔ دیکھئے وہ کیا فرماتے ہیں:

"ہمت رائے شرما پر آپ کا مضمون بہت متوازن ہے اور متاثر کرتاہے۔ آپ کی شاعر، افسانہ نگار، انشائیہ نگار، اور خاکہ نگار کی حیثیت تو پہلے ہی مسلم ہے اور ان اصناف کے سلسلے میں آپ کے دستخط باآسانی پہچانے جاسکتے ہیں مگر اب تنقید کے میدان میں بھی آپ کسی سے پیچھے نہیں رہے بلکہ اگلی صف میں نظر آرہے ہیں"۔[106]

اور ہاں صرف وزیر آغا ہی نہیں ہندوستان کے ایک معروف شاعر اور مدیرنے بھی جن الفاظ میں حیدرقریشی کی ستائش کی ہے وہ خود قابل ستائش ہے۔ کیونکہ ابتداء سے یہ شاعر اور مدیر جن کا نام نامی ہے نذیر فتح پوری، جنکا تعلق شہر پونہ سے ہے۔ اور ان کی کوششوں اور کاوشوں کی وجہ سے ایک مدت سے خاموش بیٹھا فنکار پھر فن کی وادیوں میں لوٹ آیا اور اپنے قلم سے ان خاموش صحراؤں میں ترانے چھیڑتا اپنے مسحور کن

---

105 اردو ماہیاکے بانی۔ ہمت رائے شرما ص ۵۷
106 اردو ماہیاکے بانی۔ ہمت رائے شرما ص پس ورق



لہجوں سے خاموشی کو توڑنے لگا اور زندگی میں نئے رنگ بکھیرنے لگا۔

دیکھئے نظیر فتح پوری کیا فرماتے ہیں:

> "جرمنی میں بیٹھے بیٹھے موصوف نے بمبئی جیسے گنجان شہر میں کھوئے ہمت رائے شرماجی کو دریافت کرکے نئی زندگی عطا کی ہے۔ ہم اسے حیدرقریشی کا مسیحانہ عمل قرار دیتے ہیں کہ 1936 سے فلمی دنیا میں نام کمانے والے شرماجی آج پھر قرطاس وقلم سے منسلک ہوگئے ہیں اور خوبصورت ماہیے کہہ رہے ہیں۔[107]

ان کتابوں سے حیدرقریشی کی تحقیقی اور تنقیدی حیثیت کا اندازہ ہوتاہے۔ اور یہ کام اتنا زبردست رہا کہ اردو ادب ایک نئی صنف سے آشنا ہوا اور یہی حیدرقریشی کی پہچان ہے۔ جبکہ تنقیدی طورپر دیگر اور کتابیں ہیں۔

*****

مضمون

تاثرات (مضامین اور تبصرے)

حیدرقریشی کی تازاکتاب تاثر ات کے عنوان سے ۲۰۱۲ء میں ایجوکیشنل پبلشنگ ہاوس دہلی سے چھپی۔ اس عنوان "تاثرات" کے نتیجے پریکٹ میں (مضامین اورتبصرے) لکھاہواہے۔ اس میں آپ کے جملہ مضامین اور تبصروں کی تعداد ٦٦ ہے۔ اس میں آپ نے جہاں مختلف عوانات کے تحت مضامین لکھے وہیں مختلف اصحاب کی کتب پر تبصرے بھی تحریر فرمائے ہیں۔ ان مضامین اور تبصروں سے حیدرقریشی کی تنقیدی صلاحیت کا اندازہ بخوبی ہوجاتاہے کہ حیدرقریشی نہ صرف اپنے ارد گرد کے حالات پر نظر رکھتے ہیں بلکہ ساری دنیا میں ہورہی اتھل پتھل سے بہت حدتک آگہی رکھتے ہیں۔ مگر

---

[107] حیدرقریشی: فن اور شخصیت : مرتبین: نذیر فتح پوری: سنجے گوڑبولے ص ۲۰



لکھتے وقت میانہ روی کو ملحوظ رکھتے ہوئے لکھتے ہیں۔ کہیں کہیں وہ برانگیخت نظر آتے ہیں۔ اس کی اصل وجہ یہ ہے کہ جس شخص نے چوری کو چوری جانا اس کا برانگیخت ہونا مناسب ہے۔ اور جس نے چوری کو ہنرجانا وہ ضرور اس کا برا منائے گا۔ کسی شاعر کا یہ شعر ان لوگوں پر صادق آتاہے جنہوں نے چوری اور سینہ زوری کو ہنر تسلیم کرلیا۔ یا ذاتی دوستیوں اور تعلقات کو ہی سب کچھ جان لیا۔

ہنسی آتی ہے مجھ کو
حضرت انسان پر
فعل بدتو خود کرے لعنت
کرے شیطان پر

حیدرقریشی نے اس کتاب میں جو پہلا مضمون درج کیا وہ"مغربی ممالک میں اردو ادب کی صورتحال" ہے۔ اس تناظر میں انہوں نے ابتداء میں ایک بادشاہ کے لطیفہ سے آغاز کیا اور راتوں رات عمر کی آخری پڑاؤ میں شاعر اور نثر نگار بننے والوں کے متعلق لکھتے ہوئے ادب کی صورتحال کو پیش کیا۔ چنانچہ لکھتے ہیں:

"...... حقیقتاً یہ ہمارے ادب کا سنگین مسئلہ ہوتاجارہاہے۔ اس کے نتیجہ میں جعلی شاعروں اور ادیبوں کی ایک کھیپ تیار ہوچکی ہے۔ یوں اصل اور نقل میں فرق کرنا مشکل ہوتاجارہاہے۔ مارکیٹنگ سسٹم کی طرح ادب میں بھی نمبردو مال کو اوریجنل ادب کے طورپر پیش کیاجاراہے"۔[108]

---

[108]تاثرات، حیدرقریشی صفحہ ١٣

اس کے معاً بعدایسے حالات کا انہوں نے ذکر کیا ہے کہ جس کو پڑھنے سے ادب کا صورتحال کا اندازہ ہوتاہے کہ آج دنیائے ادب میں کیا کیا ہورہاہے۔ اور کیسے افراد ان کی پشت پناہی میں لگے ہوئے ہیں۔ ملاحظہ فرمائیے۔

"اس المیہ کا ذکر بھی یہاں ناگزیر ہے کہ مغربی ممالک میں جعلی شاعروں اور ادیبوں کی ایک بڑی کھیپ پیدا ہوچکی ہے۔ تارکین وطن میں سے ایک قابل ذکر تعداد ایسے افراد کی ہے جو ایک عرصہ سے مغربی ممالک میں آباد ہیں۔ یہاں کے بڑے مشاعروں میں یہ عبرتناک منظر دیکھنے کو ملتاہے کہ کم از کم ایک تہائی شاعر مکمل بے وزن کلام سنارہے ہوتے ہیں اور داد پارہے ہوتے ہیں۔ رزق کی فراوانی اور نام آوری کے شوق میں بعض نے تو بے وزن شاعری کے مجموعے بھی فخر کےس اتھ چھپوارکھے ہیں۔ ایسے لوگ جتنا ہوتے ہیں اتنا سمجھ میں تو آجاتے ہیں۔ لیکن ان کے دوش بدوش اب ایسے شعراء کی کھیپ تیار ہوچکی ہے، جو چالیس، پچاس سال کی عمر کے بعد یکایک شاعر بن کر نمودار ہوتے ہیں اور دوبرسوں میں ان کے تین چار مجموعے چھپ کر سامنے آجاتے ہیں۔ پاکستان اور انڈیا میں ایسے ضرورت منداستاد شاعر موجود ہیں جو معقول معاوضہ پر پورا شعری مجموعہ لکھ کر دے دیتے ہیں۔ جعلسازی کے فروغ کے اس خطرناک رجحان پر بروقت گرفت نہ کی گئی تو یہاں اصل اور نقل کا فرق کرنا ہی مشکل ہوجائیگا۔ یہ اردو ادب کا جنازہ نکالنے والا کام ہورہاہے۔"[109]

ان حالات کاتذکرہ کرنے کے ساتھ ساتھ مغربی دنیا کے ادب کا جائزہ لیتے ہوئے فرماتے ہیں کہ ان اقتباسات سے میرے موقف کے بارے میں بخوبی اندازہ کیاجاسکتاہے کہ اردو کی نئی بستیوں کی حقیقت کیاہے۔ اور یہاں مثبت رنگ ملے گا۔ اردو کی نئی بستیوں سے کیا مراد ہے خود انھی کی زبانی سنئے:

[109] مطبوعہ ماہنامہ اخبار اردو اسلام آباد، شمارہ اکتوبر ۲۰۰۳، بحوالہ تاثرات صفحہ ۱۳

"برصغیر سے باہر کی تمام پاکش میں جو لوگ اہم ادبی تقریبات کا اہتمام کرتے رہتے ہیں۔ ادب کے تئیں ان کی خدمات قابل تحسین ہیں۔ یہ سلسلہ ماریش سے لے کر دبئی تک اور لندن سے لے کر نیویارک تک پھیلا ہواہے"۔

ان اردو کی نئی بستیوں کے ادب کو اور ہندوپاک کے ادب کو مقابل پر رکھ کر اپنی رائے دیتے ہیں کہ۔

"یہاں کے افسانہ نگاروں کا ایک اہم موضوع ہجرت یا ترک وطن ہے۔ اس موضوع پر بہت کہانیاں لکھی گئی ہیں۔ لیکن ہجرت کے موضوع پر ۱۹٤۷ کے بعد پاکستان اور ہندوستان میں جس پائے کی کہانیاں لکھی جاچکی ہیں، مغرب کے ہمارے اردو افسانہ نگار اس سطح کو مس بھی نہیں کرسکے۔ شاید اس کی وجہ یہ رہی ہوکہ ۱۹٤۷ء کی ہجرت نے دلوں میں گہرے گھاؤ پیدا کئے تھے"[110]

اس کے ساتھ کچھ ایسی شخصیتوں کا ذکر کرجاتے ہیں کہ جن کی کہانیوں میں واقعی ایک کیفیت درآئی ہے اور ان کے فن کو سراہتے ہوئے فرماتے ہیں۔

"افسانے کی دنیا میں جہاں ہمیں اپنے ثقافتی تصادم کا سامنا کرنا پڑاہے اور جہاں مختلف ثقافتی المیے سامنے آئے ہیں وہاں چند اچھی کہانیوں نے تبدیلی کا احساس دلایاہے۔ مثلاً سعید انجم کا "جھوٹ سچ"۔ بہرچرن چاولہ کا "گھوڑے

[110] مطبوعہ ماہنامہ اخبار اردو اسلام آباد، شمارہ اکتوبر ۲۰۰۳، بحوالہ تاثرات صفحہ ۱۹

کا کرب" اور قیصر تمکین کا "اندھیری روشنی" --- تاہم ثقافتی تصادم کی عام کہانیاں بھی اخباری رنگ میں زیادہ بیان کی گئی ہیں"۔[111]

اس کتاب کا دوسرا مضمون "یورپ کی نوآباد اردو بستیوں میں اردو کا مستقبل" کے عنوان سے ہے، اور تیسرا "مغربی دنیا میں اردو کی صورت حال" ان دونوں مضامین کو پڑھنے سے اندازہ ہوتاہے کہ یورپ یا مغرب میں اردو کی صورتحال کیاہے۔ اور وہاں کس قسم کے ادب پھلتااور پھولتاجارہاہے۔ ایسا نہیں کہ صرف سارق یا پھر دولت کے بھروسے ادیب و شاعر بننے کا ہی رجحان ہے بلکہ ان میں کئی ایسے شاعروادیب بھی موجود ہیں ج وجنُوین بھی ہیں۔ اور انکے کلام اور ادب کو پڑھنے سے اندازہ ہوجاتاہے کہ واقعی یہ اچھے فنکار ہیں۔

ہرمن ہیسے کا ناول "سدھارتھ" کا جائزہ حیدرقریشی نے بڑے اچھے رنگ میں لیاہے۔ اور ہرن ہیسے کے متعلق معلومات فراہم کرتے ہوئے اس کے ناول سدھارتھ کی خوبیوں کو اجاگر کیاہے۔

اقتباس ملاحظہ ہو:

"سدھارتھ کی مجموعی شخصیت کو دیکھیں تو یہ ایک ایسی مضطرب روح ہے جو علم کی بجائے دانائی کی کھوج میں ہے۔ جو ترک دنیا کرکے بھی دنیا سے دور نہیں جاپاتی۔ اور دنیا کے اندر اترکر بھی اپنے اندر کے تیاگی سے نجات نہیں پاسکتی۔ یہی اس کی اصل کشمکش ہے"۔[112]

جدید ادب کا میراجی نمبر، عبداللہ جاوید کثیرالجہت ادیب، کتاب دل و دنیا، ایوب خاور کی شاعری، ادب کے ایک سنجیدہ قاری پروفیسر ناصر احمد، صادق باجوہ کی شاعری میں اور میں،

---

[111] مطبوعہ ماہنامہ اخبار اردو اسلام آباد، شمارہ اکتوبر ۲۰۰۳، بحوالہ تاثرات صفحہ ۲۰
[112] مطبوعہ ماہنامہ اخبار اردو اسلام آباد، شمارہ اکتوبر ۲۰۰۳، بحوالہ تاثرات صفحہ ۳۸

طاہر عدیم کی شاعری، غرض اسطرح جملہ ٦٦، مضامین اور تبصروں پر مشتمل تنقیدی و تاثراتی کتاب اپنے جلو میں بہت عمدہ ہے اور حیدرقریشی کی تنقیدی فکر کو عیاں کرتی ہے۔ اس کے باوجود حیدرقریشی کی انکساری یہ ہے کہ انہوں نے اپنے آپ کو سکہ بندنقادوں کی فہرست میں رکھا۔ فرماتے ہیں:

"اردو میں نقادل کہلانے کیلئے جس قسم کی تنقید لکھی جارہی ہے میں اس قطار میں شمار نہیں ہوتا۔ میرے جملہ مضامین، تبصرے اور تاثرات ایک قاری کے تاثرات ہیں۔ ایسا قاری جو خود تخلیق کار بھی ہے۔ کسی کتاب یا موضوع پر لکھتے وقت جو کچھ میرے ذہن میں اتاہے اور دل اسے جس حدتک قبول کرتاہے میں ان تاثرات کو لکھتا چلاگیا۔ قارئین پر کسی درآمدی نظریے یا فلسفے کا رعب جھاڑ نا میرا مطمح نظر نہیں رہا۔ بس اپنی سوجھ بوجھ کے مطابق جو کچھ سمجھا اسے مناسب طورپر بیان کردیا۔ اسی لئے میں انے اپنے اس مجموعہ کا نام "تاثرات" رکھاہے۔ صرف یہی کتاب نہیں، میری ساری تنقیدی مضامین کی کتابوں میں درج، میرے سارے تنقیدی مضامین کو میرے تاثرات ہی سمجھاجاناچاہئے۔ ایک قاری کے تاثرات ---- ایک تخلیق کار کے تاثرات!

میرے یہ تاثرات متعلقہ موضوعات اور کتابوں کے علاوہ خود میرے علمی وادبی ذوق کی نشاندہی کرتے ہیں۔ یہ اچھے ہیں یا برے --- یا اوسط درجے کے؟ میں اتنا کچھ ہوں---- اور میں جتنا ہوں اتنا ہی دکھناچاہتاہوں۔۔[113]

[113]مطبوعہ ماہنامہ اخبار اردو اسلام آباد، شمارہ اکتوبر ۲۰۰۳، بحوالہ تاثرات صفحہ ۱۰


GULBARGA UNIVERSITY


باب چہارم
جہت صحافت

جہت صحافت

اردو ادب میں صحافت نگاری سے کسے انکار ہوسکتاہے۔ ہم دیکھتے ہیں یہ خبر سے شروع ہوتی ہے اور حقائق کو پیش کرنے کا ایک ذریعہ رہی مگر ادبی صحافت کا صحیح معنوں میں آغاز سرسید سے ہوتاہے۔ جب انہوں نے سرولیم میور کی کتاب دی لائف آف محمد کا جواب لکھنے کی غرض سے لندن تشریف لے گئے تو اس زمانے میں وہاں دیکھا کہ اسٹیل اور ایڈیس اپنی قوم کیلئے یا ان کی خاطر اصلاح مضامین وغیرہ سے ان کی ذہنی تربیت کررہے تھے اور انھیں خطوط پر سرسید نے سوچا بلکہ وہیں یہ پلان بھی بنالیا کہ اب ہماری قوم کی اصلاح کیلئے اس قسم کی صحافت ضروری ہے اور اس سے یہ کام بحسن و خوبی لیاجاسکتاہے۔ اسے ادبی صحافت کا آغاز کیاجاسکتاہے۔ کیونکہ ادب کا مقصد بھی انسانی اصلاح ہی ہوتاہے۔ اس کے مختلف انداز میں کبھی وہ طنزیہ و مزاحیہ انداز کو اختیار کرلیتاہے اور کبھی بیانیہ انداز، کبھی وہ شاعرانہ انداز میں بات کرتاہے تو کبھی افسانوی انداز میں، کہیں صراحت اور وضاحت سے تو کبھی اشارہ و کنایوں میں ، غرض ادب انسان کو جہاں مسرت بخشتاہے وہیں اسے بصیرت بھی عطا کرتاہے۔ جس سے اس کی ذہنی اصلاح و تربیت ہوتی ہے اور یہی کام تصانیف سے کہیں پہلے صحافت کرتی ہے۔

اس ادبی صحافت میں رفتہ رفتہ بہت سی تبدیلیاں رونما ہوئیں اور آج اکیسویں صدی میں یہ بہت آگے اور بہت اہم ہوگئیں۔ چنانچہ اردو رسائل اور خاص طورسے ادبی رسائل کا جائزہ لیتے ہیں تو یک گونہ خوشی کا احساس ہوتاہے۔ کیونکہ اردو آج بظاہر گھٹتی جارہی ہے۔ گھٹنا ان معنوں میں کے اب اس کا رواج کم ہوتاجارہاہے اور پڑھنے والوں کا اسکولوں میں اب تعداد بہت گھٹتی جارہی ہے۔ کالجس میں اور کم اور اعلیٰ تعلیمی اداروں یعنی یونیورسٹی لیول پر اور کم ہورہی ہے۔ اس لحاظ سے گھٹناہے۔ ہندوستان میں اس کی صورتحال بہت انحطاط پذیر لگ

رہی ہے۔ کئی افراد بس اس کی شیرینی کے قائل نظر آتے ہیں اور لکھنے کیلئے کبھی دیوناگری تو کبھی رومن انداز میں اس کو برتتے ہیں۔ یہ حالت یقیناً تشویشناک ہے۔ مگر اردو رسائل پر نظر ڈالنے سے اندازہ ہوتاہے کہ اس میں اضافہ ہواہے۔ کمی کہیں نہیں کھٹکتی۔ آج اردو رسائل کی کافی تعداد ہے اور اس میں صرف ادبی رسائل و جرائد کو ہی لیں تو وہ بہت بڑی تعداد میں نکل رہے ہیں۔ اس کے ساتھ ساتھ اب اردو بھی دیگر زبانوں کے ساتھ ساتھ انٹرنیٹ پر بھی اپنا قبضہ جما چکی ہے۔ اور کئی رسائل آج لائن نکل رہے ہیں۔ جنھیں اتنا وقت نہیں ہے کہ وہ گھر میں اخبار بینی کر سکیں یا رسائل پڑھ سکیں۔ وہ دفتری اوقات میں سستاتے وقت ہی سہی یا تھوڑی سی ذہنی ترنگ کیلئے نیٹ پر کسی بھی سائٹ پر جاکر ان ادبی رسائل کو پڑھ لیتے ہیں یہ موقع بھی اب اردو نے انھیں فراہم کردیاہے۔ چنانچہ کئی رسائل و جرائد آن لائن ہیں۔ یہ تمام مغربی دنیا سے بھی نکل رہے ہیں اور ہندوپاک سے بھی، اور بڑے دیدہ زیب بھی ہیں اور بہت معیاری بھی۔ اب ان مدیروں کو کیا کہیں جنھوں نے اردو قارئین کو دلچسپی، مسرت ناکی کے ساتھ ساتھ بصیرت بھی اسی ادب کے حوالے سے مہیا کرارہے ہیں۔ وہ اپنا وقت صرف کررہے ہیں۔ ان کے متعلق بس یہی کہاجاسکتاہے ۔

چلو اچھا ہوا کام آگئی دیوانگی ان کی

اب اگر فہرست دی جائے تو بڑی طویل ہے مگر ادبی رسائل کے باب میں جو اہم ہیں، جن میں ادبی مباحث ہوتے ہیں اور ادب کی جملہ صورتحال سے واقفیت بہم پہنچتی ہے۔ ان کے نام اسطرح ہیں، ایوان اردو، شاعر، کتاب نما، ذہن جدید، شعروحکمت، نوائے ادب، تطیر، نیاورق، اوراق، جہان اردو، اثبات، سبق، شب خون، بیسویں صدی، شمع، (فلمی ہونے کے باوجود ادبی بھی رہا)، گلبن، چہارسو، تہذیب الاخلاق، سب رس، ادب، ارددو دنیا، فکرو تحقیق، اذکار، اسباق، وغیرہ وغیرہ۔

انٹرنیٹ پر آن لائن رسائل کی بھی ایک لمبی فہرست ہے، جن میں چند ایک کے نام یہ ہیں۔ شعروسخن، دستک، شعرواادب، جدید ادب، ----- ------ ------- ------ ------ -------- ----------------

ان تمام رسائل و جرائد کی اپنی ایک الگ پہچان ہے اور ان کی اپنی انفرادیت، یہ مدیر کی اپنی کوشش اور کاوش پر منحصر ہے۔ ان میں سب سے پہلے یعنی اولیت اگر کسی کو حاصل ہے کہ وہ بیک وقت انٹرنیٹ یعنی آن لائن بھی ہو اور پرنٹ بھی تو وہ بس "جدید ادب" ہے۔ جس کے مدیر حیدرقریشی ہیں۔

حیدرقریشی نے جدید ادب کا آغاز پاکستان سے کیا۔ وہاں جب تک ان کا قیام رہا اور ادبی محافل، ادبی حلقے ان تمام میں اس نے ایک مقام بنالیا۔ اور یہ پاکستان سے نکل کر ہندوستان اور دیگر مقامات پر بھی اعتبار حاصل کرلیا۔ جب حیدرقریشی جرمنی چلے گئے تو یہ جنون بھی ان کے ساتھ رہا اور وہاں سے بھی انہوں نے اس کو جاری کیا۔ مگر کافی بوجھ بڑھنے لگا۔ بالآخر انہوں نے دنیاوی خسارہ کی پرواہ کئے بغیر اس تعطل کو توڑہی دیا۔ یہاں صحیح معنوں میں حیدرقریشی ایک صحافی اور خالص صحافی کی صورت میں ہمارے سامنے جلوہ گر ہوتے ہیں۔ کیونکہ مغرب کی اس دنیا میں جہاں زندگی بہت تیز رفتاری سے گزرتی ہے وہاں سب کچھ ہے مگر وقت نہیں۔ ایسے حالات میں سے بھی وقت کو نکالنا معمولی بات نہیں ہے اور حیدرقریشی نے نہ صرف وقت نکالا بلکہ ایک عرصہ تک مجلسی زندگی گذاری، یاردوستوں کے ہمراہ ادبی محافل سجائے، شعری وافسانوی بزموں کو رونق بخشی، اب یہ مغربی دنیا انھیں ادبی اعتبار سے کسی ویرانے سے کم نہیں تھی۔ مگر ادب کے اس مجنوں نے اس ویرانے کو یکسر بدل دیا اور اپنی دنیا آپ پیدا کرلی۔ بقول اصغر گونڈوی:

بنالیتاہے موج خون سے
اک چمن اپنا
وہ پابند قفس جو فطرتاً
آزاد ہوتاہے



اس شعر کی مصداق حیدرقریشی چونکہ فطرتاً آزاد ہیں اسی لئے انہوں نے اپنے خون دل سے ایک چمن بنالیا اور وہ ادبی چمن، یقیناً اس چمن کی آبیاری میں انھیں خون دل صرف کرنا پڑا اور اسی خون دل کو سیچ کر اس صحافتی طورطریقوں کو اس کی آن بان اور شان کو باقی رکھا۔ حقیقی معنوں میں صحافی کے الفاظ میں نے اسلئے بھی استعمال کئے کہ بعض حضرات اس میں بھی نفع ہی سوچ رہے ہوتے ہیں۔ مگر یہ یا اس قسم کے لوگ عجیب ہوتے ہیں جو نقصان اٹھالینے میں مذت محسوس کرتے ہیں اور دنیوی اعتبار سے خسارہ میں ہوتے ہیں۔ سابق میں ایک ایسی ہی شخصیت رہی جنھیں دنیا ابوالکلام آزاد کے نام سے جانتی ہے۔ انہوں نے بھی کچھ ایسا ہی کی اور صحافت کو اس لعنت سے پاک ہی رکھا۔ ہاں اس وساطت سے انھیں دیگر اخبارات و رسائل مل جاتے تھے بس وہی کافی تھا۔

حیدرقریشی کا بھی یہی دستور رہا۔ سامعین دیکھ سکتے ہیں کہیں بھی کسی بھی جریدے پر یعنی جدید ادب کے کسی بھی شمارے پر قیمت درج نہیں۔ اور شمارہ بھی ضخامت کے اعتبار سے کافی وزنی بھی اور صفحات کی تعداد بھی ویسی ہی۔ اس کے مشمولات بھی اتنے ہی گرانقدر، یہ سب صرف اسلئے کہ انہوں نے اپنی وابستگی ادب سے استوار رکھی اور اپنے یاردوستوں کو وہ بظاہر دور ہونے کے قریب ہی رکھا۔ اس حوالے سے ان کے وہ تمام ادبی دوست حیدرقریشی کے قریب ہوگئے بلکہ ذہنی طورپر انہوں نے اپنی انجمن بنالی۔ بقول غالبؔ

ہے آدمی بجائے خود اک محشر خیال
ہم انجمن سمجھتے ہیں خلوت ہی کیوں نہ ہو

یہی کیفیت اور اسی میں سرشار ہونا کوئی حیدرقریشی سے سیکھے۔ اور اقبال کے اس شعر کی تعبیر لگتے ہیں:

اپنی دنیا آپ پیداکر اگر زندوں میں ہے

سرِّآدم ہے ضمیر کن فکاں ہے
زندگی

جب انسان پر ایسا وقت آتاہے کہ وہ اپنوں سے بچھڑجاتاہے تو بساوقات زندگی اس کیلئے عذاب بن جاتی ہے۔ مگر انسان وہی ہے جو اس میں بھی ایسی راہ بنالیتاہےجسے زندگی عذاب نہیں بلکہ چمن زار لگنے لگتی ہے اور اسی کے سہارے وہ جیتاہے اور دوسروں کو بھی جینے کے گر سکھاتاہے۔

چنانچہ حیدرقریشی نے ادبی صحافت "جدیدادب" کے ذریعہ اپنی خموشی کو توڑدیا، اپنی تنہائی کو بھلادیا، اپنی بے بسی کو چھوڑ دیا، بجائے کمانے کے لٹانے پر آگیا، نفع کے بجائے نقصان کو اپنالیا۔ اس نقصان مالی نقصان کو اور زیاں کو برداشت کرلیا کیونکہ اس زیاں سے انہیں ذہنی آسودگی حاصل ہونے لگی اور اس میں کئی افراد کو اپنا شریک بنالیا۔ دنیا بھر کے ادیبوں شاعروں اور اہل قلم حضرات سے شناسائی ہوئی۔ انھیں اپنی محفل میں جگہ دی، اور لوگوں نے انھیں اپنے دل میں بٹھالیا۔

یہ جدید ادب جو ایک عرصہ تک پرنٹ کے طورپر نکل رہاتھا۔ مگر بعد میں اور ادبی صحافت کی تاریخ میں حیدرقریشی نے ایک ایسا موڑ دیا اپنے دوستوں کو کہ اسے آن لائن کردیا۔ اور حیدرقریشی کو اس اعتبار سے اولیت کا سہرا انہوں نے اپنے سرباندھ لیا۔ کیونکہ مغرب سے نکلنے والے جتنے بھی اردو آن لائن میگزین یا رسائل تھے ان میں بھی حیدرقریشی کا عمل دخل رہا۔ کبھی ان کو مشوروں سے نوازتے رہے تو کبھی کام خود کرلئے اور نام ان کاہوتا۔ مگر اپنے اس جریدے کو جوپرنٹ تھا اسے بھی آن لائن کردیا۔ اس طرح ایک ہی رسالہ بیک وقت پرنٹ میڈیا پر بھی ہو اور الیکٹرانک میڈیا پر بھی یہ دونوں کام حیدرقریشی نے کردکھایا اس لحاظ سے انھیں اولیت حاصل ہے۔ چنانچہ سطور بالا میں جس کا ذکر ہوا کہ وہ صرف اس لئے کرتے رہے کہ اس حوالے سے دنیا بھر کے رسائل اور جرائد اس کے جواب میں انھیں ملتے رہیں۔ اور ان میں ان کی تخلیقات

بھی شائع ہوتی رہیں۔ اس لین دین میں مالی اعتبار سے بہت خسارہ اٹھایا حیدرقریشی نے۔ مگر کہیں بھی نہ انہوں نے اس کا ذکر کیا اور نہ ہی کبھی کسی سے مطالبہ کیا۔

جدید ادب کے اس دور سوم میں تاحال جرمنی سے اُنیس (۱۹)شمارے منظر عام پر آئے ۔ ان انیس شماروں کا جائزہ لینا بذات خود ایک ریسرچ ورک ہے۔ یقیناً ایک پی ایچ ڈی کا موضوع بن سکتاہے۔ مگر یہاں اجمالی جائزہ کے طورپر ان تمام رسائل کی فہرست دی جارہی ہے جس سے اس جریدے کی اپنی انفرادیت، واشگاف ہوجائے۔ اور ایک مدیر بلکہ منجھے ہوئے اور تجربہ کار مدیر کی مدیرانہ و مدبرانہ صلاحیت کا اندازہ بھی ہوتاہے۔ ان میں روایتی انداز کو برتتے ہوئے رسالہ کا آغاز حمد، نعت، منقبت سے ہوتاہے۔ اور مضامین، نظمیں، غزلیں، ماہیے، گوشے (ادباء شعراء کے) خصوصی مضامین، کتابوں پر تبصرے، تفصیلی مطالعے، خطوط وغیرہ شائع ہوتے ہیں۔ ان میں لکھنے والے دنیا بھر کے ادیب وشعراء اور دانشور حضرات کے ساتھ ساتھ نوجوان قلم کاروں اور نئے لکھنے والوں کو بھی جگہ دی گئی ہے۔ مگر رسالے کے معیار کو گرنے نہیں دیا۔ جدید ادب دنیا بھر کے دانشوروں، پروفیسروں، شعراء اور ادباء کا پسندیدہ جریدہ بنا، اور بہت کم وقت میں انہوں نے اپنی مدبرانہ صلاحیت سے اس رسالہ کو ایک وقعت عطا کی۔

مختلف گوشوں پر ہی ایم فل کا کام بھی ہوسکتاہے۔ اور بعض "نمبر" یعنی خصوصی نمبر بھی اس کے نکلے جو اپنے ادبی دوستوں کی ذہنی آبیاری کے ساتھ ادب کے طالب علموں کو وافر مقدار میں معلومات فراہم کرتے نظر آتے ہیں۔ ان میں خاص طورپر اردو ماہیے، یہ ایسے ماہیے اور اتی کثیر تعداد میں ملیں گے کہ یہ بھی دعوت تحقیق دیتے نظر آتے ہیں۔ دیگر مباحث بھی کافی معلوماتی ہیں۔ بہرحال ان تمام کی فہرست پیش خدمت ہے۔

پہلا شمارہ جولائی تا دسمبر ۲۰۰۳

اس میں مضامین کی تعداد جملہ 5 ہے۔ پہلا مضمون اردو کے مایہ ناز افسانہ نگار اور ناول نگار پروفیسر جوگندرپال کا

پہلا مضمون "جانے کے بعد" کے عنوان سے ہے۔ جس میں جوگیندرپال نے افسانوی انداز اختیار کیا اور اپنے ادب دوستوں اور فنکاروں سے متعلق لکھا۔

دوسرا مضمون پروفیسر ڈاکٹر شفیق احمد کا، بعونان "ادبی تحقیق اور اس کے مسائل" پر ہے۔ جس میں پروفیسر نے ادبی تحقیق سے متعلق معلومات فراہم کراتے ہوئے مسائل پر بھی گفتگو کی ہے۔

تیسرا مضمون ناصر عباس نیر کا ہے، جو پاکستان میں شعبہ تدریس سے وابستہ ہیں اور مابعد جدیدیت پر انہوں نے کام بھی کیا بہرحال نئی نسل میں ایک اچھے نقاد کی حیثیت سے انہوں نے شناخت بنالی ہے۔ اور یہ مضمون ڈاکٹر محمد علی صدیقی کی تنقید نگاری کے موضوع پر ہے۔ جن سے انہوں نے انصاف کیاہے۔ اور "مستقبل، امکانات اور اندیشے" اس کا پانچواں اور آخری مضمون ہے جسے سنجے گوڑ بولے اور کرشن مہیشوری نے مشترکہ طورپر لکھاہے۔ واقعی بہت عمدہ مضمون ہے۔

مضامین کی ترتیب اسطرح ہے:

۱۔ جانے کے بعد — جوگندر پال
۲۔ ادبی تحقیق اور اس کے مسائل — پروفیسر ڈاکٹر شفیق احمد
۳۔ ڈاکٹر محمد علی صدیقی کی تنقید نگاری — ناصر عباس نیرء
٤۔ جدید افسانہ نگاری میں رشید امجد کا مقام — ثمینہ اصغر علی
٥۔ اردو کا مستقبل، امکانات اور اندیشے — سنجے گوڑبولے، کرشن مہیشوری

خصوصی مطالعہ کے تحت:

۱۔ امن کی فاختہ کے نام — فرحت نواز شیخ
۲۔ عارف فرہاد اور ماہیئے کی کہانی — نذرخلیق

۳۔ ظہیر انور کے نام ایک خط خالد سہیل
٤۔ کھٹی میٹھی یادیں(ابتدائی ادبی زمانہ)حیدرقریشی

دوسرا شمارہ جنوری تا جون 2004

اس میں مضامین کی تعداد جملہ 7 ہے جن میں قابل قدر ہستیوں نے مضامین لکھے ہیں۔ ڈاکٹر جمیل جالبی، انتظار حسین، خلیق الرحمٰن، ناصر عباس، نیر، شگفتہ الطاف، کرشن مہیشوری اور نذر خلیق کی تحریرات شامل ہیں۔ ان تمام میں موضوعات کا تنوع بھی اور عصر حاضر سے متعلق معلومات بھی ہیں۔ ادب کیا ہے پر قارئین اب تک بہت کچھ پڑھ چکے ہیں۔ اب جبکہ ادب کے ایک مورخ، محقق اور ناقد اور ان سب سے بڑھ کر عصری ادب پر بصیرانہ نگاہ رکھنے والی مقتدر شخصیت ڈاکٹر جمیل جالبی ہیں۔ انہوں نے اچھا ادب کیاہے پر اپنے خیالات کا اظہار کیاہے۔ اچھے ادب کے متعلق ڈاکٹر جمیل جالبی نے کچھ یوں فرمایا کہ

> "میں اسی تفصیل میں تو اس وقت جانا چاہتاکہ "اچھا ادب کیاہے؟ لیکن اچھے ادب کے بارے میں ایک بات میں ضرور جانتاہوں کہ اسے پڑھتے ہوئے یوں محسوس ہوتاہے کہ لکھنے والے کے پاس کہنے کے لئے کچھ ہے۔ اور وہ اسے ایسے لفظوں میں حسن ترتیب، فنی شعور، تخلیقی سلیقے اور طرزادا کے ساتھ پیش کرتاہے کہ پڑھنے والا محسوس کرتاہے کہ یہ بات اس طورپر اور اس انداز سے اس سے پہلے نہیں کہی گئی ۔"[114]

چنانچہ اس ذاویے سے انہوں نے عصری ادب کا جائزہ لیا اور اس جائزے سے انھیں تشفی نہیں ہوئی اور وہ غیرمطمئن نظر آتے ہیں۔ آگے تحریر فرماتے ہیں:

---

[114] بحوالہ اچھا ادب کیاہے : جدید ادب شمارہ ۲



"اس زاویے سے اپنے معاصر ادب کو دیکھئے تو اس کا بڑا حصہ اس بنیادی خوبی سے عاری نظر آتاہے۔ یوں معلوم ہوتاہے کہ لکھنے والا جلدی میں ہے اور اسے لکھنے سے زیادہ کچھ اور ضروری کام ہیں"۔[115]

اس غیر مطمئن صورتحال کو تشفی بخش صورتحال میں تبدیل کرنے اور اپنی نئی نسل کے لکھنے والوں کو بڑے مفید مشوروں سے نوازتے ہوئے انھیں لکھنے کی تلقین کرتے ہیں:

"پڑھنے والاادب اور ادیب سے یقیناً یہ چاہتاہے کہ وہ اسے دھڑکتی، پھیلتی اور بدلتی زندگی کے وہ پہلو دکھائے جس سے اس کی بصیرت میں اضافہ اور اس میں وہ شعور پیدا ہو جو اس کیلئے مثالی زندگی کا خواب بن جائے اسی شعور سے فرد میں عمل کی قوت پیدا ہوتی ہے۔ اس سطح پر ادب نہ صرف اپنے پڑھنے والے کے ذہن کو متاثر کرکے اسے بدلتاہے۔ بلکہ خواب دکھاکر عمل کی طرف بھی راغب کرتاہے۔ یہ وہ ادب ہے جس کا تعلق براہ راست زندگی سے ہوتاہے۔ وہ زندگی جو لکھنے والے کے چاروں طرف پھیلی ہوئی ہے۔ وہ زندگی جو ماضی میں بھی تھی اور وہ زندگی جو آج بھی ہے اور جو لکھنے والے کا بنیادی حوالہ ہے۔ وہ زندگی جس کے خواب اس نے اپنی تحریروں میں دیکھے اور اپنے پڑھنے والوں کو دکھائے اور جو مستقبل کی زندگی ہے۔

[115] بحوالہ جدید ادب انٹرنیٹ ایڈیشن: شمارہ ۲



اچھا ادب یہی کام کرتاہے اور ہمیشہ
سے یہی کرتا آیاہے۔[116]

اسی دوسرے شمارے کا دوسرا مضمون انتظار حسین کا ہے۔ انتظار حسین افسانوی ادب کا یہ وہ نام ہے جو آج عالمی منظر نامے پر ہے۔ جن کی شہرت کافی بلکہ کافی سے زیادہ ہے۔ کیوں نہ ہو کہ انہوں نے ادب کو اور خاص طورسے افسانے کو اپنے خون جگر سے سینچا اور اس کو ادب میں ایک مقام اور وقار عطا کردیا۔ آج علامتی افسانہ انتظار حسین سے اور انتظار حسین علامتی افسانے سے ایک دوسرے کی پہچان بنے ہوئے ہیں۔ دنیائے ادب میں اور بھی افسانے نگار ہیں مگر انتظار حسین ان میں ممتاز مقام رکھتے ہیں۔ پاکستان ہی میں نہیں دنیا کے ہر ملک میں ہر گوشہ میں ان کے چاہنے والے ہیں۔ یہ ابتداء میں صحافت سے وابستہ رہے۔ ان کی تحریر خود بتاتی ہے، ان کا اسلوب خود ان کی پہچان ہے۔ کہانی کہنے کے فن سے واقف ہیں بلکہ کہانی کیا ہوتی ہے اور کہانی میں کہانی پن کی کیا وقعت ہوتی ہے اور اپنے قاری کو کیسے باندھ کر رکھاجاتاہے یہ انتظار حسین کی تحریروں سے سیکھا جاسکتاہے۔ اکتوبر 2000ء میں رائٹر فورم کینیڈا کی ایک تقریب میں انتظار حسین نے یہ مضمون پڑھ کرسنایا تھا۔ اور ان سے یہ مطالبہ کیاگیا تھا کہ وہ اپنے تعلق سے کہیں چنانچہ وہ اپنے آپ کو کس طرح پیش کرتے ہیں یہ ملاحظہ فرمائیے:

"آپ سے کیا چھپاؤں، سچی بات یہ ہے
کہ میں بس ایک کہانیاں لکھنے والا
ہوں۔ اس سے زیادہ اور اس کے سوا
کچھ نہیں ہوں۔ یوں سمجھئے کہ میرے
حساب سے میں نہ تو قوم و ملک یا عوام
کی خدمت کا کوئی کارنامہ ہے ہ اسلامی
جذبے کا کوئی قابل ذکر مظاہرہ مجھ
سے منسوب ہے، نہ مجھے اردو زبان و
ادب کی خدمت کا دعویٰ ہے۔ میرے نامہ

[116] بحوالہ جدید ادب شمارہ ۲ : انٹرنیٹ ایڈیش



اعمال میں بس یکمشت اچھی بری کہانیاں ہیں۔ یہی کہانیاں مجھے بخشوائیں تو بخشوائیں، باقی تو میرے پاس بخشش کا کوئی سامان نہیں"۔ [117]

اس مضمون میں انتظار حسین نے معاصر ادب کا جائزہ بھی پیش کردیا اور ادب میں ہونے والی صورتحال کہ ان دنوں کیا چل رہاہے ادب میں۔ اس میں طنزبھی ہے۔ مگر حقیقت ہے۔ اور سبھی جانتے ہیں کہ حقیقت کس قدر تلخ ہوتی ہے۔ اب زمانہ بدل چکاہے۔ کیونکہ پہلے کہا جاتاتھا کہ حق بات کہنا بڑا مشکل کام ہے اور سچ بولنا گویا جہاد کا رتبہ رکھتاہے۔ اب صورتحال بدل چکی ہے اب تو ہر جھوٹا بھی سچ کی تلقین کرنے اترآیاہے۔ ہر بدکار بھی نیکی کا درس دینے پر آیاہے۔ اب حق کہنا بڑی بات نہیں ہے بلکہ سچ سننا بڑی بات ہے اور سچ کا سامنا کرنا بڑی بات ہے۔ اس پر بھی وہی لعن طعن ہوتی ہے۔ کچھ ایسی صورتحال کا تذکرہ اس مضمون میں ہوا ہے۔ اور انتظار حسین نے اپنے تجربوں کو اپنے مخصوص انداز میں پیش کیاہے۔ اس سے ہمیں صورتحال کو سمجھنے میں مدد ملتی ہےا ور ہم عصری حالات سے آگاہی بھی حاصل کرسکتے ہیں۔اپنے تجربات کا تذکرہ کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

"--- ابھی پچھلے دنوں یہ ہوا کہ میرے ایک ہم عصر افسانہ نگار نے جو کل تک ایک انقلابی کی حیثیت سے جانا جاتا تھا اور مجھے رجعت پسندی کے طعنے دیاکرتا تھا اچانک نظام محمدی کا نعرہ بلند کیا اور پاکستان کی فلاح کا یہ نسخہ تجویز کرتے کرتے ایک مذہبی پارٹی میں شامل ہوگیا۔ اور یہ واقعہ ایسے وقت میں ہوا جب مجھے اس کی مارکسیت، طالبان کے اسلام کے مقابلہ

[117] بحوالہ جدید ادب شمارہ ۲: انٹرنیٹ ایڈیشن

میں غنیمت نظر آتی تھی۔ اب میں سخت
سٹ پٹایا ہوا ہوں کہ
میں ہوا کافر تو وہ کافرمسلماں ہوگیا"[118]

اس کے ساتھ ساتھ ایک بڑی اچھی بات جو انتظار حسین کے اپنے ذاتی تجربے کی ہے اور آج کل ہمارے ادب میں بھی یہ چیزیں دیکھنے کو ملتی ہیں کس طرح بیان کرتے ہیں ملاحظہ فرمائے:

"ابھی پچھلے دنوں ایک اخبار کی طرف سے میرا انٹرویو لیاجارہاتھا۔ فوٹو گرافر کھٹاکھٹ میری تصوریں بناتارہا۔ میں نے انٹرویو لینے والے دوست سے کہا، آپ کو ایک تصوری شائع کرنی ہے اتنی تصویریں کیوں بنارہے ہیں۔ بولا نہیں جی، یہ سب تصویریں شایع ہونی ہیں۔ میں نے حیرت سے کہا۔ اچھا میری اتنی تصویریں شایع ہوں گی مگرم یرا افسانہ؟ اس پر وہ چپ ہوگیا۔ اسے چپ ہونا ہی چاہئے تھا۔

ادیب کی شخصیت تو ماس میڈیا کے کام آسکتی ہے۔ ادب ماس میڈیا کے کام کی چیز نہیں ہے۔ اور کم بخت افسانہ تو ایسی صنف ہے کہ اس کا ماس میڈیا کے ساتھ سمجھوتاہو ہی نہیں سکتا۔ ویسے شاعری کا بھی کسی حدتک سمجھوتا ہوسکتاہے۔ زیادہ سے زیادہ مشاعرے والی غزل یا مہدی حسن اور اقبال بانو کی گائی ہوئی فیض کی نظموں کی حدتک سمجھوتہ ہوسکتاہے۔ راشد اور میراجی والی شاعری کی ماس میڈیا میں کہاں کھپت ہوسکتی ہے"۔ [119]

اس پورے مضمون میں انہوں نے پاکستانی ادب کے حوالے سے اردو ادب کی صورتحال کو پیش کردیا کہ اب ادب بھی کس طرح زمروں میں بانٹا جارہاہے۔ اور ایک ادبی یا فنکار بے چارہ کس

---

[118] بحوالہ جدید ادب شمارہ ۲ : انٹرنیٹ ایڈیشن
[119] بحوالہ جدید ادب، شمارہ ۲ : انٹرنیٹ ایڈیشن

کسمپرسی میں زندگی گذاسر رہاہے۔ کہ اس نے ادب کو کیا چاہتا تھا اور کیا ہوگیا، کیسا جمود اس پر طاری ہے اور کن کی حکمرانی ہے۔ بقول اسد اعجاز بنگلور ے

جب کہ ہر فرد بشر کرنے لگے حکمت کی بات
اس میں کوئی شک نہیں اہل نظر خطرے میں ہے[120]

انتظار حسین نے بھی وہ سارے زمانے دیکھے اور آج ادب کی جو صورتحال ہے وہ کیسی ہے پاکستان کے حوالے سے بتارہے ہیں۔

"اب میں ہوں اور ماتم یک شہر آرزو۔ ادبی تنازعوں کی اس ساری تاریخ کو اب میں ایک نوسٹلجیائی احساس کے ساتھ یاد کرتاہوں۔ ان کو بھی یاد کرتاہوں جو مجھے رجعت پسند ٹھہراکر مجھ پر یلغار کرتے تھے۔ اب میری سمجھ میں نہیں آتا کہ کس سے لڑوں۔ جن سے لڑائی ٹھنی رہتی تھی ان میں سے کچھ اللہ کو پیارے ہوگئے۔ کچھ مارکسیت سے تابک ہوکر مشرف بہ اسلام ہوگئے اور محب وطن بن گئے۔

ادب میں لڑائیاں تو بہرحال ہوتی رہنی چاہئیں امن و آشتی میں ہر معاشرے کی ضرورت ہوتی ہے۔ اور پاکستانی معاشرہ کا تو اس وقت بحران ہی یہ ہے کہ اس سے یہ نعمت چھن گئی ہے۔ مگر ادب کیلئے امن و آشتی کوئی نیک فال نہیں ہے۔ا د تو بحثوں اور

---

120 اعجاز سخن از اسد اعجاز، بنگلور۔

تنازعوں کے بیچ ہی پنپتا اور پروان چڑھتاہے۔ مگر اب تو یہ لگتاہے کہ جیسے ادیبوں نے سارے نظریاتی جھگڑوں اور ادبی تنازعات کا کوئی جامع حل تلاش کرلیاہے۔ اگر کوئی وجہ نزاع باقی رہ گئی ہے تو یہ کہ کس ادیب کو انعام ملنا چاہئے تھا اور کس کو نہیں ملنا چاہئے تھا۔ آپ کو معلوم ہے کہ اس وقت پاکستان میں سوسے زیادہ سیاسی پارٹیاں ہیں۔ مگر کوئی سیاسی پارٹی اب کسی نظریہ یا منشور کے حوالے سے نہیں پہچانی جاتی۔ اور مجھے اس خیال سے خوف آتاہے کہ کہیں پاکستان میں دنیائےادب کی بھی تو یہی شکل نہیں نکل آئے گی۔[121]

خلیق الرحمٰن نے اکبر حمیدی کا فن کے عنوان کے تحت جو مضمون لکھا اس میں اکبرحمیدی کی شاعری اور نثر کا احاطہ کیا جو یقیناً ایک ادیب اور شاعر کو سمجھنے کی کوشش ہے۔ اس جریدے کا آخری مضمون جس کی پہلی قسط شائع ہوئی وہ ہے "اردو کی اہم ویب سائٹس" اور اسے لکھنے والے ہیں نذیرخلیق جنہوں نے پچھلے دنوں اردو میں سرقہ کی روایت پر مقالہ لکھ کر ڈاکٹربنے۔ یہ مضمون ادب کے طالب علموں کیلئے بہت اہم اور بالخصوص ریسرچ کرنے والوں کیلئے بہت ضروری ہے۔ آج کے بدلتے ہوئے حالات میں اردو نے بھی اپنے آپ کو سائنس کے شانہ بہ شانہ لاکھڑا کردیا اور سائنسی آلات سے مدد لینے میں وہ بھی برابر کی شریک ہے۔ اس کا سہرا بھی حیدرقریشی کے سر جاتاہے جسے انٹرنیٹ سے روشناس کرایا۔ بہرحال اس مضمون میں اردو کی اہم ویب سائٹس کے مختلف حوالے پیش کئے ہیں۔ یہی مضمون اگلے دوشماروں میں یعنی کل تین قسطوں میں چھپاہے۔

---

121 جدید ادب، شمارہ ۲ : انٹرنیٹ ایڈیشن



اسی شمارے میں خصوصی مطالعہ کے عنوان سے مزید معلوماتی مضامین ملتے ہیں۔ جن میں تضمین غالب کے عنوان سے صبااکبرآبادی کا، مابعد جدیدیت (اداریئے پر ردعمل) کے عنوان کے تحت ڈاکٹر وزیرآغا، ناصر عباس نیر اور حیدرقریشی کے خیالات اور تیسرا مضمون ماہیےپر مکالمہ (لوک گیت سے ادبی صنف تک) کے عنوان سے پلوشہ مومنہ اور حیدرقریشی کے مکالمے پر منحصر غیر معمولی معلومات افزا مضامین ہیں۔
مضامین کی ترتیب اسطرح ہے:

۱۔ اچھا ادب کیاہے؟ ڈاکٹر جمیل جالبی
۲۔ شام انتظار حسین میں
انتظار حسین کا خطاب انتظار حسین
۳۔ اکبر حمیدی کافن خلیق الرحمٰن
٤۔ نئے موسموں کی بشارت پر ایک نظر ناصر عباس نیئر
۵۔ افتخار عارف ایک شاعر شگفتہ الطاف
٦۔ ایک صوتی البم کی چوری کرشن مہیشوری
۷۔ اردو کی اہم ادبی ویب سائٹس نذر خلیق

خصوصی مطالعہ کے تحت:

۱۔ تضمین غالب صبااکبر آبادی
۲۔ مابعد جدیدیت (اداریے پر رد عمل) ڈاکٹر وزیرآغا/ناصر عباس نیر/حیدرقریشی
۳۔ ماہیے پر مکالمہ
(لوک گیت سے ادبی صنف تک) پلوشہ مومنہ/حیدرقریشی

جدید ادب کا تیسرا شمارہ جولائی تا دسمبر 2004ء

اس میں مضامین کی تعداد جملہ 7ہے۔ اس کے علاوہ اردو افسانہ کے سو سال کے تحت تین تحریر اور ہیں۔ اور ہائیکو کی دنیا کے تحت تین تحریریں شامل ہیں۔ جبکہ خصوصی مطالعہ کے

تحت جملہ 7 مضامین ہیں۔ اس طرح یہ شمارہ بہت اہم ہے کیونکہ ادب کی مختلف اصناف اور پھر ادبی صورتحال کا جائزہ پیش کرنے والا یہ شمارہ ہے۔

۱۔ حیاتِ فیض کا ایک گمشدہ ورق ڈاکٹر جمیل جالبی
۲۔ قرۃ العین حیدر سے منسوب ایک کتاب ڈاکٹر قاضی عابد
۳۔ آغا سکندر مہدی کی مرثیہ گوئی پروفیسر زوار حسین
٤۔ فیض احمد فیض اور تنقید محمد حمید شاہد
٥۔ تزکِ جہانگیری سے صدیوں پرانی روایت کی تردید محمد عمر کیرانوی
٦۔ اردو کی اہم ادبی ویب سائٹس نذرخلیق
٧۔ خورشید اقبال کی شاعری حیدرقریشی
اردو افسانے کے سوسال
٨۔ افسانہ ایک صدی کا قصہ منشایاد
٩۔ اردو افسانہ ایک صدی کا قصہ افتخار عارف
١٠۔ اردو افسانے کی اولیت کی تحقیق کا مسئلہ حیدرقریشی، ناصر عباس نیر

خصوصی مطالعے کے تحت:

۱۔ تضمین غالب صبا اکبر آبادی
۲۔ اکبر حمیدی سے گفتگو اصغر عابد
۳۔ غزل(احمد فراز کی نذر) ابراہیم اشک
٤۔ کچھ ہمت رائے رماجی کے بارے میں نذرخلیق، مسعود منور، ارشاد ہاشمی، حیدرقریشی
٥۔ انشائیہ نیند پروفیسر سیدزوارحسین شاہ
٦۔ صادق باجوہ کی شاعری حیدرقریشی

چوتھا شمارہ جنوری تا جون 2005ء

اس میں مضامین کی تعداد سات ہے۔ اور کلیات شکیب جلال کے تحت تین مضامین اور تفصیلی مطالعہ کے تحت تین مضامین درج ہیں۔ اس میں بعض مضامین بہت اہم اور معیاری ہیں پریم چند روایت ساز یا روایت شکن کے عنوان سے پروفیسر علی احمد فاطمی کا بہت فکرانگیز مضمون ہے۔ جس سے پریم چند کی گویائی شناخت اور ان کے مختلف گوشوں سے شناسائی ہوتی ہے۔

مضامین کی فہرست اسطرح ہے:

۱۔ پریم چند روایت ساز یا روایت شکن علی احمد فاطمی
۲۔ مرے استاد، میرے رہنما ڈاکٹر شفیق احمد
۳۔ پروفیسر نارنگ کا تخلیقی اسلوب نصرت ظہیر
٤۔ تازہ واردانِ بساطِ نقد ناصر عباس نیر
٥۔ اقبال شناسی کی روایت اور طالب حسین زوارحسین
٦۔ آغابابر ناصر زیدی
۷۔ اردو کی اہم ادبی ویب سائٹس نذرخلیق

(کلیات شکیب جلالی)

۱۔ کلیات شکیب جلالی کا پیش لفظ اقدس رضوی
۲۔ شکیب جلالی کی غزل ڈاکٹر فرمان فتح پوری
۳۔ غزل گو شکیب جلالی پروفیسر اسلوب احمد انصاری

(خصوصی مطالعہ کے تحت)

۱۔ ڈاکٹر گوپی چند نارنگ سے انٹرویو گلزار جاوید
۲۔ سرقہ یا جعلسازی؟ انٹرنیٹ مکالمہ ترتیب: سعید شباب

۳۔ محبت کے سات سٹروکس		صلاح الدین پرویز
(تفصیلی مطالعہ کے تحت)
۱۔ جہات، ایک جائزہ		اسلم رسولپوری
۲۔ میں آئینہ ہوں۔ پر ایک نظر		پروفیسر نذر خلیق
۳۔ منشایاد کا شہر فسانہ		حیدرقریشی

پانچواں شمارہ : جولائی تا دسمبر 2005 ء

اس شمارہ میں پانچ مضامین مختلف موضوعات پر اور جوگندرپال کی 80/ویں سالگرہ مبارک کے تحت پانچ مضامین درج ہیں۔ اور تفصیلی مطالہ کے تحت چار مضامین ہیں۔ اس مشارہ کی خصوصیت یہ ہے کہ جہاں مختلف النوع مضامین اپنے قاری کو معلومات فراہم کرتے ہیں وہیں اردو کے ایک اہم افسانہ اور ناول نگار کی شخصیت اور فن کو پیش کرکے ان کے فن کا محاکمہ کرتے ہوئے ادب میں انکی انفرادیت واضح کردی گئی ہے۔ ان کے لکھنے والوں میں، پروفیسر علی احمد فاطمی، نگار عظیم، ثروت خاں، ممتاز عالم اور حیدرقریشی ہیں۔ جن کی تحریریں واقعی دلوں کو چھوتی اور ان پر اثر انداز ہوتی محسوس ہوتی ہیں۔

مضامین کی ترتب اسطرح ہے:
۱۔ برائے کہانی: ناگزیر فتویٰ		احمد ہمیش
۲۔ آواز نہیں ہوتی		سلطان جمیل نسیم
۳۔ سابق ریاست بہاول پور کا پہلا اہم نثر نگار ڈاکٹر		عقیلہ شاہین
٤۔ پاکستانی ادب، مباحث ورجحانات		غفورشاہ قاسم
٥۔ سیدنصیرالدین نصیر کی شاعری		وردان احمد
(جوگندرپال ۸۰ویں سالگرہ مبار)
۱۔ چارجنموں کا مسافر، جوگندرپال		علی احمد فاطمی
۲۔ ابھی چراغ روشن ہیں		نگارعظیم
۳۔ ایک انوکھاناول 'پارپرے'		ثروت خان
٤۔ تخلیق کار جوگندرپال کا تنقیدی رجحان		ممتاز عالم

۵۔ جوگندر پال کاتخلیقی سفر حیدرقریشی

خصوصی مطالعہ کے تحت:
۱۔ منشایاد سے انٹرویو حسن عباس رضا، نصرت انور
۲۔ اردو کے ادبی معمے نصرت ظہیر
۳۔ خاک نشین انجلاء ہمیش
٤۔ ادب کے نام پر ایک افسوس ناک اور غیر ادبی حرکت حیدرقریشی، پروفیسر لطیف اللہ

چھٹا شمارہ : جنوری تا جون 2006 ء

یہ شمارہ بہت اہم ہے کیونکہ حیدرقریشی نے اسے ترقی پسند تحریک کے محرک، ادیب و فنکار سجادظہیر نمبر کے طورپر شائع کیا۔ جس میں سجاد ظہیر پر 20 مضامین کو یکجا کیا اور (دیگر) کے تحت دو اہم مضامین اس طرح جملہ 22 مضامین اس میں ہیں اور سجاد ظہیر کی نگارشات سے انتخاب بھی ہے۔ اور خصوصی مطالعہ کے تحت دو اہم مضامین۔ (۱) جوگندرپال سے گفتگو، ڈاکٹر غضنفر اقبال کا اور (۲) مشفق خواجہ کے عنوان سے ڈاکٹر انور سدید کا مضمون بہت اہم ہیں۔ منجملہ یہ شمارہ سجاد ظہیر سے متعلق اہم معلومات فراہم کراتاہے۔

اس شمارے کی مکمل فہرست اسطرح ہے:

۱۔ بہ مرگ من یادآر سجادظہیر پروفیسر مجنوں گورکھپوری
۲۔ فکروعمل کا مخلص رہنما سیداحتشام حسین
۳۔ ایک انسان جو نہیں مرا خواجہ احمد عباس
٤۔ سجاد ظہیر۔ ایک ادیب ایک تحریک ڈاکٹر سید محمد عقیل

۵۔ سجاد ظہیر۔ ہمارے بنے بھائی حمایت علی شاعر
٦۔ سجادظہیر۔ ایک نام، ایک عہد اور ایک تحریک ڈاکٹر محمد علی صدیقی
۷۔ کچھ احوال سید سجاد ظہیر کا اور ان کے دو خط سلطان جمیل نسیم
۸۔ سجاد ظہیر اور ترقی پسند ادبی تحریک پروفیسر قمررئیس
۹۔ سجاد ظہیر ایک مثالی رہنما ضیاء الحق
۱۰۔ نقش قدم تو زندہ ہیں صدیق الرحمٰن قدوائی
۱۱۔ سجاد ظہیر: ایک تحریک، ایک تاریخ پروفیسر علی احمد فاطمی
۱۲۔ سجاد ظہیر شاہد نقوی
۱۳۔ ترقی پسند تنقید اور سجاد ظہیر سید محمودالحسن
۱٤۔ افکار کے سجاد ظہیر نمبر پر ایک نظر پروفیسر نذرخلیق
۱۵۔ سجادظہیر کی تخلیقی جہات جمال نقوی (پاکستان)
۱٦۔ لندن کی ایک رات 'ایک جائزہ' ڈاکٹر صالحہ زرین
۱۷۔ لندکی کی ایک رات میں دن کا تصور ممتاز نور
۱۸۔ میرے حصہ کی روشنائی نورظہیر
۱۹۔ "ابا کو غصہ کیوں آنے لگا" ثروت خان
۲۰۔ سجاد ظہیر اور ترقی پسند تحریک عبدالقیوم شمسی

(مضامین کے تحت)

۱۔ سرآمدروزگارے سجاد ظہیر
۲۔ شعر محض سجاد ظہیر

(خصوصی مطالعہ میں
جوگندرپال سے گفتگو ڈاکٹر
غضنفر اقبال
مشفق خواجہ ڈاکٹر انورسدید

ساتواں شمارہ : جولائی تا ڈسمبر 2006 ء

اس شمارہ میں چھے مضامین ہیں۔ پہلا مضمون بہت اہم ہے۔ جسے ڈاکٹر رشید امجد نے تحریر کیا۔ رشید امجد اردو افسانے کا ایک اہم نام ہے اور انہوں نے "پاکستانی ادب کے نمایاں رجحانات" کے عنوان سے رقم کیاہے۔ اس مضمون سے پاکستان کی ادبی صورتحال کا اندازہ ہوتاہے۔ اور وہاں ادب کے رجحانات کو سمجھنے میں مدد ملتی ہے۔ اس لحاظ سے یہ بہت اہم مضمون ہے اور ایک مقالہ خصوصی کے تحت "یہ ہماری زبان ہے---" کے عنوان سے پروفیسر ڈاکٹر شفیق احمد اور پروفیسر زوارحسین نے مشترکہ طورپر رقم کیاہے۔ بہت اہم ہے۔
اس شمارے میں مضامین کی فہرست اسطرح ہے:

۱۔ پاکستانی ادب کے نمایاں رجحانات ڈاکٹر رشید امجد
۲۔ غالب کی شاعری کے عوامی رنگ محمد اظہر
۳۔ کافکا کی کہانی "بالکونی پر" کے اسلوبی و فکری زاویے ڈاکٹر انور محمود
٤۔ ایک منفرد شاعر۔ صبا اکبر آبادی ڈاکٹر محمد علی صدیقی
٥۔ ناظم لٹالٹایا قصر ادب ڈاکٹر انیس صدیقی

خصوصی مطالعہ کے تحت:

۱۔ یہ ہماری زبان ہے پروفیسر ڈاکٹر شفیق احمد، پروفیسر زوار حسین

آٹھواں شمارہ: جنوری تا جون 2007ء

مضامین تین ہیں۔ جبکہ ڈاکٹر رشید امجد کا گوشہ چھپاہے اس کے تحت پانچ مضامین جس میں رشید امجد کے فن اور شخصیت پر مقالے ہیں۔ اور تفصیلی مطالعہ کے تحت چار مضامین ہیں جس میں متنوع قسم کے مقالے جات رقم کئے گئے ہیں۔ ان کی تفصیلات اسطرح ہیں۔

فہرست مضامین:

۱۔ اردو اور متروک الفاظ کا مسئلہ پروفیسر ڈاکٹر شفیق احمد
۲۔ کلنک کاٹیکہ نذیر ناجی
۳۔ محمد خالد اختر کی مزاح نگاری ڈاکٹر روبینہ رفیق

گوشہ ڈآکٹر رشید امجد:

۱۔ کوائف نامہ ڈاکٹر رشید امجد پروفیسر نذیرخلیق
۲۔ رشید امجد کا تصور وقت ڈاکٹر ناہید قمر
۳۔ ایک عام آدمی کا خواب منشایاد
٤۔ رشیدامجد کے افسانوں کا اسلوبیاتی مطالعہ صفیہ عباد
۵۔ افسانہ: پژمردہ کا تبسم ڈاکٹر رشید امجد

(خصوصی مطالعہ کے تحت)

۱۔ غالب اور صبا۔ ہم کلام مرزا غالب اور صبا اکبرآبادی
۲۔ اشتہاروں بھری دیواریں اکبر حمیدی
۳۔ بھولنے کی بیماری (طنزومزاح) نصرت ظہیر
٤۔ ملاقاتیں محمد زبیر ٹیپو
۵۔ رہے نام اللہ کا! حیدرقریشی

نواں شمارہ: جولائی تا دسمبر 2007 ء

اس شمارہ میں جملہ 7 مضامین ہیں اور ڈاکٹر حمید سہروردی کا گوشہ شائع ہواہے۔ اس گوشہ کے تحت تین مضامین، دو تجزیہ، چار کہانیاں اور ایک نظم شائع ہوتی ہے جبکہ تفصیلی مطالعہ کے تحت ایک مضمون ہے۔

اس شمارہ کی خصوصیات یہ ہے کہ اس میں ڈاکٹر گوپی چند نارنگ کے متعلق مضمون شائع ہوا اور مسلسل نواں، دسواں اور گیارھواں شمارہ میں یہ مضامین شائع ہوئے اور گوپی چند نارنگ پر سوالیہ نشان لگ گیا۔ دنیائے ادب میں ایک مباحثہ شروع ہوا۔ کہ آیا نارنگ مترجم ہیں یا مصنف۔ یہ دراصل عمران شاہد بھنڈر کے مضمون سے شروع ہوا۔ اور پے بہ پے ان کے مضامین چھپنے شروع ہوئے۔ عمران شاہد بھنڈر نے مختلف حوالوں سے یہ ثابت کیا کہ نارنگ نے سرقہ سے کام لیاہے۔ جبکہ اس سے پیشتر بھنڈر نے یہ مضامین انگلستان اور پاکستان میں چھپوائے تھے۔ ان کا پہلا مضمون انگلینڈ کے اخبار پاکستان میں چھپوائے تھے۔ ان کا پہلا مضمون انگلینڈ کے اخبار پاکستان پوسٹ اور اول رسالہ نیرنگ خیال راولپنڈی میں چھپے ضرور تھے مگر قارئین کو اپنی جانب متوجہ یا مبذول نہیں کراسکے۔ جب یہ جدید ادب میں شائع ہوا تو پوری ادبی دنیا اس طرف متوجہ ہوئی۔ اس سے جدید ادب کی مقبولیت کا بھی اندازہ ہوتاہے۔ جب یہ مضمون "گوپی چند نارنگ" مترجم یا مصنف" کے عنوان سے چھپا تو ایک بھونچال سا آگیا۔ جس میں گوپی چند نارنگ کی کتاب "ساختیات، پس ساختیات اور مشرقی شعریات" کے متعلق یہ مضمون ہے۔ کیونکہ جب یہ کتاب چھپی تو اسی کتاب پر پاکستان سے نارنگ صاحب کو ایک بڑے اعزاز سے نوازاگیاتھا۔ عمران شاہد بھنڈر انگلستان میں پی ایچ ڈی کی غرض سے چلے گئے اور انہوں نے کام کرنا شروع کیا تو انہوں نے گوپی چند نارنگ کی اس کتاب کا مطالعہ کیا اور انہیں حیرت ہوئی۔ چنانچہ انہوں لفظ بہ لفظ اس کتاب کو بھی پڑھا اور نارنگ صاحب نے جہاں سے اخذ واکتساب کیا اسے بھی اور بعد کو ایک مضمون کی شکل میں لکھا اور سوال اٹھایا کہ یہ تو سیدھے سیدھے ترجمہ نہ کہ تصنیف۔ اس لئے انہوں نے مضمون کا عنوان ہی یہ

رکھا کہ "گوپی چند نارنگ۔ مترجم یا مصنف" جس سے ان کا مترجم ہونا تو ثابت ہوتاہے نہ کہ مصنف، اور اگر وہ مصنف ہیں تو سارق بلکہ مسرقہ کے کوہ ہمالہ ہیں۔

اس اثناء میں ادبی حلقوں میں بہت سے بحثیں شروع ہوئیں۔ کئی اصحاب نارنگ صاحب کی حمایت میں کھڑے ہو ئے اور کئی ان سے جواب طلب کرنا شروع کئے۔ لیکن مدیر جدید ادب نے باقاعدہ نارنگ صاحب کو دعوت دی کہ جدید ادب کے صفحات آپ کے لئے مختص ہیں اگر آپ جواب دینا چاہتے ہوں تو۔ اس کے بعد اثبات لمبیٰ نے بھی اپنے صفحات کی پیش کش کی نارنگ صاحب سے کے اگر وہ جواب دینا چاہتے ہیں تو۔ مگر ان کی طرف سے کوئی جواب نہیں آیا بلکہ ان کے حواریوں کی طرف سے ہی جواب دہی بلکہ شخصیت کوشی شروع ہوئی۔ اس بحث میں مدیر جدید ادب کو بہت کچھ سننا پڑا اور یہ ایک طرح کی ادبی سرد جنگ شروع ہوئی۔ کبھی طارق شمیم نے کچھ لکھا تو کبھی نصرت ظہیر نے اور کبھی ساجد رشید نے غرض بجائے سنجیدگی سے جواب دینے کے انہوں نے جارہانہ رویہ اختیار کیا۔

اس کے مضامین کی تفصیلات اسطرح ہیں:

۱۔ نسائی ادب اور مسلم ایجوکیشنل کانفرنس — ڈاکٹر صوفیہ یوسف
۲۔ اقبال اور جدیدیت — ناصر عباس نیئر
۳۔ مغربی بنگال میں اردو صحافت — ڈاکٹر شہناز نبی
٤۔ ترکی میں اردو کیوں سیکھتے ہیں — ڈاکٹر خلیل توق ار
٥۔ پریم چند اور خطبہ صدارت — عبدالرب استاد
٦۔ گوپی چند نارنگ، مترجم یا مصنف؟ — عمران شاہد بھنڈر
٧۔ کبیر۔ اردو کا پہلا ترقی پسند شاعر — ڈاکٹر آصف قادری

گوشہ ڈاکٹر حمید سہروردی:

۱۔ چہرہ نما ڈاکٹر غضنفر اقبال
۲۔ خاکہ: پروفیسر حمید سہروردی۔ ادب کا پکاسو
امجد علی فیض
۳۔ پروفیسر حمید سہروردی سے ایک مصاحبہ
ڈاکٹر سید احمد قادری، سیدسجاداختر، نورالحسنین، عارف خورشید
٤۔ افسانہ: کربلا بہت دور ہے پروفیسر حمید سہروردی
٥۔ افسانہ: گم پروفیسر حمید سہروردی
٦۔ افسانہ: ادھر ادھر پروفیسر حمید سہروردی
۷۔ ادھر ادھر۔۔۔ ایک تجزیہ پروفیسر بیگ احساس
۸۔ نثری نظم: صفر پروفیسر حمید سہروردی
۹۔ منظروں سے ڈوبتی ابھرتی کہانی پروفیسر حمید سہروردی
۱۰۔ ریت منظر کی سراب کہانی۔۔۔۔ تجزیہ سلیم شہزاد

خصوصی مطالعہ کے تحت

۱۔ میری والدہ چودھری سرمحمد ظفر اللہ خان
۲۔ رباعیات امیر خسرو صبا اکبر آبادی
۳۔ غالب اور صبا ہم کلام ڈاکٹر جمیل جالبی
٤۔ سنا فسانہ ہستی تو ---- احمد ہمیش
٥۔ شاید یہ نظم ہے احمد ہمیش



٦۔ خاور مشرق---- خاور اعجاز اکبر حمیدی
٧۔ کرب آگہی انجلاء ہمیش
٨۔ روح اور جسم (کھٹی میٹھی یادیں) حیدرقریشی

شمارہ نمبر دس : جنوری تا جون 2008ء

اس شمارہ میں 7مضامین اور ایک گوشہ اکبر حمیدی کے تحت چودہ مضامین اور تخلیقات سے انتخاب شامل ہے جبکہ خصوصی طالعہ کے تحت تین تحریریں ہیں۔ جن میں حیدرقریشی کا ادارتی نوٹ ہے۔ اس ادارتی نوٹ میں حیدرقریشی نے واشگاف الفاظ میں صحافتی دیانتداری کا ثبوت دیا۔ کیونکہ اردو ادب کی ایک معتبر شخصیت کے متعلق اس قسم کا انکشاف معمولی بات نہیں اور ایسے معاملات میں جلد بازی بھی مناسب نہیں۔ ورنہ لوگ (صحافی) کیا کیا نہیں کرتے۔ حقائق کو چھپاکر صحافتی دیانتداری کا گلا گھونٹ دیتے ہیں اور نظر آنے والے سچ کو بھی اس طرح چھپادیتے ہین جیسے کبوتر بلی کے سامنے آنے پر آنکھیں موند لیتاہے۔ اور سمجھتا ہے کہ میرے سامنے کوئی نہیں ہے۔ بہرحال حیدرقریشی نے اپنے ادارتی نوٹ میں کیا بیان فرمایا ملاحظہ فرمائیں۔

> "عمران شاہد بھنڈر کا گوپی چندنارنگ کی کتاب ساختیات، پس ساختیات اور مشرقی شعریات" کے اصل ماخذات کے انکشاف کے حوالے سے یہ دوسرا مضمون ہے۔ پہلا مضمون "جدیدادب" شمارہ نمبر نو میں شائع ہوچکاہے۔ جدید ادب کے گذشتہ شمارہ میں عمران شاہد بھنڈر کا مضمون شائع کرتے ہوئے میں نے بڑی صراحت کے ساتھ لکھا تھا کہ اس مضمون کا جواب گوپی چند نارنگ صاحب کو خود دینا چاہئے۔ کیونکہ عمران شاہد بھنڈر کے ساتھ طے ہوا تھا کہ دوسرے شاعروں، ادیبوں اور قارئین

کا ردعمل تو شائع کیاجائے گا لیکن مضمون کا اصل جواب صرف ڈاکٹر گوپی چند نارنگ صاحب کی طرف سے انے پر ہی شائع کیاجائےگا۔ نارنگ صاحب نے تاحال جواب دینے کی زحمت نہیں فرمائی۔ عام معترضین کے جواب میں خاموشی شان استغنا ہوسکتی ہے لیکن عالمی سطح پر سرقہ کا مدلل الزام سرپرپڑا ہو تو ایسی صورت میں خاموشی معنی خیز ہی نہیں بلکہ مجرمانہ ہوتی ہے"۔[122]

اسی ادارتی نوٹ کے علاوہ جاوید حیدرجوئیہ (بورے ولا) کا مضمون ردعمل کے عنوان سے چھپا جس میں انہوں نے ابتداء میں ہی یہ بات بتادی کہ

"بات شروع کرنے سے پہلے وضاحت کرنا بھی میں ضروری سمجھتا ہوں کہ گوپی چند نارنگ صاحب یا بھنڈصاحب کی حمایت، تائید یا پھر ان کی مخالفت میرا مقصد نہیں ہے"۔[123]

اسطرح جاوید حیدرنے کبھی نارنگ صاحب کو تو کبھی بھنڈر کو، دونوں کی خامیوں کو بتانے کی کوشش کی۔ مگر جھکاؤ نارنگ صاحب کی طرف محسوس ہوتاہے۔

تنہا تماپوری کا یہ مکتوب تو شمارہ نمبر 12 میں چھپا ہے لیکن یہاں جاوید حیدر جوشیہ کے متعلق تنہا تماپوری کے خیالات کو دیکھنا ضروری معلوم ہوتاہے۔ انہوں نے جدید ادب کے شمارہ نمبر ۹، ۱۰، ۱۱، کاجائزہ لیتے ہوئے تحریر فرمایاہے۔

"جدید ادب شمارہ نمبر نو، شمارہ نمبر دس، اور شمارہ نمبر ۱۱ میں جناب گوپی چند نارنگ پر جناب عمران شاہد

---

[122] ادارتی نوٹ : جدید ادب نمبر ۱۰

[123] جدید ادب شمارہ نمبر ۱۰، عکاس ۹ ص ۴۳

بھنڈر کے مضامین کا ہنگامہ۔ آپ کے ادارتی نوٹ اور جوشیہ صاحب کا ردعمل یہ سب خصوصی توجہ کے مستحق ہیں۔ جناب عمران شاہد بھنڈر نے اپنے انکشافات کو بڑے مدلل طریقہ سے اقتباسات اور حوالوں کے ساتھ پیش کرتے ہوئے مغربی مفکرین کی نقالی اور سرقے کو ہی نارنگ کی ادبی شناخت ثابت کردیاہے۔ اس سلسلے میں محترم شبانہ یوسف نے ان تمام کتب تک رسائی حاصل کی جن کا حوالہ بھنڈر صاحب نے اپنے مضمون میں دیا۔ محترمہ کا تفصیلی خط شمارہ نمبر گیارہ بے حد اہم گواہی پش کرتاہے۔ جس کے بعد شک و شبہ کی کوئی گنجائش باقی نہیں رہتی۔ اب اس بحث نے نیا دروازہ کھول دیاہے۔ فی الوقت نارنگ صاحب کی مجرمانہ خاموشی پر ہنسی آرہی ہے۔ ردعمل کے طورپر جاوید حیدرجوشیہ صاحب کا مضمون نفس مضمون سے ہٹ کر ذاتیات کو نشانہ بتاتے ہوئے مخالفت برائے مخالفت کا ایک نمونہ پیش کرتاہے۔ آگے آگے دیکھئے ہوتاہے کیا"۔[124]

تیسرا مضمون عمرانہ شاہد بھنڈرکا ہے۔ "اردو ادب میں سرقہ اور اس کا دفاع کب تک"؟ کے عنوان سے لکھاہے۔ اس خصوص میں یہ بتادینا ضروری ہے کہ شمارہ نمبر ۹، کے انکشاف کے بعد جس قسم کا ردعمل آیاہے وہ خطوط کے صفحات میں ہے۔ اس پر بھی حیدرقریشی صاحب نے نرم روی

---

[124] مکتوب، نتہاتماپوری، جدید ادب شمارہ نمبر ۱۲، اور عکاس شمارہ نمبر ۹، ص ۲۰، ۲۱۔

اختیار کی اور کہاکہ نارنگ صاحب کی ذات کو ہدف بنانا مناسب نہیں۔ مگر اس ردعمل کا رد عمل کیاہوا یہ بھی سنئے۔

حیدرقریشی اپنے ادارتی نوٹ کے تیسرے پیراگراف میں لکھتے ہیں:

> "عمران شاہد کے مضمون پر قارئین کا جو مختصر ردعمل سامنے آیاہےاسے خطوط کے سفحات میں شامل کیاہے۔ یہاں ان پانچ مکتوب نگاروں سے معذرت کرنا ضروری ہے۔ جنہوں نے مختصر ردعمل میں کچھ غیر متعلق باتیں چھیڑ کرنارنگ صاحب کی ذات کو ہدف بنالیا۔ ایسے ایکمکتوب میں "حالی کے بعد والے کی عملی بدحالی" کے الفاظ نرم ترین الفاظ کہے جاسکتے ہیں۔ اصلاً عمران شاہد نے نارنگ صاحب کو بلاحوالہ ترجمہ کے شائستہ الفاظ سے ملزم کیاتھا۔ لیکن ان کے غیر ضروری دفاع کے نتیجہ میں اب براہ راست سرقہ کی بات ہونے لگی ہے"۔ [125]

مضامین کی مفصل فہرست اس طرح ہے:

۱۔	خطبہ صدارت	شہزاداحمد
۲۔	عینی آپا کچھ یادیں، کچھ باتیں	ڈاکٹر ستیہ پال آنند
۳۔	قرۃ العین حیدرکا افسانہ	ڈاکٹر حامد اشرف
٤۔	صبا اکبر آبادی کی غزل	ڈاکٹر خلیق انجم
٥۔	جوگندرپال ہمارے عہد کا ایک اہم کہانی کار	عبداللہ جاوید
٦۔	"زرد کتا"--- ایک تجزیہ	عبدالرب استاد
۷۔	قدیم چینی شاعر	یونس خان

گوشہ اکبرحمیدی کے تحت:

---

125 جدید ادب شمارہ نمبر ۱۰ ، اور عکاس شمارہ نمبر ۹، ص ٤۱

۱۔ کوائف اکبر حمیدی محمد زبیر ٹیپو
۲۔ اکبر حمیدی کا مجموعہ شہر بدر ڈاکٹر رشید امجد
۳۔ اکبر حمیدی اور جدید غزل شہزاد احمد
٤۔ اکبر حمیدی کے دو نئے مجموعے حیدرقریشی
۵۔ چند قدم۔ قد آدم کے ساتھ سید ضمیر جعفری
٦۔ چھوٹی دنیا بڑے لوگ سید معین الرحمٰن
۷۔ اکبر حمیدی کی خاکہ نگاری جاوید حیدر جوئیہ
۸۔ جست بھر زندگی منشایاد
۹۔ اکبر حمیدی کی خود نوشت ڈاکٹر نذر خلیق
۱۰۔ جست بھرزندگی حیدرقریشی
۱۱۔ اشتہاروں بھری دیواریں سلیم آغا قزلباش
۱۲۔ اکبر حمیدی کی اشتہاروں بھری دیواریں خاوراعجاز
۱۳۔ اکبر حمیدی کے انشائیے کی کہانی محمودداحمد قاضی
١٤۔ ٹوٹنے میں جلدی نہ کریں خلیق الرحمٰن

خصوصی مطالعہ کے تحت تین مضامین اسطرح ہیں۔
گوپی چند نارنگ مترجم یا مصنف؟
۱۔ ادارتی نوٹ حیدرقریشی
۲۔ رد عمل جاوید حیدر جوئیہ
۳۔ اردو ادب میں سرقہ اور اس کا دفاع کب تک؟ عمران شاہد بھنڈر

جدید ادب شمارہ نمبر 11، جولائی تو دسمبر 2008

اس شمارہ میں پانچ مضامین ہیں۔ اور گوشہ میں حسن عباس رضا کا گوشہ ہے اس کے تحت پانچ مضامین ہیں۔ جبکہ خصوصی مطالعہ کے تحت پانچ اور تفصیلی مطالعہ کے تحت تین مضامین ہیں۔ اس طرح کل ملاکر مضامین کی تعداد 18 ہوگئی ہے۔



اس شمارہ میں بھی عمران شاہد بھنڈار کا مضمون "گوپی چند نارنگ کی سچائی اور تناظر سرقے کی زدمیں" کے عنوان کے تحت لکھاہے۔ اسطرح اس کے علاوہ دیگر مضامین بھی اہم ہیں۔

فہرست مضامین اسطرح ہے:

۱۔ عبدالرحیم نشتر کی غزل میں شام کا استعارہ ڈاکٹر قمررئیس
۲۔ کرناٹک میں اردو غزل عبدالرب استاد
۳۔ یوسفیات... ایک مطالعہ مبشر احمد میر
٤۔ سارترکا فلسفہ وجودیت شبانہ یوسف
٥۔ مدیر جدید ادب کے نام خط عمران شاہد بھنڈر

گوشہ حسن عباس رضا کی تفصیلات اسطرح ہیں:

۱۔ من آنم کہ من دانم حسن عباس رضا
۲۔ حسن عباس رضا کا فکری منظر نامہ ڈاکٹر اعجاز راہی
۳۔ حسن عباس رضا اشرف قریشی
٤۔ حسن عباس رضا کی شاعری حمیرہ رحمٰن
٥۔ حسن عباس رضا معاصر کی نظر میں فیض احمد فیض، احمد ندیم قاسمی احمد فراز، گلزار، کشورناہید، افتخار عارف
٦۔ دس غزلیں اور چار نظمیں(انتخاب) حسن عباس رضا

خصوصی مطالعہ کے تحت:

۱۔ اگیان احمد ہمیش
۲۔ ایسا بھی نہیں کہ---- احمد ہمیش
۳۔ پیرادانا کی کھوج میں احمد ہمیش
٤۔ گوپی چند نارنگ کی سچائی اور تناظر سے سرقے کی زد میں عمران شاہد بھنڈر

۵۔ مجتبیٰ حسین کی طنزومزاح نگاری کا سرسری جائزہ
ڈاکٹر روبی شبانہ

جدید ادب شمارہ نمبر۱۲: جنوری تا جون 2009

اس میں مضامین کی تعداد 8 ہے۔ اور گوشوں میں گوشہ مظفر حنفی کے تحت 12 مضامین اور دوسرا گوشہ احمد حسین مجاہد کا ہے اس کے تحت، پانچ مضامین اور تاثرات شامل ہیں۔ اور خصوصی مطالعہ کے تحت 2/ مضامین جبکہ تفصیلی مطالعہ کے تحت پانچ مضامین ہیں۔ اس طرح اس شمارہ میں جملہ مضامین کی تعداد 32/ ہوگئی ہے۔ اور یہ کافی ضخامت لئے ہوئے بھی ہے۔

مضامین کی تفصیلات اسطرح ہیں:

۱۔ اردو کا تہذیبی پل اور ماس میڈیا نصرت ظہیر
۲۔ میرتقی میر۔۔ شاعر آہ ڈاکٹر شہناز نبی
۳۔ اکبرالہٰ آبادی اور تعلیم نسواں ڈاکٹر شہناز نبی
٤۔ عمرخیام۔ شراب حقیقت کا طلبگار ڈاکٹر حامد اشرف
۵۔ برصغیر میں فارسی ادب کی روایت مبشر احمد میر
٦۔ میزان شناسائی۔ انسانی اقدار کی شاعری اسلم رسولپوری
۷۔ انیسویں صدی کے نثری اسالیب محمد خالد انجم عثمانی
۸۔ مدیر جدید ادب کے نام خط عبداللہ جاوید

گوشہ مظفر حنفی کے تحت:

۱۔ باتیں مظفر حنفی: مصاحبہ آفرین حسین، مشتاق احمد حامی



۲۔ قلمی چہرہ ظفر احمد نظامی
۳۔ صریر خامہ محمد حسن
٤۔ صریر خامہ، تلاش و تجزیہ محمود ہاشمی
۵۔ نثروغزلدستہ/ ایک تنہاشاعر احتشام حسین
٦۔ طلسم حروف ڈاکٹر انورسدید
۷۔ ایک تنہا شاعر شمس الرحمٰن فاروقی
۸۔ پانی کی زبان ندافاضلی
۹۔ دوغنڈے(افسانوی مجموعہ) ڈاکٹر رشید امجد
۱۰۔ شادعارفی: ایک مطالعہ عنبر شمیم
۱۱۔ اردو کا جام جہاں نما۔ پروفیسر مظفر حنفی فاروق اگلی
۱۲۔ ہمارے مشاعرے پروفیسر مظفر حنفی
۱۳۔ چوبیس غزلیں اور سات نظمیں(انتخاب) پروفیسر مظفر حنفی

گوشہ احمد حسین مجاہد کے تحت:

۱۔ احمد حسین مجاہد (جواپنے کناروں سے باہر بھی موجود ہے) ضیاالمصطفیٰ ترک
۲۔ صفحہ خاک محمد اظہار الحق
۳۔ احمد حسین مجاہد کی شاعری اور ہمارے خواب جان عالم
٤۔ لفظ کی دریافت سے بازیافت تک شعبہ طراز
۵۔ چند تاثرات احمد ندیم قاسمی، قتیل شفائی، ساقی فاروقی افتخار عارف، خاور اعجاز، ڈاکٹر فرمان فتحپوری آصف ثاقب و دیگر
٦۔ بارہ غزلیں اور چھ نظمیں احمد حسین مجاہد

خصوصی مطالعہ کے تحت:



۱۔ مولانا رومی: ایران سے چل کر ہالی ووڈ تک کی زیارت
ستیہ پال آنند
۲۔ ---- ادبی کائنات میں رنگ
حیدرقریشی
۳۔ چندپرانی اور نئی یادیں
حیدرقریشی

تفصیلی مطالعہ کے تحت:

۱۔ مندروالی گلی منشایاد
۲۔ اردو لغت(مدیراعلیٰ: ڈاکٹر فرمان فتح پوری)
۳۔ فرشتے کے آنسو جاوید انور
٤۔ بام بقاء عبدالرب استاد
۵۔ فکرعظیم ڈاکٹر حامد اشرف

جدید ادب شمارہ نمبر ۱۳: جولائی تا دسمبر 2009ء

اس میں مضامین کی تعادا 9 ہے۔ اور تین گوشہ ہیں۔ پہلا گوشہ سلطان جمیل کے تحت 7مضامین اور تاثرات شامل ہیں۔ دوسرا گوشہ، گوشہ عبداللہ جاوید کا ہے جس کے تحت 8 مضامین اور تین اقتباسات شامل ہیں۔ تیسرا گوشہ گوشہ پروفیسر ناصر احمد کے تحت۔ 4 مضامین اور 4 اقتباسات ہیں۔ اس طرح جملہ 27 مضامین ہیں اور یہ شمارہ نمبر 12 سے ضخیم ہوگیاہے۔

مضامین کی تفصیلات اسطرح ہیں:

۱۔ پروفیسر مسعود حسین خاں: ۹۰ ویں سالگرہ
پروفیسر مرزا خلیل احمد بیگ
۲۔ فکراقبال (اقبال کی نثر کے حوالے سے) ڈاکٹر نذیرخلیق
۳۔ حیدرآباد کرناٹک میں اردو تنقید عبدالرب استاد

٤۔ روح کا عالمی تصور رفیق شاہین
٥۔ اردو ناولٹ کا مقام و منصب اطہر معز
٦۔ ماہیا کا آغاز و ارتقا، اور اردو میں ماہیا نگاری صبیحہ خورشید
٧۔ فہمیدہ ریاض کی شاعری میں عصری حسیت مرتضیٰ اطہر
٨۔ اقبال اور ماریش آصف علی محمد
٩۔ مدیر جدید ادب کے نام خط اور تبصرہ ڈاکٹر انورسدید

گوشہ سلطان جمیل نسیم:

١۔ کوائف سلطان جمیل نسیم
٢۔ سلطان جمیل نسیم اور ان کے افسانے میرزاادیب
٣۔ بتیس سال کی ریاضت کے بعد انتظار حسین
٤۔ سلطان جمیل نسیم کے افسانے مشفق خواجہ
٥۔ میں آئنہ ہوں اسلم فرخی
٦۔ سلطان جمیل نسیم کی جدیدیت کی طرف پیش قدمی ڈاکٹر انورسدید
٧۔ ادھوری کہانیاں، ادھورے خواب ڈاکٹر خالد سہیل
٨۔ سلطان جمیل نسیم کی افسانہ نگاری کے بارے میں تاثرات:

ڈاکٹر وزیر آغا، جوگندرپال، شوکت صدیقی، محمد خالد اختر، ممتاز مفتی، عرش صدیقی، منشایاد، محمد علی صدیقی، نسیم درانی، ڈاکٹر حسن منظر، آغا سہیل، احمد ہمدانی، جتیندر بلو

مترفق اقتباسات: غلام عباس، شفیق الرحمٰن، احمد ندیم قاسمی، رشید امجد،
جوگندر پال، قیصر تمکین، محافظ حیدر۔

افسانہ : من مانی سلطان جمیل نسیم

افسانہ : سچ کے سوا کچھ نہیں سلطان جمیل نسیم

گوشہ عبداللہ جاوید:

۱۔ گوشہ کے حوالے سے ایک خط بنام حیدرقریشی
عبداللہ جاوید
عبداللہ جاوید۔ مختصر تعارف

۲۔ موج صدرنگ حسن عابدی

۳۔ تاثرات رائیس امروہوی، جوگندر پال، انور احمد زئی

٤۔ حصار جاں الیاس عشقی

٥۔ عبداللہ جاوید کی شاعری اکرام بریلوی

٦۔ اقتباس ابوالخیر کشفی

۷۔ شاعر صدرنگ رضی مجتبیٰ

۸۔ اقتباس دیوندراسر

۹۔ عبداللہ جاوید کے افسانے مبین مرزا

۱۰۔ اقتباسات شہناز خانم عابدی

۱۱۔ مجھے بھی کچھ کہنا ہے شہناز خانم عابدی

۱۲۔ افسانہ: میری بیوی عبداللہ جاوید

۱۳۔ عبداللہ جاوید کی غزلیں اور نظمیں

گوشہ پروفیسر ناصر احمد:

۱۔ ادب کے ایک سنجیدہ قاری: پروفیسر ناصر احمد ادارتی نوٹ

۲۔ اقتباسات ڈاکٹر ظہور احمد اعوان

۳۔ زندہ انسان مرا نہیں کرتے ڈاکٹر ظہور احمد اعوان



٤۔ اقتباس حیدرقریشی
٥۔ ایک انسان دوست شخصیت صادق باجوہ
٦۔ اقتباس بشریٰ ہما
٧۔ رانجھے کے ماموں حیدرقریشی
٨۔ اقتباس منشایاد
٩۔ شوکت صدیقی۔ ایک سوانحی مونتاژ ستیہ پال آنند
١٠۔ کالم نمی دانم(دیکھو مجھے جودیدہ عبرت نگاہ ہو) نصرت ظہیر
١١۔ انشائیہ جھڑکیاں سید تحسین گیلانی

تفصیلی مطالعہ کے تحت:

١۔ تاثراور تنقید۔۔ ایک مطالعہ محمد اسلم رسولپوری
٢۔ مقدمہ شعروشاعری فریدہ بیگم
٣۔ صفحہ خاک حیدرقریشی

جدید ادب شمارہ نمبر ١٤: جنوری تا جون 2010ء

اس میں 7 مضامین ہیں اور دو گوشے ہیں۔ پہلا گوشہ ہمت رائے شرما کا ہے جس کے تحت 8 مضامین اور اقتباسات پر مشتمل ہے۔ دوسرا گوشہ حمایت علی شاعر کا ہے۔ جس کے تحت 8 مضامین اور ایک ادارتی نوٹ ہے۔ ان 8 مضامین کی خصوصیت یہ ہے کہ یہ سب مختلف موضوعات کے تحت حمایت علی شاعر کے ہی لکھے ہوئے ہی۔ خصوصی مطالعہ کے تحت 5 اور تفصیلی مطالعہ کے تحت 3 مضامین ہیں۔ اس طرح اس شمارہ میں جملہ 31 مضامین ہوگئے اور یہ بھی ضخامت کے لحاظ سے اپنے پچھلے شماروں کےمقابلہ میں برابر ہے۔

مضامین کی تفصیلات اسطرح ہیں:

١۔ اقبال کا فکری نظام عامر سہیل
٢۔ عرض، معروض اور شعری بوطیقا معیدرشید



٣۔ مجیدامجد کی نظم نگاری محمد شفیع بلوچ
٤۔ حالی، یادگار حالی کی روشنی میں ڈاکٹر حامد اشرف
٥۔ پروفیسر قمررئیس اویس سنبل
٦۔ حیدرآباد، کرناٹک کے ادب میں تحریکات ورجحانات کوثر فاطمہ
٧۔ ناصر نظامی کے نام خط مقصود الہی شیخ

گوشہ ہم رائے شرما کے تحت:
١۔ شہاب ثاقب پر تاثرات فراق گورکھپور
٢۔ ہمت رائے شرما، ہمہ گیر شخصیت ڈاکٹر خلیق انجم
٣۔ مختصر تاثرات مالک رام، ظ انصاری، خواجہ احمد عباس
٤۔ اردو ایسی لکھی اور بولی جاتی ہے یوسف ناظم
٥۔ میاں آزاد کا سفر نامہ حیدرقریشی
٦۔ ہمت رائے شرما کی دو کتابیں حیدرقریشی
٧۔ اردو ماہیے کے بانی ہمت رائے شرما صبیحہ خورشید
٨۔ "اردو ماہیے کے بانی، ہمت رائے شرما۔ منزہ یاسمین
٩۔ اقتباسات: (مختلف صفحات پر) یونس اگاسکر، انور انصاری، اخلاق اثر
دھرم ویر، شان الحق حقی، مظہر امام،
١٠۔ ہمت رائے شرما کی شاعری سے انتخاب
خصوصی مطالعہ کے تحت:
١۔ ہماری تاریخ فہمی---- حسن جعفر زیدی
٢۔ لاکے کگار پر احمد ہمیش
٣۔ عدم رنگ احمد ہمیش

تفصیلی مطالعہ کے تحت:
١۔ بہت کچھ کھوگیاہے گلزار



۲۔ اکبر حمیدی کا فن رفیق سندیلوی
۳۔ انل ٹھکر اور خالی خانے عبدالرب استاد

جدید ادب شمارہ نمبر ۱۵: جولائی تا دسمبر 2010ء

اس شمارہ میں مضامین کی تعداد 7 ہے اور دوگوشے ہیں۔ پہلا گوشہ وزیرآغا کی دو طویل نظمیں کہہ کر اور دوسرا گوشہ ایوب خاور کیلئے کہہ کر ہے۔ ہردو گوشوں میں علی الترتیب دو مضامین اور دو طویل نظمیں وزیرآغا کی اور 8مضامین ایوب خاور پر۔ تفصیلی مطالعہ کے تحت 5 مضامین ہیں۔ اور خصوصی مطالعہ کے تحت 8 مضامین ہیں۔ اسطرح اس شمارہ کے کل مضامین 30 ہیں۔ یہ شمارہ بھی زائد از تین سو صفحات پر مشتمل ہے۔ اس میں مضامین کا تنوع ہے اور بعض مضامین بہت اہم ہیں۔

فہرست مضامین اسطرح ہے:

۱۔ نظریہ پاکستان۔ ایک تاریخی مغالطہ اور موجودہ بحران سید حسن جعفرزیدی
۲۔ الکندی اور رمزشناسی خادم علی ہاشمی
۳۔ غالب کا احساس کمتری ڈاکٹر ارشد جمال
٤۔ مولانا آزاد: شش جہت شخصیت عبدالرب استاد
٥۔ ماہیے کی تحریری ہیئت اور ماہیے کا وزن صبیحہ خورشید
٦۔ ارشد کمال: مصلوب روزگار نورالہدیٰ
۷۔ مدیر جدید ادب کے نام خط کاوش عباس

ایک گوشہ: وزیر آغا کی دوطویل نظمیں:

۱۔ دونظموں کا مطالعہ حیدرقریشی
۲۔ آدھی صدی کے بعد وزیرآغا



۳۔ اک کتھا انوکھی وزیرآغا
٤۔ ارشد کمال: مصلوب روزگار نورالہدیٰ
٥۔ مدیر جدید ادب کے نام خط کاوش عباس

خصوصی مطالعہ کے تحت:

۱۔ صبح کا شور ساقی فاروقی
۲۔ سرآسماں، سرزمین احمد ہمیش
۳۔ اس کے نام جسے تارکی نگل چکی انجلا ہمیش
٤۔ ریکھا میترے کے ہندی کو یتائیں ترجمہ نگار: ستیہ پال آنند
٥۔ انشائیہ: کامیابی کی دیوی اکبر حمیدی
٦۔ دوانشائیے: جوٹھا+خاتون بل محمد زبیر ٹیپو
۷۔ لبیک الھم لبیک حیدرقریشی
۸۔ ستیہ پال آنند اور دیگر مہمانوں کا خیر مقد/رپورٹ حیدرقریشی

ایک گوشہ ایوب خاور کے لیے:

۱۔ کوائف ایوب خاور ارشد خالد
۲۔ گل موسم خزاں احمد ندیم قاسمی
۳۔ خواب آمیز عالم بیداری اختر حسین جعفری
٤۔ گلزار کی بات/ آہنگ خاص گلزار / ڈاکٹر انور سجاد
٥۔ خوبصورت ڈکشن اور خوبصورت خیال کا شاعر عطاء الحق قاسمی
٦۔ باقی سب ہوس شکیل عادل زادہ
۷۔ تاثرات امجد اسلام امجد، حیدرقریشی
۸۔ کچھ بھی نہیں بدلا ایوب خاور
۹۔ حمدونعت، سلام، غزلیں اور نظمیں ایوب خاور

تفصیلی مطالعہ کے تحت:

۱۔ "جھاڑیاں اور جگنو" منشایاد
۲۔ "نوبیل ادبیات" سحرانصاری
۳۔ اقبال، فکروعمل پر ایک نظر ڈاکٹر نذرخلیق
۴۔ "سپنوں کا میلہ" ڈاکٹر حامد اشرف
۵۔ "سفرنامہ ہندوستان" آرکے نیازی

جدید ادب شمارہ نمبر ۱۶: جنوری تا جون 2011ء

اس شمارہ میں مضامین 5، ڈاکٹر وزیر آغا کیلئے تعزیتی گوشہ کے تحت 10 مضامین ہیں جبکہ تعزیتی تاثرات میں دنیا کے مختلف ممالک سے دانشوروں، ادیبوں، شاعروں اور اہل علم حضرات کے تاثرات ہیں۔ دوسرا گوشہ ڈاکٹر رضیہ حامد کے لئے ہے اور اس میں 7 مضامین اور چار افسانے شامل ہیں۔ خصوصی مطالعہ کے تحت 3 اور تفصیلی مطالعہ کے زیر فہرست 5 مضامین ہیں۔ اسطرح اس شمارہ میں دو گوشے اور جملہ مضامین کی تعداد 30 ہے۔ یہ مقالہ اپنی ضخامت کے اعتبار سے پچھلے شماروں کو پیچھے چھوڑ دیاہے یعنی قریب 340 صفحات پر مشتمل ہے۔

فہرست مضامین اس طرح ہے:

۱۔ حضرت محی الدین ابن عربی عامر سہیل
۲۔ رومال پر تحریر برٹامولر/مبشر احمد میر
۳۔ اردو میں فنی اور سائنسی تراجم خادم علی ہاشمی
۴۔ مخدوم کی اہم نظموں کا تجزیاتی مطالعہ شیخ محبوب ثاقب
۵۔ جرمنی کا ایک اردو سالہ ڈاکٹر ظہور احمد اعوان

ڈاکٹر وزیر آغا کیلئے تعزیتی گوشہ:

۱۔ انٹرنیٹ پر جاری کی گئی خبر
حیدرقریشی
۲۔ وزیرآغا جدید ردو ادب کے عظیم دانشور اردو
اکادمی دہلی
۳۔ نقاد، انشائیہ نگار اور شاعر بی بی
سی، لندن
٤۔ ایک بڑے ادبی تارے کا غروب منشایاد
۵۔ روشنی سفر میں ہے زاہد حنا
٦۔ آہ! ڈاکٹر وزیر آغا اکبر حمیدی
۷۔ ڈاکٹر وزیر آغا امجد اسلام
امجد
۸۔ ڈاکٹر وزیر آغا: ارو ادب کا آخری ستون افتخار
نسیم
۹۔ ڈاکٹر وزیر آغا بھی رخصت ہوگئے سرفراز
سید
۱۰۔ صدر پاکستان، وزیراعلیٰ پنجاب، چیئرمن اکادمی ادبیات
حکومتی تعزیت

خصوصی مطالعہ کے تحت:

۱۔ انشائیہ: سفر کی تھکن محمد زبیر ٹیپو
۲۔ انشائیہ: ہمسائیہ محمد زبیر ٹیپو
۳۔ زندگی درزندگی(کھٹی میٹھی یادیں)
حیدرقریشی

ایک گوشہ ڈاکٹر رضیہ حامد کے لیے:

۱۔ سوانحی و ادبی خاکہ
۲۔ تحقیق و ادب کے بے لوث ادبیہ محمد احمد
سبزوری
۳۔ ڈاکٹر رضیہ حامد: بھوپال کی ہونہار بیٹی پروفیسر
عبدالقوی دسنوی
٤۔ ڈاکٹر رضیہ حامد : منفرد تنقید نگار خاتون ڈاکٹر بشیر بدر



۵۔ ڈاکٹر رضیہ حامد سلطانہ مہر
٦۔ ادب اور صحافت کی جاوداں نقیب رشید انجم
۷۔ لمحوں کا سفر۔ ایک نظر میں پروفیسر اظہار الحسن
۸۔ نقوش بھوپال ڈاکٹر خلیق انجم
۹۔ نگارشات: آسماں تری رفعتوں پہ ناز کرے ڈاکٹر رضیہ حامد
۱۰۔ افسانہ : وراثت ڈاکٹر رضیہ حامد
۱۱۔ افسانہ: زندگی کے ہزاررنگ ڈاکٹر رضیہ حامد
۱۲۔ افساہ : سہارا ڈاکٹر رضیہ حامد

تفصیلی مطالعہ

۱۔ فرحت پروین کے افسانے منشایاد
۲۔ نہال دل پر سحاب جیسے ڈاکٹر انور سدید
۳۔ غزلیں عبدالرب استاد
٤۔ کتاب دل و دنیا حیدرقریشی
۵۔ حامد اشرف کی تنقید نگاری حیدرقریشی

جدید ادب شمارہ نمبر17۔ جولائی تا دسمبر 2011ء

اس شمارہ میں فیض صدی کے عنوان سے 2 اور مضامین کے تحت 7 مضامین ہیں۔ اس شمارہ میں بھی دو گوشہ ہیں۔ پہلا گوشہ ڈاکٹر ظہور احمد اعوان کا ہے۔ اس میں بھی 8 مضامین ہیں۔ دوسرا گوشہ ڈاکٹر ناصر عباس نیر پر ہے۔ جس میں 6 مضامین اور تاثرات میں اردو ادب کی مقتدر شخصیتوں جن میں ڈاکتر وزیر آغا، گوپی چند نارنگ ، ڈاکٹر وحید قریشی، شمیم حنفی، ستیہ پال آنند، ابوالکلام قاسمی، حیدرقریشی، حقانی القاسمی وغیرہ کے تاثرات ہیں۔

خصوصی طماعہ کے باب میں 3 اور تفصیلی مطالعہ کے باب میں 4 مضامین شائع ہوئے ہیں۔ اسطرح اسشمارہ میں مضامین کی تعداد 30 ہوئی ہے۔ یہ شمارہ چونکہ ناصر عباس نیر کے گوشے پر مشتمل ہے۔ جنہوں نے مابعد جدیدت پر کام کیا اور

بہت دقیع کام کیاہے۔چنانچہ ناصر عباس کی تنقید نگاری کو سمجھنے اور مابعد جدیدیت کے نظریے یا تھیوری کو سمجھنے میں مدد دیتاہے۔

مضامین کی فہرست اسطرح ہے:

۱۔ بیدی کے افسانوں کے فکری سروکار ڈاکٹر پرویز شہریار
۲۔ تخیل کی شرح معیدرشیدی
۳۔ جوگندرپال: فنکار اب بھی بول رہاہے فیاض احمد وجیہہ
٤۔ نذیرفتح پوری اور اردو ماہیا عبدالرب استاد
٥۔ زیب النساء الامہ شبلی کی نظر میں احمدنوید یاسراذلان حیدر
٦۔ بین الاقوامی سطح پر ماہیا نگاری صبیحہ خورشید
۷۔ مدیر جدید ادب کے نام سہیل اختر

تعزیتی گوشہ ڈاکٹر ظہور احمد اعوان کے لیے:

۱۔ ڈاکٹر ظہور احمد اعوان کی ہمہ جہت شخصیت کے چند پہلو شبیر حسین امام
۲۔ آخری دیدار صبیح احمد
۳۔ مقابلہ ہے آئینہ (ہوتے ہیں فتنہ ساز یہی درمیاں کے لوگ) ناصر علی سید
٤۔ ادھوری ملاقات عتیق صدیقی
٥۔ ڈاکٹر ظہور احمد اعوان کی علمی و ادبی اور صحافتی خدمات صباجاوید
٦۔ آخری کالم، آخری دل پشوری ڈاکٹر ظہوراحمد اعوان
۷۔ اچھے انسان مرانہیں کرتے ڈاکٹر مظہوراحمد اعوان

۸۔ افتخار نسیم افتی ڈاکٹر مظہور احمد اعوان

خصوسی مطالعہ کے تحت:

۱۔ نثری نظم: طعد اسکے احمد ءہمیش
۲۔ آسیب ذات انجلاءہمیش
۳۔ امن کی آشا انجلاء ہمیش

گوشہ ڈاکٹر ناصر عباس نیئر:

۱۔ کوائف ناصر عباس نیر ادارہ
۲۔ تاثرات : ڈاکٹر وزیر آغآ، ڈآکٹر گوپی چند نارنگ، ڈاکٹر وحید قریشی، شمیم حنفی، ستیہ پال آنند، ابوالکلام قاسمی، حیدرقریشی
۳۔ مختلف صفحات پر: محمد علی صدیقی، قیصر نجفی، عطیہ سکندر علی، حقانی القاسمی
٤۔ ناصر عباس نیر میری نظر میں شناوراسحاق
٥۔ ناصر عباس نیر کی تنقید کے امتیازات یٰسین آفاقی
٦۔ اردو تنقید ی منظر نامے میں ناصر عباس نیر کے امتیازات قاسم یعقوب
۷۔ تعبیروتوثیق متن کی عمدہ مثال غلام شبیر اسد
۸۔ متن، سیاق اور تناظر ناصر عباس نیر
۹۔ محمد حسین آزاد کے لسانی تصورات: مابعد نو آبادیاتی مطالعہ ناصر عباس نیر

تفصیلی مطالعہ کے تحت:

۱۔ ہم کلام ہوتاہوا ماہیا (خاموش ہ ہوماہیا) امین خیال

۲۔ میری گفتگو تجھ سے ڈاکٹر ارشد جمال
۳۔ مرارخت سفر ترنم ریاض
٤۔ افریقی کہانیاں (اک شب آوارگی) حیدرقریشی

جدید ادب شمارہ نمبر 18، جنوری تا جون 2012ء

اس شمارہ میں مضامین کے باب میں 6 مضامین ہیں۔ اس کے بعد "عمران بھنڈر کے جعلسازی اور سرقہ کی کہانی" کے تحت حیدرقریشی کا مضمون بعنوان" فلسفی کی نوجوانی اور شیلا کی جوانی" ہے۔

جبکہ ردعمل کے تحت دانشوروں، شاعروں اور ادیبوں کے تاثرات بھی درج ہیں۔ اس کے تحت جملہ 4 مضامین خود حیدرقریشی کے ہیں ۔ جبکہ حیدرقریشی کی وضاحتوں کے جواب میں ڈاکٹر ندر خلیق کا مضمون ہے۔ اسطرح جملہ 5 مضامین ہیں۔

اس شمارہ میں بھی دو گوشے چھپے ہیں۔ پہلا ترنم ریاض کیلئے اس باب میں 3 مضامین اور ترنم ریاض کی دوتحریریں ساتھ میں تاثرات اور آراء ہیں۔ دوسرا گوشہ نذیر فتح پوری کیلئے ہے۔ اس میں اجمالی تعارف اور ادب کی معتبر شخصیات کے تاثرات کے ساتھ 5 مضامین اور خود نذیر فتح پوری کی ایک تحریر اور ان کی غزلیں ماہیے درج ہیں۔

خصوصی مطالعہ کے تحت 3 مضامین اور تفصیلی مطالعہ کے باب میں 2 مضامین ہیں۔ اس طرح شمارہ نمبر 18 کے تحت جملہ مضامین کی تعاداد 22 ہے۔

مضامین کی تفصیلات :

۱۔ یورپ بہ طورکبیر بیانیہ ڈاکٹر ناصر عباس نیر
۲۔ الاصمعی، عبدالمالک بن قریب خادم علی ہاشمی

۳۔ جمیل الرحمٰن کی چار سالہ شاعری کا سفر اور نتیجہ احسان سہگل
٤۔ خالد سہیل۔ محبت اور انسانیت کا استعارہ ڈاکٹر بلند اقبال
٥۔ سہراب سپہری، عارف جدید ایران ڈاکٹر انجم ضیاء الدین ناجی
٦۔ غالب کی کہانی حالات کی زبانی ہاجرہ بانو

عمران بھنڈر کی جعلسازی اور سرقہ کی کہانی:
"فلسفی" کی نوجوانی اور شیلاکی جوانی
حیدرقریشی
شمس الرحمٰن فاروقی، عمرمیمن، انورسدید
سی ایم نعیم، ڈاکٹر ریاض اکبر، راجہ محمد یوسف خان
خادم علی ہاشمی، شاہد جمیل، نذیر فتح پوری، عبداللہ
جاوید، ڈاکٹرعبدالکریم، معیدرشیدی، حمید معین رضوی ،
حمیدرضوی، ڈاکٹر رضیہ اسمعیل، قاسم
یعقوب، سلیمان جاذب، ڈاکٹر پرویز شہریار، منشایاد
سہیل اختر، سلیم آغا قزلباش
بسلسلہ "فلسفی" کی جوانی اور شیلا کی جوانی حیدرقریشی
مزید ردعمل سی ایم نعیم، محمد عمرمیمن، نذیر فتح پوری، کاوش عباس،
عمران بھنڈر کا سرقہ اور جعل سازی حیدرقریشی
چند وضاحتیں حیدرقریشی
ای میل سے اقتباس حمید معین رضوی
حیدرقریشی کی وضاحتوں کے جواب میں ڈاکٹر نذیرخلیق
ایک گوشہ ترنم ریاض کے لیے:



چند آراء سلیمان اطہر جاوید، علیم اللہ حالی، صغیرافراہیم، حقانی القاسمی
گنجفہ باز خیال وارث علوی
ترنم ریاض کے افسانے، تخلیقیت کے رنگ پروفیسر حامدی کاشمیری
ترنم ریاض کا ناول: برف آشنا سید محمد اشرف
افسانہ چمکادڑ ترنم ریاض
خطائے مسلسل اور دیدہ دلیری ترنم ریاض
مختلف صفحات پر درج تاثرات مغنی تبسم، عبیدالرحمٰن ہاشمی، ایس ایم کوثر رضوی
١٤ نظمیں ترنم ریاض

خصوصی مطالعہ:

بات کرکے دیکھتے ہیں(ستیہ پال آنند) ناصر علی سید
دائرہ دھنک ہاجرہ بانو
آب حیات ہاجرہ بانو
ایک گوشہ تغیرفتح پوری کیلئے:
نذیر فتح پوری۔ اجمالی تعارف ادارہ
تاثرات ڈاکٹر وزیر آغا، شمس الرحمٰن فاروقی، رضانقوی واہی،
بشیر بدر، مجروح سلطان پوری، اودے سرن ارمان،
پروفیسر عنوان چشتی، بلراج کومل، فضاابن فیضی،
ریاض فتح پوری۔ ایک مینارہ آدمی ریاض بجنوری
نذیرفتح پوری کے یہاں تتلی کا شعری پیکر اسلم حنیف
نئے گیتوں خا مسافر بیکل اتساہی
شعرائے پونہ ایک تحقیق رفیق شاہین
نذیر فتح پوری خواتین اہل قلم کی نظر میں ڈاکٹر قمر جہاں/ڈاکٹر حسن آراء
گفت باہمی نذیر فتح پوری

دیوان کی غزلیں (انتخاب) نذیر فتح پوری
ماہیے نذیر فتح پوری

تفصیلی مطالعہ کے تحت:

۱۔ پروین شیر کی شاعری۔ ایک ماحولیاتی مطالعہ
عتیق اللہ
۲۔ ترقی پسند نظم نمبر اور میراجی
حیدرقریشی

جدید ادب شمارہ نمبر 19: جولائی تا دسمبر 2012

یہ شمارہ "میراجی نمبر" ہے۔ اور کافی ضخیم بھی۔ یہ شمارہ اردو کے ادبی رسائل میں بلکہ ابتک کے رسائل میں ایک خاص اہمیت اور انفرادیت رکھتاہے۔ اس میں میراجی پر ادب کی اہم اور نابغہ روگار شخصیتوں کے مضامین ہیں۔ اس میں ان احباب کی تحریرات بھی ہیں جنہوں نے میراجی کے ساتھ زندگی گذاری۔ انھیں قریب سے دیکھا ان کو سنا اور ان کی شخصیت کو قریب سے جانتے بھی تھے۔ انہوں نے ان کی شخصیت اور ادب پر لکھا۔ اسطرح یہ شمارہ سے متعلق لکھاہے کہ۔

"جدید ادب کے اس میراجی نمبر میں ان کی شخصیت سےزیادہ ان کے فن کی مختلف جہات کو موضوع بنانے کی کوشش کی گئی ہے۔ اس سلسلہ میں بعض ایسے مطبوعہ مضامین کو خصوصی طورپر شامل کیاگیاہے جو میراجی کے فن کی تفہیم اور ادب میں ان کے مقام و مرتبہ کے تعین میں بنیادی حیثیت رکھتے ہیں۔ نئے مضامین کے حصول کے سلسلہ میں ایک خوش کن

پہلویہ سامنے آیا کہ نئے لکھنے والوں
نے اس میں گہری دلچسپی لی"[126]

اس کے ساتھ ہی حیدرقریشی نے اپنے اس نمبر کی خاص اشاعت پر قارئین سے پر امید بھی ہیں اور مستقبل میں میراجی کے فن کو پڑھا جائیگا اور ان کی تفہیم کے امکانات بھی کھل کر سامنے آئیں گے۔ چنانچہ لکھتے ہیں۔

"میراجی کی پیدائش کے سوسال پورے ہونے پر میری طرف سے یہ ایک چھوٹا ساتحفہ ہے۔ امید کرتاہوں کہ اس نمبر کی اشاعت کے بعد میراجی کے مطالعہ کارجحان بڑھے گا۔ جیسے جیسے میراجی کو زیادہ پڑھاجائے گا ویسے ویسے ان کی تفہیم کے امکانات کھل کر سامنے آتے جائیں گے۔ انشاء اللہ۔[127]

اسطرح آیئے اس کے مشمولات پر نظر ڈالیں تو اس میں مضامین کتنے ہیں معلوم ہوجائےگا۔ ابتداء میں کوائف میراجی، میراجی کے بارے میں تحقیقی، تنقیدی اور تخلیقی کام، ن م راشدکا خط میراجی کے نام، میراجی کے بارے میں ایک خط اسطرح میراجی شناسی اور وزیر آغا کے باب میں۔ 5 مضامین ڈاکٹر وزیر آغا کے بہت دقیع اور اہم ہیں۔ جبکہ 1 مضمون طارق حبیب کا ہے جس کا عنوان "میراجی شناسی میں ڈاکٹر وزیر آغا کا حصہ" بہت اہم ہے۔

میراجی کی شخصیت اور شاعری کے تحت 7 مضامین ہیں۔ میراجی کی تنقید اور ترجمہ نگاری کے باب میں 5 مضامین ہیں۔ میراجی، نئے لکھنے والوں کی نظر میں" کے تحت 14 مضامین ہیں۔

میراجی کی شاعری کا انتخاب میں

---

[126] جدید ادب شمارہ ۱۹: میراجی نمبر ص ۱۰
[127] جدید ادب شمارہ ۱۹، میراجی نمبر ص ۱۱

19 گیت، 13 غزلیں اور 80نظمیں شامل ہیں۔ اس کے ساتھ میراجی کی نظموں کے تراجم سے زندازہ ہوتاہے کہ میراجی کے فن کا معیار کیارہا، عربی، فارسی، ترکی، ڈچ، روسی، جرمن، اور انگریزی زبانوں میں ان کے نظموں کے تراجم ہوئے۔ اور آخر میں انتظاریہ کے عنوان سے عہد جدید کے نامور نقاد، سرسوتی سمان، شمس الرحمٰن فاروقی کا مضمون ہے۔

یہ شمارہ 600 صفحات پر مشتمل ہے۔ تادم تحریر جدید ادب کے جملہ 19 شمارہ منظر عام پر آئے ہیں۔ یہ جدید ادب کے دور سوم کی بات ہے۔ اس سے حیدرقریشی کی ادبی صحافت کا اندازہ ہوتاہے کہ وہ کس قدر سنجیدہ اور ادب پر گہری نظر رکھنے والا مدیر ہے۔ یہ دنیا کے حالات کے ساتھ ساتھ اد پر گہری نظر رکھنے والا فعال شخص آج کے سائنس اور ٹیکنالوجی سے باخبر اور نئے ذرائع ابلاغ کو نہ صرف بروے کار لانے والا بلکہ اسے اردو سے جوڑ کر اردو کو بھی کمپیوٹرائزڈ کرنے والا واحد شخص ہے جس سے کوئی انکار نہیں کرسکتا۔ یہ حقیقت ہے کہ آج مغربی دنیا میں زندگی گذارتے ہوئےوہاں کی مصروف ترین زندگی میں سائنس لیتے ہوئے ادب اور وہ بھی معاری ادب نہ صرف لکھتے ہیں بلکہ ادب کی آبیاری میں تن، من اور دھن کے ساتھ ساتھ وقت کی قربانی کرنے والی شخصیت کا نام ہی حیدرقریشی ہے۔ انہوں نے ادب کی آبیاری کیلئے سب سے بڑی قربانی وقت کی کی ہے۔ اور ساتھ میں دھن کی بھی۔ آج دنیامیں بہت سے دانشور، مدیران، پروفیسر حضرات ملیں گے جو ادب کے خدمت گذار کی حیثیت سے اپنے آپ کو Expose کرتے رہتے ہیں مگر کوئی حیدرقریشی کے مدمقال کھڑا ہوسکے۔ کوئی نہیں۔ ابتک ہم نے یہی دیکھا کے انہوں نے جملہ 19 شمارے منظر عام پر لائے کہیں کسی شمارے پر بھی قیمت درج نہیں کی۔ ایسا نہیں کہ "جدید ادب" کوئی غیر معیاری جریدہ ہو۔ اس کی مشمولات خود اس کی گواہی دیں گے کہ یہ کس قدر معیاری جریدہ ہے۔

سات سمندر پار بیٹھ کر جہاں نہ ادب کی محفلیں ہیں اور نہ ادبی کتب کے ذخائر۔ اس کے باوجود اردو جسے انہوں نے اپنی مادری زبان جانا اور اس ماں کا حق ادا کرنے میں کس قدر کوشاں اور شادماں نظر آتے ہیں۔ جرمنی میں بیٹھ کردنیا کے کونے کونے پر نظر اور ہر شخص سے جو آپ سے جڑتاہے نہایت خلوص، پیار اور محبت سے پیش آتے ہیں۔ یہ نہیں دیکھتے کہ وہ لکھنے والا نیاہے پرانہ، وہ قاری چھوٹا ہے یا بڑا۔ اگر چھوٹا ہے تو اس کی دلجوئی کرتے اور بڑا ہے تو قدر کرتے نظر آتے ہیں۔ وہ اپنے چاہنے والوں سے ٹوٹ کرچاہتے ہیں اور نہ چاہنے یا ناپسند کرنے والوں کو حقیر بھی نہیں جانتے بلکہ انھیں ان کے حال پر چھوڑدیتے ہیں۔ ایک عجیب سی صوفیانہ چال ان کے ہاں نظر آتی ہیں۔ مجھے ایسا لگتاہے کہ وہ "محبت سب کیلئے نفرت کسی سے نہیں" پر سختی سے کاربند لگتے ہیں۔ جس کی وجہ سے ایسی شخصیت ان کی بن پائی ہے۔

منظر اور پس منظر

جدید ادب کی ادارت تو حیدرقریشی نے سنبھالی اور خالص ادبی پرچہ اپنے قارئین کو پیش کرنے میں کامیاب بھی رہے اور یہ ایک عالمی پرچہ اردو والوں کے نصیب اور مقدر میں آگیا۔ جس میں عالمی اردو ادب کو انہوں نے جس رنگ میں یش کیا اسطرح کسی اور نے پیش نہیں کیا۔ یہ کوئی معمولی خدمت نہیں ہے۔ اردو ادب کے ساتھ ساتھ اردو زبان کو زندہ رکھنے کی سعی قابل تحسین ہی نہیں بلکہ قابل تقلید بھی ہے مگر

کون ہوتاہے مئے مرد افگن عشق

ایک ادیب اور شاعر کے علاوہ حیدرقریشی کی اور بہت سی حیثیتیں ہمارے سامنے آتی ہیں۔ مگر اس وقت اس بات کے حوالے سے انکی مدیرانہ اور صحافیانہ حیثیت کا جائزہ لیاجاتاہے۔ اب تک پچھلے صفحات میں جدید ادب کے جملہ مضامین اور اس کے تنوع پر بات ہورہی تھی۔ ایک ادیب اور شاعر دراصل اپنے عہد کا نباض ہوتاہے۔ اور وہ خاموش نہیں رہ سکتا۔ زمانہ کی تبدیلیوں اور اس میں ہونے والے نشیب و فراز

اور اتھل پتھل کو وہ اپنے ادب کے ذریعہ پیش کردیتاہے۔ کبھی واضح الفاظ میں تو کبھی اشارہ اور کنائیوں میں۔ مگر ادب اشارہ کنایوں ہی میں ہوتاہے۔ ایک زندہ دل ادیب چاہتاہے کہ زمانہ کی چیدہ دستیوں، مظالم اور لوٹ کھسوٹ، رشوت ستانی وغیرہ وغیرہ کو آخر کیسے پیش کرے۔ مگر وہ اپنے ساتھیوں کو، عوام کو اس سے باخبر کرنے کی سبیل تلاش کرتاہے۔ اس تناظر میں غالبؔ کے اس مصرعہ کو دیکھاجائے اس میں آفاقی کیفیت نظر آتی ہے گوکہ وہ کسی اور تناظر میں کیوں نہ لکھا گیاہو۔

کچھ اور چاہیے وسعت مرے بیاں کیلئے

یہی حال ایک زندہ دل اور بیدار مغزادیب و شاعر کا ہوتاہے اور حیدرقریشی نے اس کیفیت سے دل برداشتہ ہوکر قلم اٹھایا اور انٹرنیٹ کالموں کی شکل میں اسے ترتیب دینا شروع کیا۔ دنیاوی حالات دگرگوں ہوتے جارہے تھے۔ انہوں نے دیکھا کہ اس وقت دنیا گلوبل ویلج بن گئی ہے۔ اور حالات کبھی بھی کہیں بھی اثرانداز ہوسکتے ہیں۔ اس کا مرکز کہیں اور ہوتاہے اور حالات بگڑتے کسی اور جگہ ہیں۔ یہ بالغ نظری حیدرقریشی کی کام کررہی تھی۔ چنانچہ انہوں نے اپنے ماضی سے سبق حاصل کرتے ہوئے اپنے گرد پیش کا جائزہ لیا۔ اور حال کو بڑی گہری نظر سے، وسعت نظر سے دیکھا، پھر کبھی اپنی قوم کو آگاہ کرنا شروع کیا، کبھی اپنے ہم وطنوں کو کہ دیکھو سابق میں ایسا کیا تھا تو کیا پایا۔ اور اب اگر ایسا کروگے تو کیاہوگا۔ چنانچہ یہ تمام کالم حالات حاضرہ پر لکھے۔ اس میں کتنی سچائی ہے اور کس قدر حقیقت پر مبنی ہیں یہ آنے والا وقت ہی کرے گا۔ اور مستقبل قریب یا مستقبل بعید میں آنے والے بیدار مغز صحافی، قاری اس کو درست اور صحیح مان لینگےبشرطیکہ غیرجانبدارانہ طورپر اس کا تجزیہ کریں تو۔ ان کالموں میں جہاں امریکہ، ہندوستان، پاکستان، افغانستان اور عرب ممالک کے تجزیہ کیاگیاہے اس میں کس حدتک سچائی درآتی ہے۔ اور حیدرقریشی کو کیا بن پڑا تھا کہ اس کا جائزہ لیں۔ وہ خود کیا کہتے ہیں:



"میں اپنے ادبی اصولوں پر قائم ہوں، جن کے مطابق شدید دکھ کی کیفیات پر فوری طورپر تخلیقی اظہار ممکن نہیں ہوتا اور ایسا جو کچھ لکھاجاتاہے وہ عموماً اچھا فن پارہ نہیں بن پاتا۔ اسی لئے حالات حاضرہ کے شدید دباؤ کے باعث میں نے اپنے دکھ کے اظہار کیلئے ادب کے نام پر سطحی تخلیقات پیش کرنے کی بجائے براہ راست موجودہ حالات پر اپنے جذبات اور خیالات کا اظہار کردیاہے۔ میرے لئے ایسا کرناناگزیر تھا ورنہ شاید میرا دم گھٹ جاتا"۔ [128]

حیدرقریشی نے منظر اور پس منظر کے تحت جملہ (۲۵) انٹرنیٹ کالم لکھے اور بعد کو اسےکتابی صورت میں 2004 میں شائع کروایا۔ اور اس کتاب کو صدر پاکستان جنرل پرویز مشرف کے نام منسوب کیا۔ اور صفحہ 4 پر ان کے متعلق تحریر کیاکہ

"جنرل پرویز مشرف کا سب سے اہم کارنامہ یہ ہے کہ انہوں نے کسی بھی سابقہ فوجی یا سول حکمران کے مقابلہ میں پریس کو نہ صرف سب سے زیادہ آزادی دی ہے۔ بلکہ اپنی ذات پر ہونے والی ہر تنقید کو خندہ پیشانی کے ساتھ برداشت کیاہے"

ان تمام کالموں سے حیدرقریشی کی صحافیانہ نظر کا اندازہ ہوتاہے۔

* * * * *

---

[128] منظر اور پس منظر

خبرنامہ (نہلے پہ نہلا)
(اہم خبروں پر دلچسپ اور تیکھے تبصروں کا سلسلہ)

حیدرقریشی نے اس کتاب کے (دیباچہ) خبرنامہ میں کیاہے کہ "میں ایک معمولی سا شاعر اور ادیب ہوں، معروف معنوں میں صحافی ہرگز نہیں ہوں" یہ دراصل حیدرقریشی نے شعروادب میں سے یہ تھوڑا وقت بچ جاتایا سستانے کی خاطر کچھ وقت نکال لیتے ہیں اس میں انہوں نے اس قسم کے کالم یا خبروں پر تبصرہ کیا۔ اسے ہم منہ کا مزہ بدلنے کیلئے یا ایسے ہی چبینے کے طورپر یا مشروبات کے طورپر کچھ لیتے ہیں والی کیفیت میں لے سکتے ہیں۔ حیدرقریشی نے تھوڑا سا وقت بھی برباد نہیں کیا اور نہ اسے برباد ہونے دیا۔ اسے Waste is Best کے طورپر بھی استعمال کردیا۔ اب اس کا قطعی یہ مطلب نہیں کہ انہوں نے ان کالموں یا خبروں پر تبصرہ کو اس انداز سے لیا جائے۔ یہ دراصل ان کا ذوق ہے کہ وہ حالات حاضرہ پر کس قدر گہری نظر رکھتے ہیں عوام کے لئے ان کا دل کس قدر بے چین رہتاہے اور وہ انسان دوست ہیں۔ اس لئے دنیا بھر کے انسانوں کو وہ اپنا سمجھتے ہیں اور ان کے دکھ میں برابر کے شریک ہوتے ہیں۔

وہ تڑپ اٹھتے ہیں اگر دنیا میں کہیں حالات بگڑجاتے ہیں اور اپنے جذبات کا اظہار قلم سے کرتے نظر آتے ہیں۔ وہ خود خبرنامہ کے صفحہ 9 پر تحریر فرماتے ہیں:

> "--- دراصل ہوا یہ تھا کہ امریکہ میں نائن الیون کے سانحہ کے بعد امریکہ نے دنیا میں غارت گری کا جو سلسلہ شروع کیا اس کے نتیجہ میں باقی دنیا اور بالخصوص تیسری دنیا کے عوام کی طرح میں بھی دکھ اور بے بسی کی کیفیت میں مبتلا تھا۔ اسی کیفیت میں،



میں نے شعروادب کے ذریعہ امریکہ کو للکارنے کے بجائے صحافتی سطح پر اپنے جذبات کا اظہار کرنامناسب سمجھا"۔[129]

خبرنامہ سے پیش تر حیدرقریشی نے "منظر اور پس منظر" کے عنوان سے انٹرنیٹ کالم لکھے جو بعد میں کتابی صورت میں شائع ہوئی۔ خبرنامہ میں انہوں نے ایک تجربے کے طورپر خبروں پر ہلکے پھلکے تبصرے کئے جسے قارئین نے بہت پسند کیا۔ اسطرح کے تجربے ماضی میں کئے گئے اور وہ بہت مقبول رہے۔ اسی انداز کو اختیار کرتے ہوحیدرقریشی نے بھی زمانی اعتبار سے اسے آزمایا۔ سابق میں جن حضرات نے اس قسم کے تجربے کئے تھے ان کا ذکر بھی انہوں نے اپنے اس خبر نامہ میں کیاہے۔ اپنے اس تجربے اور ان اصحاب سے متعلق خود قریشی کیا لکھتے ہیں دیکھئے۔

"----- میرے ساتھ زیادہ گپ شپ کرنے والے دوستوں نے مجھے کہا کہ میں روزانہ جو خبریں پڑھتاہوں ان پر ہلکے پھلکے تبصرے کردیا کروں۔ چنانچہ میں نے اس مشورے کو ٹیسٹ کے طورپر آزمانا چاہاتو قارئین نے اسے "منظر اور پس منظر" سے زیادہ پسند کیا۔ اگرچہ صحافیانہ سطح پر میں اپنے "منظر اور پس منظر" کے 25 کالموں والے کام کو کئی جہات سے زیادہ بہتر اور اہم سمجھتاہوں تاہم مجھے لگا کہ خبروں پر ہلکے پھلکے تبصروں کا یہ سلسلہ بھی کچھ برا نہیں ہے۔ یہ کالم اردوستان ڈاٹ کام پر ساتھ کے ساتھ لگتے گئے۔ یوں ۱۲/اپریل ۲۰۰۳ء سے لے کر ۲۵/ دسمبر ۲۰۰۳ء تک میرے

---

[129] خبرناہ صفحہ ۹



> زیر مطالعہ آنے والی خبروں کا انتخاب اور ان پر میرے تبصرے اب کتابی صورت میں قارئین کے ہاتھ میں ہیں۔ اس قسم کے تبصرے کئی لوگوں نے کئے ہیں۔ جنگ کراچی میں ابراھیم جلیس کا "وغیرہ وغیرہ"، امروز لاہور میں احمد ندیم قاسمی کا "حروف و حکایت" سے لے کر روزنامہ نوائے وقت کے "سرراہے" تک کئی ایسے تبصرہ تمام سلسلے اپنے اپنے ادوار میں مقبول رہے ہیں۔ "سرراہے" کا ماضی قریب کا وہ عارضی دور جب اسے ڈاکٹر انور سدید لکھاکرتے تھے، اپنے اندر ادبی رنگ بھی لئے ہوئے تھا۔ اسی انداز سے ملتا جلتابھی اور کسی حدتک مختلف و منفرد بھی ایک سلسلہ معروف شاعر ظفراقبال نے شروع کیاتھا۔ " سرخیاں ان کی، متن ہمارے" یہ سب دلچسپ صحافتی سلسلے تھے۔ میرے ان کے کالموں کے تناظر میں ہی دیکھا جائے"۔[130]

اسی روشنی میں اگر ان تمام کالموں کو دیکھا جائے تو محسوس ہوتاہے کہ انہوں نے یہ تمام کالم یعنی ہلکے پھلکے تبصرہ ایک خاص وقت کی باتوں پر ان کا ردعمل دکھائی دیتے۔ اور یہ تمام خبریں عالمی، سیاسی اور مذہبی اعتبار سے لکھے گئے ہیں۔ چنانچہ اس تعلق سے حیدرقریشی نے خود اس کے دیباچہ میں ذکر کیاہے۔

> "--- اس لحاظ سے یہ ساری خبریں ایک خاص وقت کے اندر کی باتیں اور ان پر میرا ردعمل ہیں۔ لیکن میں دوسال کے

---

[130] خبرنامہ صفحہ ۹ اور صفحہ ۱۰



بعد جب آج خود انھیں کتابی ترتیب دینے لگا ہوں تو مجھے لگا ہے کہ زمانی قید کے باوجود کئی خبریں ابھی تک تازگی کا احساس دلاتی ہیں اور ہمارے عالمی، علاقائی، مقامی، سیاسی، مذہبی اور دیگر معاشرتی رویوں کے دلچسپ یا المناک پہلوؤں کو سامنے لاتی ہیں۔

میں نے جن دنوں میں تبصروں کا یہ سلسلہ شروع کیا تھا تب ان خبارات کے انٹرنیٹ ایڈیشن باقاعدگی سے میرے زیرمطالعہ رہتے تھے۔ میں نے ان اخبارات سے بھرپور استفادہ کیا۔ پاکستان سے روزنامہ جنگ، اور نامہ نوائے وقت، روزنامہ خبریں، انڈیا سے روزنامہ منصف، روزنامہ سیاست ، روزنامہ انقلاب۔۔۔۔ ان کے علاوہ کئی اہم اور غیر اہم ویب سائٹس سے بھی اور دستیاب ٹی وی چینلز سے بھی استفادہ کرتارہتاتھا"۔[131]

آئے ہم حیدرقریشی کے تبصروں کو دیکھیں کہ آیا انہوں نے خبروں سے متعلق کیا اظہار خیال کیاہے۔

خبر : امریکہ گزشتہ بارہ برسوں سے مسلمانوں کو ظلم و جبر سے آزاد کرانے کی جدوجہد کررہاہے۔ (کولن پاول)

تبصرہ : ہم پہ احساں جو نہ کرتے تو یہ احساں ہوتا۔[132]

---

[131] خبرنامہ صفحہ ۱۰
[132] خبرنامہ ص ۱۰

خبر : امریکہ کے پاس ایران پر حملے کا کوئی جواز نہیں۔ (ایرانی وزیرخارجہ کمال خرازی)

تبصرہ: جواز تو امریکہ کے پاس عراق پر حملے کا بھی کوئی نہیں تھا۔ اگر دنیا سے اخلاقیات اور مسلمہ بین الاقوامی اصولوں کا جنازہ نہ نکل گیا تو امریکہ کبھی بھی اپنے اس جرم کا کوئی اخلاقی اور اصولی جواز نہیں بتاسکے گا جو اس نے عراق پر حملہ کی صورت میں کیاہے۔[133]

خبر : موجودہ حالات میں عراق میں انڈین فوجی دستے نہیں بھیجے جاسکتے۔ اقوام متحدہ واضح مینڈیٹ کے بعد ہی ایسا کوئی قدم اٹھایاجاسکتاہے۔ (انڈیا کی کابینہ کی سلامتی کمیٹی کے اجلاس کا فیصلہ)

تبصرہ : یہ بہت جرات مندانہ فیصلہ ہے۔ کاش پاکستان کی حکمران بہادرفوج بھی اپنے اندر کچھ جرات اور ہمت پیدا کرسکے۔ پاکستانی فوج تو ابھی اپنے مختلف اقدار پر یوٹرن لینے میں لگی ہوئی ہے۔[134]

ان تمام تبصروں کے متعلق معاصرین کی کیا رائے ہے یہ دیکھے:

نصرت ظہیر (دہلی) اپنے ای میل میں لکھتے ہیں۔

"اردوستان میں آپ کا خبر نامہ نظر آیا۔ اچھا تھا۔ ---------- آپ کو سوچ اور باتوں

[133] خبرنامہ ص ١٥

[134] خبر نامہ ص ٩٤



میں بڑا توازن ملتاہے۔ جس سے میں بھی کئی باتیں سیکھ رہاہوں۔[135]

پروفیسر نذر خلیق کا خیال ملاحظہ ہو:

"حیدرقریشی کی کالم نگاری اپنے عہد کی تکلیف دہ عالمی حالات کو اس کے تاریخی پس منظر سے سمجھنے کی ایک کاوش ہیں۔ ایسی کاوش جس میں انسانیت کے بہتر مستقبل کیلئے نئی راہوں کیلئے اشارے بھی دیئے گئے ہیں۔ حیدرقریشی نے اپنے کالموں سے اپنی سیاسی بصیرت کا ثبوت دینے کے ساتھ یہ باور کرایا ہے۔ کہ ادیب اپنے سماج سے لاتعلق نہیں ہوتا اور یہ بھی واضح کردیا ہے کہ خالص ادب اور صحافت ایک دوسرے سے قریب تو ہیں لیکن دونوں الگ الگ میدان ہیں۔[136]

احسان سہگل (ہیگ۔ہالینڈ) کی رائے

"حیدرقریشی کی اس کتاب کو پڑھ کر یہ احساس ہوتاہے کہ اردو ادب میں آج کا شاعر صرف گل و بلبل ہی کے گرد چکر نہیں لگارہاہے۔ بلکہ اسے اپنے معاشرے اور دنیاکے دیگر معاشروں کے اندر رونما ہونے والے واقعات و حالات کی خبر ہے۔ اور وہ اس کا گہرا مشاہدہ بھی کررہاہے۔ حیدرقریشی نے پاکستان کی سیاست سے لے کر یورپ امریکہ اور دنیا کی دیگر ریاستوں کی سیاست پر کسی نہ کسی زاویے سے

---

[135] کورج پیج پشت پر، خبرنامہ
[136] خبرنامہ کی پشت پر چھپی رائے۔

روشنی ڈالی ہے------ حیدرقریشی کی یہ کتاب اپنے اندر بھرپور نوعیت کے مضامین سموئے ہوئے ہیں"۔[137]

* * * * *

[137] خبرنامہ کی پشت پر چھپی رائے۔

ادھر ادھر سے

حیدرقریشی کی صحافیانہ زندگی اس بات کی غمازی کرتی ہے۔ کہ وہ نہ صرف ایک ادیب و شاعر، محقق و نقاد، انشائیہ نگاو خاکہ نگارہی نہیں ہے بلکہ ایک بیدار مغز اور بے لاک صحافی بھی۔ گولہ انہوں نے ہمیشہ اس بات کا اعتراف کیا کہ میں ایک سیدھا سادا شاعروادیب ہوں اور ادبی پرچہ ہی نکالتاہوں۔ مجھے صحافت سے کیا لینادینا۔ مگر دوستوں کے اصرار اور احباب کی خواہشوں کا انہیں احترام بھی ہے اور پاس و لحاظ بھی کرتے ہیں۔ چنانچہ پہلے تو انہوں نے منظر اور پس منظر اور پھر خبرنامہ جیسے کالم لکھے۔ اب باقاعدہ کاشف الہدیٰ صاحب کے کہنے پر آن لائن کالم اردو ستان ڈاٹ کام کیلئے لکھنے شروع کئے۔ یہ کالم جو بھی ہیں اور جتنے بھی ان سے حیدرقریشی کی جہاندیدہ اور ذوق مطالعہ کی چغلی کھاتے نظر آتے ہیں۔ ان کی نظر اور حالات حاظرہ پر گہری نظر ساتھ ساتھ سیاسی، سماجی، علمی وادبی اور نفسیاتی علوم پر بھی کافی دسترس محسوس کی جاسکتی ہے۔

٤/جنوری ٢٠٠٧ء سے ٣٠/ دسمبر ٢٠٠٧ تک جملہ (٢٠) کالم انہوں نے انٹرنیٹ پرآن لائن لکھے اور وہ سبھی ارو ستان ڈاٹ کام پر شائع ہوئے۔ بعد میں انہوں نے اسے کتابی صورت میں "ادھر ادھرسے" کے عنوان سے ہی ایجوکیشنل پبلشنگ ہاوس دہلی سے ٢٠٠٨ میں شائع کروایا۔

ان تمام ٢٠/ کالموں کو پڑھنے سے حیدرقریشی کی علمی بصیرت کا اندازہ ہوتاہے۔ وہ اپنے ارد گرد کے حالات پر کس حدتک نظر رکھتے ہیں۔ ان کے ذوق مطالعہ کی داد دینی پڑتی ہے اور تس پر آپ کا قلم۔ کہ اپنے قارئین کو گرفت میں لینے کا ہنر رکھتاہے۔ اہل وطن بھی آپ کے کالموں کو کس شوق سے پڑھتے ہیں اور وہ پڑھنے کیلئے بے چین رہتے ہیں۔ چنانچہ نعیم الرحمٰن ARY چینل کراچی رقم کرتے ہیں۔

"نیا کالم (ادھرادھرسے) پڑھ لیا اور آج کل آفس میں زیر بحث بھی ہے۔ یہاں کے دوست آپ کے کالم کے منتظر رہتے ہیں۔ میرے دوست اس بات پر بھی بہت حیران ہوتے ہیں کہ آپ ملک سے اتنی دور رہتے ہوئے بھی اس طرح ملک سے جڑے ہوئے ہیں کہ یہاں کے حالات اور ان کے پس منظر سے واقف ہیں۔ احباب کے حوالے سے بتارہاہوں کہ آپ کا کالم کراچی کے صحافتی حلقوں میں کافی شوق سے پڑھا جاتاہے۔"[138]

ان کالموں میں ہمیں ہندوستان کے مختلف علاقوں کی صورتحال دیکھنے کو ملیں گے اور پاکستان کی سیاسی صورتحال کے ساتھ ساتھ عالمی منظر نامے کو بھی انہوں نے بہت گہرائی سے لیا اور ان پر یہ کالمس لکھتے۔ ان کے ہاں انسانی ہمدردی اور انسان دوستی کا جذبہ اپنے شباب پر ملتاہے۔

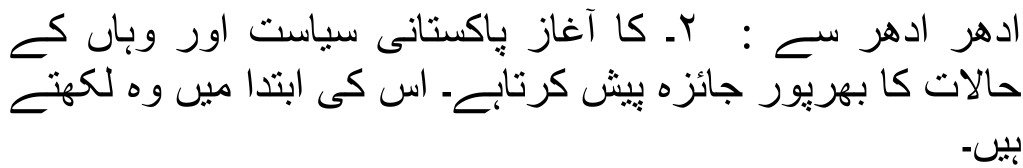
وہ چونک پڑتے ہیں جب عام انسانوں پر ظلم ہورہاہو اور انہیں مجبور اور لاچار سمجھ کر ان پر مظالم ڈھائے جارہے ہوں۔ خواہ وہ سیاسی طورپر ہوں کہ معاشرتی طور، مذہبی طورپر ہوں کہ انفرادی سطح پر، وہ بپھرجاتے ہیں۔ اور اس کو قلم کے ذریعہ دنیاکو اس کا چہرہ بتادیتے ہیں۔

ایک اچھے صحافی کی یہی شناخت ہوتی ہے۔ کہ وہ عوام پر ہونے والے مظالم اور زیادتیوں کو کھل کر بتادے۔ اس کے ساتھ وہ ایک حساس شاعر و ادب کا دل بھی رکھنے والے بھی ہیں تو اس میں اور شدت آجاتی ہے اور وہ تڑپ اٹھتے ہیں۔ اور اپنے ماہیے کے ذریعہ انہوں نے اپنی آواز اٹھائی۔

نفرت کے اندھیروں کو
توڑ مرے مالک
ظلمات کے گھیروں کو

---

[138] ادھر ادھر سے کی پش پر



ادھر ادھر سے : ۲۔ کا آغاز پاکستانی سیاست اور وہاں کے حالات کا بھرپور جائزہ پیش کرتاہے۔ اس کی ابتدا میں وہ لکھتے ہیں۔

"تصوف کے حوالے سے ابھی تک یہ سننے اور پڑھنے میں آتارہاہے کہ کسی راجہ، مہاراجہ، بادشاہ وغیرہ پر جب تصوف کا اثر ہوتاتھا تو وہ تاج، تخت چھوڑ کر جنگل کی راہ لیتاتھا اور پھر دنیاوی بادشاہت کی بجائے آسمانی بادشاہت کا تاج پہن کر سامنے آتا، یہی وجہ ہے کہ ایسے صوفی، سادھو صدیاں گزرنے کے بعد آج بھی ہمارے دلوں میں زندہ ہیں-------

آج کے جدید بلکہ "مابعد جدید" عہد میں تصوف کو بھی تماشا بنایا جانے لگاہے۔ پاکستان میں جنرل پرویز مشرف کی قیادت میں ایک صوفی کونسل کے قیام کا اعلان کیاگیاہے۔ اس کے سرپرست پرویزی مشرف اور صدر چوہدری شجاعت حسین ہیں۔ کہاں دنیاداری کی آلودگی سے پاک اور بے نیاز صوفی سادھو جو اقتدار کو لات مار کر نکل جاتے ہیں اور کہاں پاکستان میں اقتدار پر اپنی گرفت مظبوط کرنے والا گروہ جو ذاتی اقتدار کے استحکام کی خاطر تصوف کو بھی آلہ کار کے طورپر استعمال کرنے لگاہے۔"[139]

ادھر ادھر سے ٤:

"--- ایک یہودی صدر ہے جو ایک جنسی اسکینڈل میں ملوث ہوا تو قانون

---

[139] اہر ادھر سے ص ۱۵

کی لپیٹ میں آرہاہے۔ ایک پاکستان کا مسلمان صدر تھا جنرل یحییٰ خان جس کے جنسی اسکنڈل ملک کے بچے بچے کی زبان پر تھے۔ جس نے ملکی کو دولخت کرادیا۔ لیکن اس کےاقتدار پر رہتے ہوئے کسی عدالت کو جرات نہ تھی کہ اس کے خلاف بدکاری کے کسی کیس کی سماعت بھی کراسکے"۔[140]

اس بات سے اندازہ ہوتاہے کہ جہاں عدلیہ بھی آنکھ بند کرلے بھلا وہاں انصاف کی امید کیسے اور کس سے رکھی جائے۔ اس طرح کی امید بے کار محض ہوتی ہے۔ اسی صورتحال کو اپنے کالم میں حیدرقریشی نے واشگاف الفاظ میں بتادیا۔

کالم ۵ :میں پروفیسر گیان چند جین کی کتاب "ایک بھاشا دو لکھاوٹ" پر اپنے خیالات کا اظہار کیا جس میں شمس الرحمٰن فاروقی اور گوپی چند نارنگ کا ذکر بھی ملتاہے۔ اس کے ساتھ ساتھ امریکہ کی پالسیوں اور ہندوستان میں صدر عبدالکلام پر شیوسینکوں کی تنقید کا ذکر بھی ملتاہے۔

کالم ٦ : میں ویلینٹائن ڈے سے متعلق ہندوستان میں انتہاپسند ہندوتنظیموں نے جو ہنگامے کئے اور اس کے ساتھ ساتھ کی صورتحال پر بھی تبصرہ ہے۔

غرض تمام کالموں سے اندازہ ہوتاہے کہ حیدرقریشی کی نظر حالات حاضرہ پر ہے اور اس میں زندگی کے ہر شعبہ پر ان کی کڑی نظر ہے اور انھیں کو انہوں نے اپنے کالموں میں جگہ دی"۔

*****

[140] ادھر ادھر سے ص ۲۸


باب پنجم
حیدرقریشی مشاہیر کی نظر میں

حیدرقریشی : مشاہیر کی نظرمیں

شاعری : غزل (سلگتے خواب) پر تاثرات : اوزیرآغا

----- کیونکہ حقیقت یہ ہیکہ حیدرقریشی کے غزلیہ اشعار میں محبت کا کیف و کم شاعر کو مبہوت اور بے خود کرنے میں پوری طرح کامیاب ہے۔ محبت کا یہ تجزیہ ایک سچا اور کھرا جسمانی تجربہ ہے اور اسی لئے اس سے پھوٹنے والا کرب اور زیاں کا احساس بھی سچاہے۔ اگر حیدرقریشی کی جگہ کوئی اور شاعر ہوتا تو محبت میں ناکامی کے بعد صوفیانہ مسلک کے تحت محبت کے جذبہ کو منقلب کرلیتایاپھر آہ و زاری کو اپنا مسلک بناکر حدیث دل سناتا چلاجاتا، یا اگر ترقی پسند جذبات سے سرشار ہوتا تو محبوبہ کو اپنے آنچل کا پرچم بنالینے کا مشورہ دیتا۔ مگر حیدرقریشی نے محبت کے کربناک تجربہ کو اور ہی زاویہ سے دیکھا ہے جس کے نتیجہ میں اس کے ہاں زیرلب تبسم کی نمود ہوئی ہے جو جذبے کی بے معنویت کو اجاگر کرنے میں پوری طرح کامیاب ہے۔

ایک ایسے شخص کا تصور کیجئے جس کا ایک ہاتھ تو اپنے سینے میں سلگتے ہوئے درد پر رکھا ہوا اور دوسرے ہاتھ سے وہ زندگی کو معنی خیز اشاروں سے چڑارہاہوتو آپ کو حیدرقریشی کے اس رویئے کا کچھ اندازہ ہوگا جو اس کے بعد غزلیہ اشعار میں ابھرا ہے اور جو وقت کے ساتھ ساتھ اگر پھولتاپھلتا گیا تو اسے غزل گو شعراء کے جم غفیرسے بالکل الگ کردے گا۔

اس کو پانے کی تمنا پہ یقین کب ہے مگر
ہاتھ جب اٹھ ہی گئے ہیں تو دعا ہی مانگوں

عجب بے کیف سی ہے زندگی
پچھلے مہینے سے
نہ کوئی یاد آتاہے، نہ کوئی یاد
کرتاہے
سوچ لو انجام بھی اس عشق کا
چن دیئے جاؤ گے پھر یادوں کے
بیچ

مظہر امام :

معاصر شاعری میں تازہ کاری اور تازہ دمی کی ایک نمایاں مثال حیدرقریشی اور ان کا کلام ہے۔ آج کی شاعری پر ایک الزام یہ ہے کہ اس میں یکسانیت اور یکرنگی درآئی ہے۔ ایک ہی طرح کی علامتیں، استعارے، لفظیات، وہی پیش پا افتادہ باتیں جو ایک مخصوص عصر کی پہچان کیلئے باربار دہرائی جاتی ہیں۔ میں اس بحث میں نہیں پڑوں گا کہ یہ الزام صرف موجودہ شاعری پر ہی عائد ہوسکتاہے۔ یا ہر زمانہ میں تقلیدی متشاعروں کی بڑی تعداد ہوتی ہے۔ سردست میں آج کی شاعری پرفرد جرم عائد کرنے والوں سے حیدرقریشی کے کلام کے مطالعے کی سفارش کروں گا کہ وہ خود فیصلہ کریں کہ حیدرقریشی کے استعارے، علامتیں، لفظیات، اور موضوعات دوسروں سے الگ دکھائی دیتے ہیں یا نہیں۔

اکبرحمیدی:

حیدرقریشی کا شمار ۱۹۷۰ء کے لگ بھگ ابھرنے والے شاعروں میں ہوتاہے۔ اور اسی زمانہ سے وہ میرا دوست ہے۔ حیدرقریشی کے ہم عصر شاعراکثر بڑے شہروں میں رہ کر ابھرے ہیں۔ جہاں انھیں نشرواشاعت کے بڑے ذرائع حاصل ہوئے جبکہ حیدرقریشی کا کمال ہے ہیکہ وہ ایک بہت چھوٹے شہرخان پور میں رہ کر محض اپنے شعر کے زور سے سامنے آیا اور پھر بڑے زور آور حملوں سے اس نے اپنا لوہا منوایا۔ میں اس کا دوست بھی ہوں اور اس کا قاری بھی۔ رسائل کے ذریعے

میں ایک طویل عرصے سے اس کی غزلیں پڑھ رہاہوں۔ وہ اپنے ہم عصروں میں بہت نمایاں ہے۔ میں اس کی غزل کی شیرینی، لہجے کی بیباکی اور بے تکلفی کا شروع ہی سے قائل ہوں۔ یہی وہ صفات ہیں جن کے باعث اس کی غزل ہجوم میں سربلند دکھائی دیتی ہے۔ اس نے مسلسل محنت کے ذریعے اپنی غزل پر اپنی شخصیت کا رنگ چڑھایاہے۔ جس کے باعث اس کی غزل قارئین کے وسیع حلقے میں پہچانی گئی ہے۔ بے شمار انتخابات میں اس کی غزل منتخب غزلوں میں شامل کی گئی ہے۔ یہ سب باتیں اس کی غزل کا اعتبار اور وقار ہیں۔
------ حیدرقریشی کی غزل ایک صاحب حال شاعر کی غزل ہے۔ اس کے پاس سچے تجربے ہیں۔ زندہ جذبے ہیں اور اپنی بات کہدینے کی ہمت ہے۔ بلکہ ان باتوں سے بڑھ کر یہ کہ اسے فن شعر پر گرفت حاصل ہے۔ اس کے جذبے اظہار کی مشقت کے ہاتھوں مارے نہیں جاتے بلکہ پوری تازگی کے ساتھ شعر کا روپ دھارتے ہیں۔ اور کہیں مجروح نہیں ہوتے۔ تخلیقی عمل ان کا اس نچوڑ نہیں دیتا، جیساکہ ہمارے زمانے میں بعض شاعروں کے ساتھ ہورہاہے، بلکہ تخلیقی عمل حیدرقریشی کے جذبوں کی آنچ کو تیز کردیتاہے۔ اس کی کیفیت کو دوچند کردیتاہے۔ اس سے ظاہر ہوتاہے کہ اس کا برسوں کا فنی ریاض اس کے شعلہ تخلیق کو ہوا دینے کے کام آرہاہے اور یہ ایک بہت بڑی بات ہے۔

انورسدید:
حیدرقریشی کی غزل بیشویں صدی کے ربع آخر میں آنکھ کھولی۔ اس لئے آوازوں کے جنگل میں کھوجانے کے بجائے اس نے جنگل کے درختوں کی گھنی چھاؤں سے آسودگی حاصل کرنے کی آرزو کی ہے۔ اس نے ایسے لفظ لکھنے کی کوشش نہیں کی جو سب کے دل میں موجود تھے۔ بلکہ جب اس نے غزل کی پرخار وادی میں قدم رکھا تو وہ آبلہ پاآگے بڑھا۔ اپنی انفرادیت کو تحفظ دیا اور اپنی غزل میں صرف ان لفظوں کو سمویا جو اس کے بطون میں جذباتی کہرام بپا کررہے تھے اور باہر آنے کیلئے بے تاب تھے۔ یہ الگ بات ہے کہ حیدرقریشی

اپنے عصر کی حسیت سے بھی واقف تھا۔ چنانچہ جب یہ لاواتخلیقی عمل کی پرپیچ راہ سے گزر کر شعر کی صورت میں برآمد ہوا تو اس میں نہ صرف غم جاناں اور غم دوراں کی جھلک نظر آئی بلکہ اس میں موجودہ دور کے انسان کی جھلک بھی دکھائی دینے لگی۔

ہرچہرے پہ تھی ثبت شناسائی کی تحریر
میں اجنبی لوگوں کے قبیلے میں گھرا تھا

وہ اپنی سوچ پہ گہری اداسیاں لکھ کر
کچھ اپنے آپ سے سمجھوتا کرچکے ہوں گے

عجیب لوگ ہیں بے چہرہ شہر کے حیدرؔ
یہ تیری بات کے تیور سمجھ نہ پائیں گے

وہ جب خلوص کی قیمت چکا نے آیاہے
تو میرے ذہن میں بھی رنگ تاجری بھردو

آپ نے دیکھا کہ حیدرقریشی کے لہجے میں سوز ہے لیکن اس میں زہرناکی بھی نمایاں ہے۔ اس کے ہاں صداقتوں نے نسبتاً واضح انداز میں جھلک دکھائی ہے۔ اور ان پر ماضی اور حال کے علاوہ مستقبل کی مہر بھی لگی ہوئی نظر آتی ہے۔ ان

صداقتوں کی حیثیت دوامی ہے۔ ان کا زہرسقراط نے بھی پیاتھا۔ اور اسی زہر کو حیدرقریشی بھی قطرہ قطرہ اپنے دل میں اتار رہاہے۔ ایک اور بات یہ کہ حیدرقریشی چونکہ ذاتی جذبے کو اہمیت دیتاہے اس لئے اس کے ہاں ایک مخصوص قسم کی مانوس اداسی بھی جنم لیتی ہے۔ ایک ایسی اداسی جو سرماکی چاندنی راتوں میں شبنم بن کر اترتی ہے اور پھر بے اختار آنسوبن کر پلکوں پر آویزاں ہوجاتی ہے۔ خودفریبی کی شکست کا یہی وہ لمحہ ہے جب حیدرقریشی کے خواب بکھرجاتے ہیں۔ جسم کا رنگ دھنک کے رنگوں میں تحلیل ہوجاتاہے اور زمانے کی روشنیاں اندھے شہر کی تاریکیوں میں گم ہوجاتی ہیں۔

پروفیسر صابر آفاقی:

حیدرقریشی کو پڑھنے کے بعد یہ تاثر ملتاہے کہ وہ خواب دیکھنے والاشاعر ہے۔ وہ خواب تو بے شک دیکھتاہے مگر اس کا یہ خواب غفلت، نیند اور کاہلی سے نہیں بلکہ وژن سے عبارت ہے۔ زندگی میں وژن کی فکری اہمیت مسلم ہے۔ نیپولین نے کہاتھا، "تصورہی دنیا پر حکمرانی کرتاہے" اگر یہ تصور و خیال نہ ہوتو آدمی آدمی نہ رہے، میرے نزدیک انسان کی تعریف حیوان ناطق نہیں بلکہ حیوان مفکر ہونی چاہئے۔

حیدرقریشی کا خواب خودفراموشی کا نہیں بلکہ آگاہی اور ہوشیاری کا خواب ہے۔ اسی لئے وہ ناآسودہ نظر آتا ہے۔

----- حیدرقریشی خواب دیکھنے والا شاعر ہے، لیکن وہ مایوسی اور ناامیدی کا شاعر نہیں، بلکہ زندگی کے نئے آفاق دکھانے والا پرامید فنکار ہے۔ ------- اس کی شاعری نئے ذائقے اور نئے آدرشوں کی شاعری ہے، معروف نقاد اور شاعروادیب جناب ڈاکٹر وزیرآغا، حیدرقریشی کی شاعری پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں: "حیدرقریشی کے اس رویہ نے اس کی غزلوں میں ایک ایسا ذائقہ پیدا کیاہے جو آج کے نئے غزل گو شعراء میں شاید ہی کسی کے ہاں نظر آئے"۔

پروفیسر آفاق صدیقی:



اگر آپ ان غزلوں کو پڑھیں------- ان کے علاوہ بھی حیدرقریشی کی بہت سی غزلیں اس مجموعے کے حوالے سے زیرمطالعہ آئیں تو محسوس ہوگا کہ جن ادوار کا شاعر نے عرض حال میں ذکر کیاہے ان کی متنوع جھلکیاں غزل کے روایتی اسالیب میں ہیئت اور معنوی اظہار وابلاغ کو بوقلمونی کا مظہر ہیں اور جدید حسیت کی رعنائیاں بھی اپنے رنگ و آہنگ میں بڑی جاذبیت رکھتی ہیں۔ ان میں رمزیت، ایمانیت، ایجازواعجاز اور قلبی واردات کے اظہار کا سلیقہ موجود ہے اور میں سمجھتاہوں کہ بحیثیت مجموعی حیدرقریشی نے صنف غزل کے محاسن کو کافی حدتک اپنے اسلوب بیان میں برقرر رکھاہے۔ مثال کےطورپر ایک غزل کے چند اشعار دیکھئے۔

لفظ اندھے ہوگئے سوچوں
کو پتھر کرگیا
ایک ہر یالی کا پیکر دل کو
بنجر کرگیا

کون جانے اس کی اپنی
پیاس کا عالم ہوگیا
وہ جو میری روح کو پیاسا
سمندر کرگیا

یوں تو پہلے بھی وہ کرتا
تھا اداس آکر مگر
اب کے دل کی اور ہی
حالت ستم گر کر گیا

خوشبوئیں اور دودھیاسی
روشنی ہے چار سو
کچھ کہو حیدرؔ یہ جادو کون

تم پر کرگیا

لفظوں کا اندھاہونا اور سوچوں کا پتھر بن جانا جیسی لفظی و معنوی ندرتیں انداز بیان کی تازہ کاری کا ثبوت دیتی ہیں۔ تمام تر غزلوں میں انکشاف ذات و صفات کی چمک موجود ہے۔ اور فنی پختگی کے لحاظ سے اب حیدرقریشی کا شمار عصر حاضر کے ان باکمال غزل گو شعراء میں ہونا چاہئے جو صف اول کے سخنور کہے جاتے ہیں۔ یقیناً ان کی غزل گوئی ابھی اگلی منزلیں بھی سرکرےگئی۔

ڈاکٹر محبوب راھی:

حیدرقریشی ایک کثیرالمطالعہ، وسیع النظر، کشادہ ذہن، پختہ فکر، اور تازہ کارتخئیل کے حامل ایک باشعور تخلیق کار ہیں۔ اپنے گردوپیش، قرب و بعید، زندگی کے داخلی اور خارجی عوامل، گوناگوں تجربات، روزمرہ درپیش واقعات، خوش گوار و ناخوشگوار حادثات و سانحات، مختصریہ کہ حیات و ممات سے متعلق لوازمات جن سے وہ گذرتے رہے ہیں، جنھیں وہ جھیلتے رہے ہیں، کم و بیش ان تمام کیفیات کو ان سے پیدا شدہ نتائج کے ساتھ اشعار میں سمولیاہے۔ ان کی غزل رنگینی تخیل کا محض نگارخانہ نہیں، جیتی جاگتی زندگی کے رنگارنگ حقائق کا منظر نامہ پیش کرتی ہے۔ انھوں نے اپنے غزلیہ اشعار کے وسیلے سے نامعلوم خلاؤں میں محض الفاظ و خیالات کے طوطامینا اڑانے کے بجائے زندگی کی رگوں میں دوڑ نے پھر نے والے زندگی کی اوبڑھ کھابڑ سطح پر رواں دواں تلخ و ترش اور کھٹے میٹھے حقائق کی اثر انگیز ترجمانی کی ہے۔ انھیں دنیا سے جو کچھ ملا ہے اسے لوٹانے کے بجائے اس کے ردوقبول کی مشترکہ کیفیت کو ایک دلکش طرز الظہار کے وسیلے سے دنیا کے روبرو پیش کردیاہے۔ وہی سب کچھ جسے شاعری کی اصطلاح میں سماجی بصیرت اور عصری حسیت سے تعبیر کیاجاتاہے۔ حیدرقریشی کے دامن نگاہ میں کائنات کی اتنی

وسعتیں سمٹ آتی ہیں، جن کی سمائی کی تنگنائے دل میں گنجائش نہیں ہے ؂

پھر اس کو دامن دل میں کہاں
کہاں رکھیں
سمیٹ سکتے ہیں جو کائنات
آنکھوں میں

بصارت اور بصیرت تک حیدرقریشی کی آنکھوں کا سفر جن تجربات سے دوچار ہوتاہے۔ اظہار نوبہ نو کے وسیلے سے ان تجربات کو انھوں نے ویائی عطا کردی ہے۔

سعیدشباب:
----مجھے سید ضمیر جعفری کی اس رائے سے پورااتفاق ہے کہ حیدرقریشی جدید غزل کے نوجوان شعراء کے گروہ کے سرپنچوں میں سے ہے۔ اور جدید غزل کی ساکھ ایسے ہی شاعروں کے دم سے بنی ہوئی ہے۔ اور مظہرامام کی یہ رائے بھی اہمیت رکھتی ہے کہ حیدرقریشی کی بعض نظمیں پڑھ کر یہ فیصلہ کرنا مشکل ہوجاتاہے کہ وہ غزل کے ذیادہ اچھے شاعر ہیں یا نظم کے؟ --- نیز یہ بھی کہ اب حیدرقریشی کی شناخت ماہیئے کے بغیر نامکمل ہے اور ماہیئے کی شناخت حیدرقریشی کے بغیر نامکمل ہے۔

ماہیئے کے حوالے سے

نیاز احمد صوفی

حیدرقریشی کا نام کسی تعارف کا محتاج نہیں۔ انھوں نے ماہیئے کی اہمیت کو بدلے بغیر موضوعاتی اعتبار سے جو گراں قدر اضافے کئے ہیں اس سے ماہیئے کی قدوقامت میں بھی اضافہ ہواہے۔ ان کا خصوصی کمال یہ ہے کہ انھوں نے یہ احساس نہیں ہونے دیا کہ زبان بدل گئی ہے۔



یوں انھوں نے ماہیئے کو اس کی جڑ سے نہیں اکھیڑا بلکہ اسی زمین کو اور بھی Porus اور مزید ہموار کیاہے۔ جو اس کی اپنی اور اصلی ہے۔

عتیق احمد عتیق ایڈیٹر سہ ماہی توازن مالی گانوں

اللہ نے آپ کو علمی اور ادبی اور تخلیقی زرخیزی کے ساتھ سیاسی بصیرت سے بھی خوب نوازا ہے۔ آپ کا مشاہدہ بھی ایسا گہرا ہے جو شہہ نشین اور دائرہ دائرہ نکات کو بھی سطح پر لاکر لی دم لیتاہے۔ دنیا بھر میں چند سیاسی گرگوں کے پیدا کردہ حالات و ادوار پر ایسی ہی تبصروں اور تدبیروں سے تمام تر مبہم "پیش منظر" کو زیر زبر کر کے ان کے پس منظر کو اصل روپ میں پیش کیاجاسکتا تھا۔ چنانچہ آپ کا یہ استبادی شعور متقاضی ہے کہ ہم عالمی خبروں پر آپ کے تیکھے لیکن ٹھوس اور ناقابل تردید تبصروں پر مشتمل کتاب خبر نامہ کو "حیدرقی بوطیقہ" کے نام سے تعبیر کریں پوری کتاب کا تبصراتی مواد تکشیفِ اثرار کا اعلامیہ ہے۔ [141]

ڈاکٹر نذر خلیق خان پور

منظر اور پس منظر اور خبر نامہ کے بعد اب حیدرقریشی کے انٹرنیٹ کالموں کا تیکھا مجموعہ "ادھر ادھر "سے شائع ہورہاہے۔ تینوں مجموعوں میں حیدرقریشی کا انداز ایک دوسرے سے بالکل مختلف رہاہے۔ اس کے باوجود وہ سنجیدگی ہنسی مذاق یا غم و غصہ کسی بھی کیفیت میں ہوں اپنے تفکر و تدبر اور سیاسی بصیرت کو اس ادبی شان کے ساتھ بروئے کار لاتے ہیں کہ اختلاف کے باوجود ان کی باتوں پر غور کرنا پڑتاہے۔ [142]

اسلم رسول پوری جامپور پاکستان

---

[141]بحوالہ "ادھر ادھر سے" کتاب کی پشت پر
[142]بحوالہ "ادھر ادھر سے" کتاب کی پشت پر

عام طورپر یہ سمجھا جاتاہے کہ حیدرقریشی ایک شاعر افسانہ نگار محقق نقاد یا انشائیہ نگار اور سفر نامہ نگار ہیں۔ لیکن یہ بات شائد کچھ لوگوں کے علم میں نہ ہو کہ وہ اس سیاسی کالم نگار بھی ہیں۔ اور انہوں نے اپنے سیاسی کالموں میں جو اہم تجاویز دی یا اپنی سیاسی بصیرت کی بنیاد پر کچھ پیشن گوئیاں کیں وہ بعض میں کس طرح حقیقت کا روپ دھار گئیں۔ حیدرقریشی کے ان کالموں پر مشتمل کتاب "منظر اور پس منظر" کے نام سے چھپی ہوئی ہے۔ جس میں جنوبی ایشیاء میں یوروپی یونین کے طرز پر ایک تنظیم کی ضرورت پر زور دیاگیاہے۔ اس طرح انہوں نے گریٹر اسرائیل کے اسرائیلی منصوبہ کے بھی نشاندہی کی تھی------ اس پر ٹی وی پروگرامس میں بھی بحثیں ہوئیں مگر کسی نے اس بات کا حوالہ نہ دیا کہ اس منصوبہ کے بارے میں سب سے پہلے کس نے لکھا ہے۔ [143]

نعیم رحمٰن کراچی (ARY چینل)

نیا کالم (ادھر ادھر سے) پڑھ لیا۔ اور آج کل آفس میں زیر بحث بھی ہے۔ یہاں کے دوست آپ کے کالم کے منتظر رہتے ہیں۔ میرے دوست اس بات پر بھی بہت حیران ہوتے ہیں کہ آپ ملک سے اتنی دور رہتے ہوئے بھی اس طرح ملک سے جڑے ہوئے ہیں کہ یہاں کے حالات اور ان کے پس منظر سے واقف ہیں۔ احباب کے حوالے سے بتارہا ہوں کہ آپ کا کالم کراچی کے صحافتی حلقوں میں کافی شوق سے پڑھا جاتاہے۔ (بحوالہ "ادھر ادھر سے" کتاب کی پشت پر)

احسان سہگل (ہالینڈ)

حیدرقریشی کی اس کتاب کو پڑھ کر یہ احساس ہوتاہے کہ اردو ادب میں آج کا شاعر صرف گل و بلبل کے گرد چکر نہیں لگارہاہے بلکہ اسے اپنے معاشرے اور دنیا کےدیگر معاشروں کے اندر رونما ہونے والے واقعات اور حالات کی خبر ہے۔ اور اس کا گہرا مشاہدہ بھی کررہاہے۔ حیدرقریشی نے پاکستان کی سیاست سے لے کر یورپ، امریکہ اور دنیا کی دیگر ریاستوں

---

[143] بحوالہ "ادھر ادھر سے" کتاب کی پشت پر

میں کی صحافت پرکسی نہ کسی زاویہ سے روشنی ڈالی ہے۔ ----- حیدرقریشی کی یہ کتاب (خبر نامہ) اپنے اندر بھرپور نوعیت کے مضامین سموئے ہوئے ہے۔ [144]

نصرت ظہیر دہلی

اردوستان میں آپ کا خبر نامہ نظر آیااچھا تھا------- آپ کی سوچ اور باتوں میں بڑا توازن ملتاہے۔ جس سے میں بھی کئی باتیں سیکھ رہاہوں۔ [145]

کاشف الہدیٰ (امریکہ)

حیدرقریشی صاحب کو اپنے قوم اور ملک سے بے حد محبت ہے۔ جو بھی لکھتے ہیں سوچ سمجھ کر لکھتے ہیں۔ بات کی تحہ تک پہنچ جانا اور پھر قاری کو اپنا موقف اس طرح سمجھاتے ہیں کہ ان سے اتفاق رائے کرنا ہی پڑھتاہے۔ [146]

ناصر نظامی (امیسٹیڈم ہالینڈ)

میں نے ------ محسوس کیا ہے کہ حیدرقریشی موجودہ عالمی صورتحال کو کسی مخصوص عینک سے دیکھنے کے بجائے مختلف پہلوں اور زاویوں سے دیکھتے ہیں۔ تہذیبی حوالے سے مذہبی حوالوں سے جغرافیائی حوالوں سے تاریخی حوالوں سے سیاسی حوالوں سے نفسیاتی حوالوں سے لے کر مذہبی پیشن گوئیوں تک کے حوالوں سے انہوں نے موجودہ صورتحال کو سمجھنے کی کوشش کی ہے۔ ان کی ہمدردیاں اپنے لوگوں سے بھی ہیں لیکن جو اپنے لوگوں کے ساتھ پوری انسانیت کی بقاء کے خواہش مند ہوں۔ [147]

پروفیسر آفاق صدیقی

[144] بحوالہ : خبر نامہ کتاب کی پشت پر
[145] بحوالہ : خبر نامہ کتاب کی پشت پر
[146] بحوالہ : خبر نامہ کتاب کی پشت پر
[147] بحوالہ : خبر نامہ کتاب کی پشت پر

حیدرقریشی کے نظموں کو پڑھ کر مجھے یہ اندازا ہواہے کہ کثیرالمطالعہ قلم کار ہیں۔ اور کئی علوم مفیدا پر جوہری نظر رکھتے ہیں۔ جن کا مجموعی اثر ان کی تخلیقی صلاحیت پر ایک فلسفی جیسے حوشمند وباشعور شاعر کی صورت میں جاں گزیں ہیں۔ ------ میں وثوق سے کہہ سکتاہوں کہ حیدرقریشی کی نظمیں سطحی جذبہ احساس اور ہلکے پھلکے کنکر کی پروردہ نہیں بلکہ ان کی تفہیم کیلئے قاری کا بھی خاصہ پڑھا لکھا ہونا ضروری ہے۔ یہ بڑے امکانات کی شاعری ہے اور میرا مخلصانہ یہ ہے کہ حیدرصاحب کو ایسی اعلیٰ ادب آمیز خیال کو نظموں کی تخلیق پر مزید توجہہ دینی چاہئے۔ بڑی بے تکلفی بڑی ساختگی سے انہوں نے انگریزی الفاظ کو بھی اپنے مافی ضمیر کے اظہار کا ذریعہ بنایاہے۔ [148]

سلطانہ مہر

حیدرقریشی کا شعری سفر ایک طویل عرصہ پر محیط ہے۔ انہیں میں نے ۲۰ سوالات پر مشتمل سوال نامہ بھیجا تھا۔ جس کا جواب انہوں نے تفصیل سے دیا۔ ان کی تحریر میں مطالعہ اور فکر کی عمیق گہرائی ملتی ہے۔ آپ ان کے نظریات ان کی سوچ اور ان کے مطمع نظر سے متفق ہوں یا نہ ہوں لیکن ان کی کہی ہوئی باتوں سے صرف نظر نہیں کرسکتے۔ یقیناً ان کے جوابات فکر کی نئی راہیں کھولتےہیں اورمزید دعوت فکر دیتے ہیں۔ [149]

ڈاکٹر لڈمیلا (ماسکو)

مجھے پہلے کی طرح آپ کے کام کی صلاحیت کے معجزے پر حیرت بھی ہے اور صد رشک بھی سمجھ میں نہیں آتا ہے آپ 24گھنٹوں کو 48گھنٹوں یا اس سے بھی زیادہ کی کس طرح بنالیتے ہیں۔ اگلی ملاقات ہوگی (انشاء اللہ) تو آپ سے یہ منتر سیکھنے کی کوشش کرونگی۔ [150]

---

[148] بحوالہ حیدرقریشی کے ادبی خدمات صفحہ ۱۳۸:مرتب پروفیسر مظہر خلیق

[149] بحوالہ : سخن ور ص ۱۳۲ مطبوعہ امریکہ ۱۹۹۶ عکاس کتاب نمبر ٤ صفحہ ۷۷ پاکستان

[150] بنام حیدرقریشی مطبوعہ ماہ نامہ شاعر ممبئی شمارہ نومبر ۲۰۰٤ء صفحہ ۲۰

پروفیسر فرحت نواز

حیدرقریشی اپنی تمام تخلیقات میں خود سانس لیتے ہوئے اور زندگی بسر کرتے ہوئے موجود ہیں۔خود اسطرح کے ان کی اپنی زندگی کے ساتھ ان سے وابستہ تمام اہم کردار بھی انکی تخلیقات میں موجود ہیں۔ دوسروں کے ہاں خاکوں اور یادوں کے باب میں ایسی زندگی مل جاتی ہے کہ وہاں ان کا ذکر ناگزیر ہوجاتاہے۔ لیکن حیدرقریشی تو شاعری، افسانہ، انشائیہ، سفرنامہ، حتاکہ انٹرویوز میں بھی ----- اپنی زندگی اپنے رشتوں اپنی محبتوں کو ہی بیان کرتے ہیں اور انداز بیان ایسا کہ آپ بیتی جب بیتی بن جاتی ہے اپنی تمام تخلیقات میں اسطرح سے زندگی بسر کرنا اس اعہد کے تمام شاعروں اور ادیبوں میں حیدرقریشی کی الگ پہچان ہے۔ اس زاویے سے ان کی تمام تخلیقات خود ایک تحقیقی مطالعہ کا تقاضہ کرتی ہیں۔ [151]

*****

[151] بحوالہ انٹرویوز ، مرتب سعید شباب صفحہ ۱۳۳

حیدرقریشی کی یادگار نگاری اور خاکہ نگاری پر تاثرات

اشفاق احمد (لاہوری) :

ولایتی زبانوں میں ایسے سکیچ اپنے اپنے انداز میں بہت ملتے ہیں لیکن اردو میں "میری محبتیں" اپنی نوعیت کی واحد کتاب ہے۔[152]

ڈاکٹر گیان چند جین (امریکہ):

"میری محبتیں" کے ابتدائی پانچ چھ مضامین میں نے پوری طرح پڑھے، بقیہ کو سرسری دیکھا۔ دوسرے حصہ میں پہلے چار خاکے نیز آخری مضمون پرانے ادبی دوست پڑھا۔ خوب لکھتے ہیں، آپ نے اپنے بزرگوں کے محیرالعقول واقعات لکھے ہیں، ان سے متاثر ہوا۔ تمام مضامین بہت دلچسپ اور دلکش ہیں۔[153]

جوگیندر پال (دہلی) :

"میری محبتیں" کا مسودہ اگرچہ تم مجھے سے پہلے بھی پڑھوا چکے تھے، پھر بھی یہ کتاب اتنی دلچسپ اور Engaging لگی کہ اسے دوسری بار بھی فرفر پڑھتا چلاگیا۔[154]

ڈاکٹر رضیہ حامد (دہلی) :

"میری محبتیں" کئی مرتبہ پڑھ چکی ہوں اور اگر یہی حال رہا تو میں اس کی حافظ ضرور ہوجاؤں گی۔ آپ کی تحریر میں بلا کی سادگی اور قاری کو باندھ رکھنے کی طاقت ہے۔ درد کی پوشیدہ لہریں دل و دماغ میں اندر تک اتر جاتی ہیں اور قاری

[152] حیدرقریشی کی ادبی خدمات صفحہ نمبر ۲۳۵
[153] حیدرقریشی کی ادبی خدمات صفحہ نمبر ۲۳۵
[154] حیدرقریشی کی ادبی خدمات صفحہ نمبر ۲۳۵



اپنے کو قاری نہ سمجھ کر حیدرقریشی بن جاتاہے۔ یہ آپ کی تحریر کا کمال ہے۔ [155]

محمد احمد حامی (انگلینڈ) :

آپ کے خاکوں نے لطف دیا۔ آپ نے جس طرح اپنے قارئین کو اپنے گھر کے اندر لے جاکر اہل خانہ سے ملایا ہے اور جس سہولت سے بعض پل صراطی مقامات سے گزاردیاہے' اسے "مہارت" ہی کہاجاسکتاہے۔ زندہ شخصیتوں کے خاکوں میں تشنگی رہ جانا لازم ہے۔ اس لیے کہ بہت سی باتیں ان کے خاک ہوجنے سے منظر عام پر نہیں لائی جاسکتیں اور فوست کے خاکے میں اذکرو امواتکم بالخیر کا حجاب در آتاہے اور مردے کی خاک اڑانے سے خواہ مخواہ شرم آتی ہے۔

بہرحال خوب لکھا ہے، اور بھی لکھیں۔ یہ مضامین پڑھتے ہوئے مجھے ایک دوجگہ رکنا پڑا۔ پھر یادداشت پر زور دیاتو خیال ہوا کہ جو کچھ آپ نے لکھاہے وہی درست ہوگا البتہ جہاں آپ نے ہاشم کو امیہ کا جڑواں (پشت جڑا) بھائی لکھا ہے وہاں ذہول ہواہے۔ اسلیے کہ ہاشم امیہ کا چچا تھا۔ ہاشم اور عبدالشمس آپس میں بھائی تھے اور دونوں عبدمناف کے بیٹے تھے۔ شجرہ یوں ہے: محمدؐ بن عبداللہ بن عبدالمطلب بن ہاشم بن عبدمناف.... ابوسفیان بج حرب بن امیہ بن عبدالشمس بن عبدمناف[156]

غلام الثقلین نقوی (لاہور) :

حیدرقریشی اب شخصیت نگاری میں پختہ کار ہوگئے ہیں۔ 'محبت کی نمناک خوشبو' ایک پرتاثیر خاکہ ہے۔ (مکتوب مطبوعہ"اوراق" لاہور، نومبر، دسمبر ۱۹۹۲)[157]

ڈاکٹر مناظر عاشق ہرگانوی (انڈیا):

ابھی "میری محبتیں" پڑھ رہاہوں۔ بعض خاکے پڑھ کر آپ کی زندگی کے اتار چڑھاؤ سے بے حد متاثر ہوا ہوں۔ مجھے لگا کہ ذہنی سفر میں میرا آپ کا ساتھ ہوگیاہے۔ لکھنے بیٹھوں گا تب

---

[155] حیدرقریشی کی ادبی خدمات صفحہ نمبر ۲۳۵
[156] [156] حیدرقریشی کی ادبی خدمات صفحہ نمبر ۲۳۵۔ ۲۳٦
[157] حیدرقریشی کی ادبی خدمات صفحہ نمبر ۲۳٦

میں اپنے جذبات کو کس طرح سمیٹ پاؤں گا، کہنا مشکل ہے۔ ابھی صرف یہ کہہ سکتاہوں کہ آپ کی یہ کتاب شاہکارکادرجہ رکھتی ہے۔ بہت بہت مبارک باد![158]

ڈاکٹر اسلم حنیف (انڈیا) :

نرم اسلوب سے جھانکتی ہوئی تصویریں جاذب نظر ہی نہیں قابل تقلید بھی بن گئی ہیں۔ خاکہ نگاری نہ ہی کارگہ شیشہ گری ہے اور نہ ہی فن بت تراشی یا مصوری اور فوٹو گرافی، بلکہ یہ تو ایک طرح کی کلوننگ ہے۔ آپ نے جن ہستیوں کی کلوننگ کی ہے ان میں ہرہستی اپنے مکمل وجود کے ساتھ ابھرآئی ہے۔ یہی آپ کے اسلوب اور فن کی بڑی کامیابی ہے۔[159]

سعیدانجم (ناروے) :

خاکوں پر مشتمل آپ کی کتاب "میری محبتیں" مجھے ملی۔ اس عنائت کیلئے آپ کا بہت بہت شکریہ!

"روشنی کی بشارت" کے افسانے پڑھنے کے بعد آپ کے ساتھ جو تعراف ہواتھا، اس کتاب کے مطالعہ کے بعد اس نے ایک اور منزل طے کرلی ہے۔ آپ سے شناسائی کی سمت "میری محبتیں" ایک دلگداز پھاٹک کی مانند ہے۔

رؤف خیر (انڈیا) :

پچھلے ہفتے "میری محبتیں" مجھے مل گئی۔ میں نے ساری کتاب پڑھ ڈالی۔ طرز تحریر دلچسپ ہونے کی وجہ سے کتاب ہاتھ سے رکھنے کو جی نہیں کررہاتھا۔ "اول خویش" والا حصہ سوانحی ہے۔ آپ کے نجی حالات سے واقفیت کا موقع ملا۔ صفحہ نمبر ۱٤ پر آپ نے اپنی سوتیلی والدہ کی لاوارثیت کا جو ذکر کیاہے وہ خود اک کہانی کا موضوع ہوسکتاہے۔ اس سلسلے میں میری ذہن میں ایک کہانی ترتیب پاگئی ہے۔ میں انشاء اللہ

---

[158] حیدرقریشی کی ادبی خدمات صفحہ نمبر ٢٣٦

[159] حیدرقریشی کی ادبی خدمات صفحہ نمبر ٢٣٦



لکھوں گا۔ بہرحال میں نے پورے ١٦٠ صفحات نہایت دلچسپی سے پڑھے ہیں۔ عنقریب تبصرہ کرکے چھپوادوں گا۔[160]

مقصود الٰہی شیخ (انگلینڈ) :

آپ کی کتاب "میری محبتیں" دیکھنی شروع کی ہے۔ لگتاہے آپ کے پاس کہنے کو بہت کچھ ہے۔ کہہ سکتے ہیں اور کہنے کا یارا بھی ہے۔ میرا دل چاہا کہ آپ کو بتاؤں کہ جو پڑھا ہے' پسند آیا۔ آپ نے بڑی مشکل باتیں بڑی آسانی سے لکھ دی ہیں' آپ کو اس کی داد ملے گی۔ یوں تو اباجی' امی جی اور دادا جی پر مضامین "ودھیا" ہیں مگر اس میں احترام کا عنصر جھلکتاہے۔ "ڈاچی والیا موڑمہاروے" میں آپ کا شریرریمارک ہونٹوں پر تبسم لاتاہے' پر جس بے تکلفی سے آپ نے اپنے نانا جی پر لکھاہے وہ سب سے زیادہ نمبرلےگیا۔ بڑی بے ساختگی ہے' روانی ہے اور گندھی ہوئی خوشگواریت لاجواب ہے---- مجھے جوگندرپال جی سے مکمل اتفاق ہے کہ یہ کتاب بہت دلچسپی سے پڑھی جائے گی----- میں کہنا چاہ رہاہوں شاعری آپ کا شوق ہے۔ ٹھیک ہے ورنہ آپ کی نثر میں شاعروں سے اچھے اور زیادہ شعریت ہے۔[161]

ترنم ریاض (انڈیا) :

"میری محبتیں" تو کمال کی کتاب ہے۔ سیدھی سنجیدہ باتیں لکھتے ہوئے آپ جو ہلکا سا مزاحیہ رنگ دے کر جملہ مکمل کرتے ہیں تو ایسا معلوم ہوتاہے جیسے قہوہ پیتے پیتے الائچی کا کوئی دانہ دانت تلے آکر ذہنو دہن کو معطر کرجائے۔[162]

ناصر نظامی (ہالینڈ) :

آپ کی کتاب "میری محبتیں" قابل تعریف ہے۔ آپ نہایت عمدگی سے کرداروں کے حالات وواقعات کی اور جذبات و احساسات کی تصویر کشی کرتے ہیں۔ آپ کے تحریر میں کمال

---

[160] حیدرقریشی کی ادبی خدمات صفحہ نمبر ٢٣٧
[161] حیدرقریشی کی ادبی خدمات صفحہ نمبر ٢٣٧
[162] حیدرقریشی کی ادبی خدمات صفحہ نمبر ٢٣٧



کارچاؤ، چٹکیاں، درد مندی، بلند حوصلگی اور گہری محبت کا اظہار پایاجاتاہے ۔ آپ کے اندر محبت کا اتھاہ گہرا سمندر موجزن ہے جو ابھی تک اپنے جیسے کسی اور عمیق سمندر کی تلاش میں سرگرداں ہے۔ آپ کی تحریر میں میں نے محبت کی طلسماتی اور ماورائی فضاؤں جیسی کیفیت محسوس کی ہے۔ کچھ ایسا جوروحانی دیوتاؤں کا ورثہ ہوتاہے۔ جو روحانیت کے عارفین کا نصیب ہوتاہے۔ مجھے آپ کے ہاں ایک روحانی ولائت کی جھلک دکھائی دی ہے۔[163]

سعید شباب (خانپور):

حیدرقریشی اپنے عزیز وقارب کے بارے میں مسلسل اچھے مضامین پیش کررہے ہیں۔ یہ مضامین خاکہ نگاری میں ایک نئے مزاج اور ذائقے کو متعارف کرارہے ہیں۔ یوں انہوں نے ثابت کردیا ہے کہ بعض معاملات میں اقرباپروری بھی اچھی ہوتی ہے۔ (مکتوب مطبوعہ اراق لاہور۔ نومبر، دسمبر ۱۹۹۲ء۔[164]

نیاز احمد صوفی (پاکستان) :

آپ کے خاکے "میری محبتیں" ماشاء اللہ زبردست ہیں۔ یہ نہ صرف آپ کی محبت کی غمازی کرتے ہیں بلکہ اس ثقافتی پس منظر اور روایات کو اجاگر کرتے ہیں جن میں آپ کی تربیت اور ذہنی نشوونما ہوئی ہے۔ آپ کے دیکھنے پرکھنے کا انداز اچھوتا پن اور یوں ایک مخصوص زاویے سے زندگی کرنے کی دعوت، ان خاکوں کا نمایاں پہلو ہیں۔ اپنی خوشگوار تحریروں سے آپ نے ایسی قدروں کو بے نقاب کیاہے جن سے نئی نسل کے جیالے آشنانہیں ہیں۔ مجھے خاص طورپر آپی اور غلام

---

[163] حیدرقریشی کی ادبی خدمات صفحہ نمبر ۲۳۷۔۲۳۸

[164] حیدرقریشی کی ادبی خدمات صفحہ نمبر ۲۳۸

جیلانی اصغر والا خاکہ بے حد پسند آیا۔ دوسرے بھی کسی طرح کم نہیں۔[165]

ثریا شہاب (جرمنی) :

"میری محبتیں" میں بیس خاکے شامل ہیں دس قریبی رشتہ داروں کے اور دس ادیبوں اور دوستوں کے۔ حیدرقریشی نے اپنے والد، والدہ ، دادا، نانا، تایا، ماموں، ہمشریہ، بیوی، بھائی اور پانچوں بچوں کے بڑے دلآویز خاکے لکھے ہیں۔ ان خاکوں میں بڑی کھلی کھلی کیفیت کا احساس ہوتاہے۔ حیدرقریشی اپنی محبوب شخصیتوں کے ساتھ اس کتاب میں زندگی بسرکرتے دکھائی دیتے ہیں۔ اس کتاب میں شامل جن شخصیات کے ساتھ ہماری دوستانہ ملاقات ہوتی ہے، وہ شخصیات کسی گروہی حوالے کے بجائے اپنے ثقافتی پس منظر سے ابھرتی ہیں اور پورے انسانی حوالے سے سامنے آتی ہیں۔ انسانی حوالے سے میری مراد کسی محدود گروہی سطح سے اوپر اٹھ کر سامنے آنا ہے۔ ادیبوں میں فیض احمد فیض، میرزا ادیب، وزیر آغا، غلام جیلانی اصغر، اکبر حمیدی، عذرااصغر اور سعید شباب کے علاوہ دو دو ستوں بریگیڈیئر اعجاز اکبر اور طاہر احمد کے خاکے شامل ہیں۔ کہیں کہیں ادبی چھیڑ چھاڑ بھی ملتی ہے۔ بعض سلگتے ہوئے موضوعات کو بھی حیدرقریشی نے چھیڑا ہے لیکن کھل کر اور سامنے آکر چھیڑا ہے۔ رشتے داروں کے خاکے لکھنے کی روایت اکبر حمیدی اور حیدرقریشی سے شروع ہوئی ہے اور اس میدان میں حیدرقریشی بہت آگے نکل گئے ہیں۔ شاید اسی لئے اشفاق احم دنے لکھا ہے کہ "ولایتی زبانوں میں ایسے سکیچ اپنے اپنے انداز میں بہت ملتے ہیں لیکن ارو میں" میری محبتیں" اپنی نوعیت کی واحد کتاب ہے۔[166]

صفیہ صدیقی (انگلینڈ):

---

[165] حیدرقریشی کی ادبی خدمات صفحہ نمبر ۲۳۸
[166] حیدرقریشی کی ادبی خدمات صفحہ نمبر ۲۳۹



آپ کی "کھٹی میٹھی یادیں" بہت پرلطف ہیں اور میں تو ادبی دیانت داری کو بہت اہم سمجھتی ہوں۔ آپ نے جس طرح صاف صاف سب کچھ جو آپ نے محسوس کیا وہ لکھ دیا یہ آپ کی خوبی ہے۔ اسی طرح "میری محبتیں" بھی آپ کے جذبات اور احساسات کی ترجمانی کرتی ہیں۔ "محبت کی نمناک خوشبو" میں آپ نے اپنی آپی کا جس طرح تذکرہ کیا ہے اسے پڑھ کر خواہش پیدا ہوتی ہے کہ کاش میری بھی کوئی ایسی محبت کرنے والی بڑی بہن ہوتی۔ "پسلی کی ٹیڑھ" میں آپ نے اپنی شریک حیات کا جس انداز میں تذکرہ کیا ہے اس سے بے انتہا مسرت ہوئی۔ ورنہ عموماً ہمارے معاشرے میں والدین کے انتخاب کردہ شوہر بیوی میں زیادہ تر ساری عمر "سرد جنگ" سی جاری رہتی ہے۔ وہ شریک سفر تو ہوتے ہیں' شریک زندگی نہیں۔[167]

نسیم سحر (سعودی عرب) :

برادرم حیدرقریشی نے مظلوم متشدد کے عنوان سے اپنے ناناجی کا خاکہ لکھنے میں اپنی نیم مزاحیہ تحریر سے بڑی دلچسپی پیدا کی ہے۔ اور نفسیاتی زاویے بھی روشن کئے ہیں۔ کردار نگاری ایسی کمال کی ہے کہ کسی بھی مرحلہ پر قاری کو ان کے ناناجی سے نفرت نہیں ہوتی۔ عنوان خود ان کے کردار کو ظاہر کردیتاہے۔ بعض مقامات پر نانا جی کی Frankness بھی قابل داد ہے۔ انہوں نے برادرم قریشی کو امرت دھارا اور ایٹم بم کے جو نسخے عنایت فرمائے تھے اس کے مزاحیہ ذکر نے بھی خاصے کی چیز بنادیاہے۔ جیؤحیدرقریشی! ایٹم بم کی جو گولیاں آپ کو ملیں ان میں سے دو تین ادھر بھی روانہ کردینا، صرف اسی صورت میں کہ وہ آزمودہ ہوں" (مکتوب مطبوعہ۔ماہنامہ "صریر" کراچی ۱۹۹۲ء۔ [168]

عارف فرہاد :

---

[167] حیدرقریشی کی ادبی خدمات صفحہ نمبر ۲۳۹
[168] حیدرقریشی کی ادبی خدمات صفحہ نمبر ۲۳۹

تمام خاکے سچے خلوص کے موتیوں کی طرح محبت کے ریشمی دھاگے ہیں ایسے پروئے گئے ہیں کہ گزرے ہوئے زمانے میں لوٹ جانے کو اور مذکورہ شخصیات کو ملنے کو جی چاہتاہے۔[169]

جاوید خان (جرمنی):

آپ کے خاکے پڑھتے ہوئے کئی بار خود سے ملاقات ہوئی۔ کئی باریوں لگا کہ آپ کے اندر میں خود بول رہاہوں۔ رحیم یارخاں کی گلیوں میں گھوم رہاہوں۔ شاید یہ باتیں میری سمجھ میں اپنے حقیقی معنوں میں اس لئے آتی ہیں کہ میں نے غربت کا چہرہ بہت قریب سے دیکھاہے۔ مجھے حئی سنزشوگر ملز اور پاکستان آرڈیننس فیکٹریز واہ میں کوئی فرق محسوس نہیں ہوتا۔ وہی مزدور یونینز، وہی ان کے مطالبات اور انتظامیہ کے وہی ہتھکنڈے۔ کچھ بھی تو مختلف نہیں۔ مسائل ،و سائل، محبتیں، نفرتیں، تلخیاں، خلوص سب کچھ ایک جیسا ہے۔ بہت پہلے ایک بار پاکستان گیا تو ٹیلی ویژن پر ایک ڈرامہ سیریل چلرہی تھی۔ گھروالے زبردستی مجھے بھی ساتھ بٹھا لیتے۔ اس ڈرامے کی بیک گراؤنڈ میں ایک گیت کا بول بار بار دہرایا جاتا۔ مائے نی میں کنوں آکھاں درد وچھوڑے داحال نی۔۔۔۔ یہ گیت جیسے میرے اندر سرایت کرگیاتھا۔ آپ کا یہ خاکہ پڑھتے ہوئے میری کیفیت بھی مس روزلین سے کچھ مختلف نہ تھی۔ اماں جان بقید حیات ہیں مگر چراغ سحری ہیں اور میں اکلوتی اولاد ہونے کے باوجود انہیں درد و چھوڑا دیئے بیٹھا ہوں۔ کیاکروں؟ کچھ بھی تو اپنے اختیار میں نہیں۔ (دکھاں دی) روٹی پاؤں کی زنجیر بن گئی ہے ورنہ اپنے پیاروں سے دور رہ کر جینا بھی کوئی جینا ہے!

حیدرصاحب! جوبے ساختگی اور سچائی میں نے آپ کی تحریر میں پائی ہے بہت کم لوگوں کے ہاں ملتی ہے۔ مجھے خاص سطح سے نیچے کی تحریریں بالکل متاثر نہیں کرتیں۔ میں ادب کا ایک حقیرطالب علم ہوں لیکن سچائی کی تلاش میں رہتاہوں۔ بناوٹ یا بڑے نام میرے نزدیک کوئی حیثیت نہیں رکھتے۔ نہ ہی مجھے

[169] حیدرقریشی کی ادبی خدمات صفحہ نمبر ۲٤۰

کبھی کسی کی دولت مرعوب کرتی ہے۔ یہ سب میرے لئے سطحی اور چھوٹی باتیں ہیں۔ خدا آپ کا زور قلم اور زیادہ کرے۔ جو راہ آپ نے اپنے لئے منتخب کی ہے وہ "زگ زیگ" سہی۔ مگر جاتی بہرحال منزل کی طرف ہے۔ اسلئے کہ جذبوں کی صداقت اپنا رستہ خود متعین کرتی ہے۔ لکیروں کے ڈسے مجھ سے لوگوں کیلئے آپ بہر حال خضر راہ ہیں۔[170]

میری محبتیں پر چند تاثرات

''میری محبتیں ''پر بہت سارے ادبی دوستوں نے مضامین اور تبصرے لکھے۔بعض نے خطوط کے ذریعہ اپنے تاثرات سے آگا ہ کیا۔ان سارے تاثرات کا ایک نہایت مختصر سا انتخاب یہاں پیش کیاجارہاہے۔

اشفاق احمد میری محبتیں پر رائے دیتے ہوئے کہتے ہیں۔

''ولایتی زبانوں میں ایسے اسکیچ اپنے اپنے انداز میں بہت ملتے ہیں لیکن اردو میں''میری محبتیں ''اپنی نوعیت کی واحد کتاب ہے''

جوگندر پال لکھتے ہیں۔

حیدر قریشی کی اس کتاب کے بیس خاکے دو حصوں میں بٹے ہوئے ہیں۔پہلے دس کے لئے تو وہ اپنے گھر کی چار دیواری میں ہی تاکا کیا ہے اور باقی دس کے لئے گھر سے باہر نکل آیا ہے۔اوّل خویش،بعد درویش۔۔۔۔۔۔۔گھر والوں کے تو کلوز اپ تیار ہو گئے ہیں اور درویشوں کے پروفائل، اور ہر دو پر سے نظر ہٹانے کو جی نہیں چاہتا۔ آج کے مشینی دور کی مصروفیت میں سچ مچ کی ملاقاتوں کی گنجائش خطرناک حد تک سکڑتی جا رہی ہے۔ان حالات میں یہ بھی غنیمت ہے کہ اوروں کے خاکے پڑھ پڑھ کر ہی ہماری ان سے ملنے کی چاہ پوری ہوتی رہے۔ یوں نہیں تو یونہی سہی،جیسے بھی انسان اپنے آپ کو 'انسانیا'

---

[170] حیدرقریشی کی ادبی خدمات صفحہ نمبر ٢٤٠

لے۔ مجھے یقین ہے کہ حیدر قریشی کی محبتوں کی یہ کتاب بہت دلچسپی سے پڑھی جائے گی!

ڈاکٹر گیان چند جین کی رائے ہے۔‘‘میری محبتیں’’کے ابتدائی پانچ چھ مضامین میں نے پوری طرح پڑھے ’بقیہ کو سرسری دیکھا۔دوسرے حصہ میں پہلے چار خاکے نیز آخری مضمون پرانے ادبی دوست پڑھا۔خوب لکھتے ہیں،آپ نے اپنے بزرگوں کے محیرالعقول واقعات لکھے ہیں’ان سے میں متاثر ہوا۔ تمام مضامین بہت دلچسپ اور دلکش ہیں،

منشا یاد اس کتاب کے بارے میں لکھتے ہیں۔
حیدر قریشی نے سچ کادامن کہیں نہیں چھوڑا ۔یہی وجہ ہے کہ ان کی تحریر میں متاثر کرنے کی قوت ہے ۔ان کے خوبصورت اندازِ تحریر نے اسے اوربھی دلنشین بنادیاہے---- میری محبتیں ’’خاکوں کا ایک بہت ہی خوبصورت اور خیال انگیز مجموعہ اورخاکہ نگاری کے فن میں ایک اہم اضافہ ہے۔

مصر میں اردو کے اسکالرہانی السعید لکھتے ہیں۔
’’میری محبتیں’’میری نظر میں اردو خاکہ نگاری میں ہی نہیں مجموعی اردوادب کی بھی ایک بڑی اہم کتاب ہے۔

ڈاکٹر رضیہ حامد لکھتی ہیں۔
’’میری محبتیں ’’کئی مرتبہ پڑھ چکی ہوں اور یہی حال رہا تو میں اس کی حافظ ضرور ہو جاؤں گی۔ آپ کی تحریر میں بلا کی سادگی اور قاری کو باندھ رکھنے کی طاقت ہے۔درد کی پوشیدہ لہریں دل و دماغ میں اندر تک اتر جاتی ہیں اور قاری اپنے آپ کو قاری نہ سمجھ کر حیدر قریشی بن جاتا ہے۔یہ آپ کی تحریر کا کمال ہے۔‘‘

قاضی اعجاز محور کی رائے ہے۔

یہ خاکے جہاں حیدرقریشی کی محبتوں کے امین ہیں وہاں ہمارے معاشرے کے ایک عام گھرانے کے طرزتمدن کا بھرپور عکس بھی ہیں۔ "میری محبتیں"صرف محبتوں کی داستان ہی نہیں بلکہ اس میں خود مصنف سمیت ہر عمر کے افراد کا رزارحیات میں سرگرمِ عمل دکھائی دیتے ہیں اور اس طرح یہ کتاب حیاتِ انسانی کے لیے جدو جہد کا ایک پیغام بن جاتی ہے۔

خاور اعجاز لکھتے ہیں۔
حیدر قریشی کی یہ تحریریں محبت کی چاشنی میں ڈوبی ہوئی ہیں۔ کہیں کہیں ہلکا سا طنز یا مزاح کا پہلو لئے ہوئے کوئی چبھتی ہوئی بات بھی محبت ہی کا ایک اظہار ہے۔

انگلینڈ کے **محمود ہاشمی** رقم طراز ہیں۔
آپ کی بھیجی ہوئی‘‘میری محبتیں’’مجھے مل گئی ہے۔یقیناََ یہ کتاب کا کمال ہے کہ اسے پڑھنا شروع کیا تو پڑھتا ہی گیا۔او ر اس وقت تک کسی اور طرف توجہ دینے کا ہوش ہی نہ رہا جب تک کہ وہ ختم نہ ہوگئی۔آپ کی‘‘محبتیں’’پڑھی تو آپ کے قلم اور مشاہدہ کا قائل ہونا پڑا۔

رؤف خیرکہتے ہیں۔"میری محبتیں" اتنے دلچسپ اسلوب میں لکھی گئی ہے کہ کتاب ہاتھ سے رکھنے کو جی نہیں کرتا۔

سید وقار معین کی رائے ہے۔ " میری محبتیں" تازہ ہوا کے جھونکے کا احساس دلاتی ہے۔ یقین ہے کہ یہ ہمیشہ ذوق و شوق سے پڑھی جاتی رہے گی اور اردو میں خاکہ نگاری کی ایک دلکش اور منفرد جہت کے طور پر تاریخ ادب میں اس کا حوالہ ناگزیر ہو گا ۔

فاروق شکیل اپنے تاثرات کا اظہار کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔
حیدر قریشی کی تحریر میں مقناطیسی کیفیت ہے جو قارئین کو پیار کی ڈور سے باندھے ہوئے ان بستیوں میں لے جاتی ہے

جہاں کی مٹی میں مہرو وفا کی مہک ہے اور وہ کردار ہیں جو ابا جی،امی جی،دادا جی،نانا جی،تایا جی،ماموں ناصر،آپی،مبارکہ،چھوٹے بھائی طاہراور بچوں کی صورتوں میں نظر آتے ہیں۔ان تمام سے مل کر اپنائیت کا ایسا احساس جاگتا ہے جیسے وہ سب ہمارے اپنے ہی ہیں۔

عظیم انصاری لکھتے ہیں۔
انداز تحریر میں اتنی برجستگی ہے کہ کہیں بھی احساس نہیں ہوتا کہ آپ اس گھر کے فرد سے پہلی بار مل رہے ہیں۔اس حصّے میں حیدر صاحب کی بے تکلفی،قرابت داری اور جذباتی والہانہ لگاؤ کا عکس اس انداز میں نمایاں ہیں کہ بعض اوقات قاری کی آنکھیں بھیگ جاتی ہیں۔خاکہ نگاری کا اس سے عمدہ نمونہ اور کیا ہو سکتا ہے۔

سلطانہ مہر لکھتی ہیں۔
حیدر قریشی کی ادبی حیثیت کے کئی پہلو ہیں۔اتنی رنگا رنگی کم ہی شخصیتوں میں پائی جاتی ہے۔ ان کی شاعری، تنقید'افسانے اور خاکے پڑھ کرمیں اس نتیجے پر پہونچی کہ خاکہ نگاری میں انہیں کمال حاصل ہے۔ اس دلنشیں اندازمیں انہوں نے شخصیات کے واقعات کے'ماحول کے اور قصّوں کے قلمی نقشے تراشے ہیں کہ قاری ان کے سحر میں گم ہوجاتا ہے۔

ترنم ریاض کی بے ساختہ رائے یوں ہے۔
'میری محبتیں ' تو کمال کی کتاب ہے سیدھی،سنجید ہ باتیں لکھتے ہوئے حیدر قریشی جو ہلکا سا مزاحیہ رنگ دے کر جملہ مکمل کرتے ہیں تو ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے قہوہ پیتے پیتے الائچی کا کوئی دانہ دانت تلے آکر ذہن و دہن کو خوشبو سے معطر کر جائے۔

محمد اکرم:امریکہ سے لکھتے ہیں۔چند ماہ قبل جب ''عمر لاحاصل کا حاصل'' پڑھنے کا موقع ملا تو لطیف تر حسیات



رکھنے والے اس منکسر المزاج اور رقیق القلب شخص سے ملاقات ہوئی تو لطف دو آتشہ ہو گیا ۔آج مدرز ڈے کے حوالے سے حیدر قریشی کی تحریر پڑھ کر مجھے اپنی ماں یاد آگئی اور ایک ایک لفظ کے ساتھ جہاں حیدر قریشی کی امی جی کو تصور (ویژولائز) کر تارہا وہیں اپنی امی جی کا چہرہ آنکھوں کے سامنے لاکر اشکبار ہو تا رہا ۔ ماؤں کے سانجھا ہونے کا ایک یہ مفہوم بھی تو ہے۔

جاوید خان: جرمنی سے اظہار خیال کرتے ہوئے کہتے ہیں۔حیدر صاحب!جو بے ساختگی اور سچائی میں نے آپ کی تحریر میں پائی ہے بہت کم لوگوں کے ہاں ملتی ہے۔مجھے ایک خاص سطح سے نیچے کی تحریریں بالکل متاثر نہیں کرتیں۔میں ادب کا ایک حقیر طالب علم ہوں لیکن سچائی کی تلاش میں رہتا ہوں۔بناوٹ یا بڑے نام میرے نزدیک کوئی حیثیت نہیں رکھتے۔نہ ہی مجھے کبھی کسی کی دولت مرعوب کرتی ہے۔یہ سب میرے لئے سطحی اور چھوٹی باتیں ہیں۔خدا آپ کا زور قلم اور زیادہ کرے۔جو راہ آپ نے اپنے لئے منتخب کی ہے وہ ''زگ زیگ''سہی۔مگر جاتی بہر طور منزل کی طرف ہے۔اس لئے کہ جذبوں کی صداقت اپنا رستہ خود متعین کرتی ہے۔لکیروں کے ڈسے مجھ سے لوگوں کے لئے آپ بہر حال خضر راہ ہیں۔

ناصر نظامی:ہالینڈ سے ان الفاظ میں محبت کا اظہار کرتے ہیں۔ آپ کی کتاب ''میری محبتیں''قابل تعریف ہے۔آپ نہایت عمدگی سے کرداروں کے حالات و واقعات کی اور جذبات و احساسات کی تصویر کشی کرتے ہیں۔آپ کی تحریر میں کمال کا رچاؤ' چٹکیاں' دردمندی' بلند حوصلگی اورگہری محبت کا اظہار پایا جاتا ہے۔آپ کے اندر محبت کا اتھاہ گہرا سمندر موجزن ہے جو ابھی تک اپنے جیسے کسی اور عمیق سمندر کی تلاش میں سرگرداں ہے۔آپ کی تحریر میں میں نے محبت کی طلسماتی اور ماورائی فضاؤں جیسی کیفیت محسوس کی ہے۔کچھ ایسا جو روحانی دیوتاؤں کا ورثہ ہوتا ہے۔جو روحانیت کے عارفین کا

نصیب ہوتا ہے۔مجھے آپ کے ہاں ایک روحانی ولائت کی جھلک دکھائی دی ہے۔

ڈاکٹر مناظر عاشق ہرگانوی لکھتے ہیں۔ ابھی'' میری محبتیں ''پڑھ رہا ہوں۔بعض خاکے پڑھ کر آپ کی زندگی کے اتار چڑھاؤ سے بے حد متاثر ہوا ہوں۔مجھے لگا کہ ذہنی سفر میں میرا آپ کا ساتھ ہو گیا ہے۔لکھنے بیٹھوں گا تب میں اپنے جذبات کو کس طرح سمیٹ پاؤں گا'کہنا مشکل ہے ۔ابھی صرف یہ کہہ سکتا ہوں کہ آپ کی یہ کتاب شاہکار کا درجہ رکھتی ہے۔بہت بہت مبارک باد۔

اسلم حنیف رائے دیتے ہیں۔نرم اسلوب سے جھانکتی ہوئی تصویریں جاذب نظر ہی نہیں قابل تقلید بھی بن گئی ہیں۔خاکہ نگاری نہ ہی کارگہ شیشہ گری ہے اور نہ ہی فن بت تراشی یا مصوری اور فوٹو گرافی'بلکہ یہ تو ایک طرح کی کلوننگ ہے۔آپ نے جن ہستیوں کی کلوننگ کی ہے ان میں ہر ہستی اپنے مکمل وجود کے ساتھ اُبھر آئی ہے۔یہی آپ کے اسلوب اور فن کی بڑی کامیابی ہے۔

سعید انجم: ناروےسے رقم طراز ہیں۔خاکوں پر مشتمل آپ کی کتاب ''میری محبتیں''مجھے ملی۔اس عنائت کے لئے آپ کا بہت بہت شکریہ**!**''روشنی کی بشارت''کے افسانے پڑھنے کے بعد آپ کے ساتھ جو تعارف ہوا تھا'اس کتاب کے مطالعہ کے بعد اس نے ایک اور منزل طے کر لی ہے۔آپ سے شناسائی کی سمت''میری محبتیں''ایک دلگداز پھاٹک کی مانند ہے۔

مقصود الٰہی شیخ:انگلینڈ سے لکھتے ہیں۔آپ کی کتاب ''میری محبتیں''دیکھنی شروع کی ہے۔لگتا ہے آپ کے پاس کہنے کو بہت کچھ ہے۔کہہ سکتے ہیں اور کہنے کا یارا بھی ہے۔میرا دل چاہا کہ آپ کو بتا ؤں کہ جو پڑھا ہے' پسند آیا ۔آپ نے بڑی مشکل باتیں بڑی آسانی سے لکھ دی ہیں'آپ کو اس کی داد ملے

گی-یوں تو ابا جی ’امی جی اور دادا جی پر مضامین‘‘ودھیا’’ہیں مگر ان میں احترام کا عنصر جھلکتا ہے-‘‘ڈاچی والیا موڑ مہارو ے’’میں آپ کا شریر ریمارک ہونٹوں پر تبسم لاتا ہے’پَر جس بے تکلفی سے آپ نے اپنے نانا جی پر لکھا ہے وہ سب سے زیادہ نمبر لے گیا-بڑی بے ساختگی ہے’روانی ہے اور گندھی ہوئی خوشگواریت لا جواب ہے-----مجھے جوگندر پال جی سے مکمل اتفاق ہے کہ یہ کتاب بہت دلچسپی سے پڑھی جائے گی----میں کہنا چاہ رہا ہوں شاعری آپ کا شوق ہے-ٹھیک ہے ورنہ آپ کی نثر میں شاعروں سے اچھی اور زیادہ شعریت ہے-

نیاز احمد صوفی لکھتے ہیں-آپ کے خا کے ‘‘میری محبتیں’’ماشاء اللہ زبردست ہیں-یہ نہ صرف آپ کی محبت کی غمازی کرتے ہیں بلکہ اس ثقافتی پس منظر اور روایات کو اجاگر کرتے ہیں جن میں آپ کی تربیت اور ذہنی نشوونما ہوئی ہے-آپ کے دیکھنے پرکھنے کے انداز کا اچھوتا پن اور یوں ایک مخصوص زاویے سے زندگی کرنے کی دعوت’ان خاکوں کا نمایاں پہلو ہیں-

بیگم وسیم راشد لکھتی ہیں-حیدر کے یہ خاکے اس لیے بھی اہم ہیں کہ ان میں ہمیں اپنی زندگی کا عکس نظرآجاتاہے -یہ احساس رہتاہے کہ یہ سارے اسی کے ہی نہیں ہمارے بھی قرابت دار اور جان پہچان والے ہیں -

*****

سوئے حجاز پر چند تاثرات

علامہ شارق جمال-ناگ پور ،انڈیا
ان تمام مذکورہ زیارتوں کے حال کو ،سفر میں دیکھے ہوئے تمام محترم مقامات کو تفصیل سے حیدر قریشی صاحب نے قرطاس کے حوالے کیا ہے-ساتھ ہی جگہ جگہ اپنے انداز میں ان پر تبصرہ بھی فرمایا ہے اور قرآن حکیم کے اپنے وسیع ترین مطالعے کو بھی سامنے رکھ کر متعلقہ آیتوں کو بھی ترجمے کے ساتھ پیش کیا ہے-ساتھ ہی اپنے نظریات کو بھی بر سبیل تذکرہ بیان میں لے آیا گیا ہے-

لیکن پھر بھی ان سے متعلق تحریر کیا ہے کہ:‘‘سوئے حجاز---میں میرے نظریات اور تصوّرات جس انداز میں آئے ہیں،ان سے اتفاق کرنا قطعاََ ضروری نہیں ہے’’
یہ سفر نامہ ہر سفر حجاز کرنے والے کے لئے ایک رہبر کی حیثیت رکھتا ہے کہ اس میں تمام ضروری باتیں،ارکان،دعاؤں کے مقام جو عمرے سے متعلق ہیں احاطۂ تحریر میں آگئی ہیں-کن ارکان کو کیسے ادا کرنا ہے؟کہاں کہاں نفل نمازیں پڑھنا ہے؟کہاں کہاں دعا مانگنا ہے؟کس طرح مانگنا ہے؟تفصیل کے ساتھ جنابِ حیدر قریشی نے تحریر فرما یا ہے-

اکبر حمیدی-اسلام آباد،پاکستان
کچھ باتیں اس سفرنامے میں مجھے بہت نمایاں دکھائی دیں جن کا مختصر اظہار درج ذیل ہے:

1- یہ سفرنامے حیدر قریشی کے ظاہری ہی نہیں باطنی اور روحانی سفرنامے بھی ہیں-

2- ان سفرناموں میں ان کیفیات کا والہانہ اظہار ہے جو اس دوران حیدرقریشی صاحب کو محسوس ہوتی رہیں-



-3 ان سفرناموں میں ان مقامات کے تاریخی پس منظر بھی بیان کیے گئے ہیں جو مصنف کے مشاہدے میں آئے یا جہاں جہاں سے وہ عمرہ اور حج کی ادائیگی کے دوران گزرتے رہے۔ یہ تاریخی پس منظر محض مذہبی نقطۂ نظر ہی نہیں رکھتے بلکہ تاریخی اور جغرافیائی حوالے بھی بنتے دکھائی دیتے ہیں جن کی اس لیے بھی خاص اہمیت ہے کہ جو لوگ مسلمان نہیں ہیں وہ بھی علمی سطح پر ان معلومات سے مستفید ہو سکتے ہیں۔ یوں یہ سفرنامہ محض مذہبی حیثیت ہی نہیں رکھتا جو ہمارے نزدیک نہایت قابل قدر ہے بلکہ ایک تاریخی اور علمی حیثیت بھی رکھتا ہے جو ان لوگوں کے لیے بھی ہے جو مذہبِ اسلام سے تعلق نہیں رکھتے جنہیں مذہب سے زیادہ دلچسپی نہیں ہے۔

-4 اس سفرنامے میں ان مشکلات کا بھی ذکر ہے جو دوران حج یا عمرہ کے دوران حجاج کرام کو یا زائرین کو پیش آتی ہیں یا پیش آسکتی ہیں۔ اس سفرنامے کے ذریعے وہ ان متوقع مشکلات کی پیش بندی کا اہتمام بھی کر سکتے ہیں۔

-5 اس سفرنامے میں مقامی انتظامیہ کی ان غفلتوں کا بھی ذکر ہے جن کے باعث زائرین کو مسائل کا سامنا بھی کرنا پڑتا ہے۔ اس ضمن میں ان کمپنیوں کے رویّوں کا بھی ذکر ملتا ہے جنہیں دوران حج مختلف طرح کے کام تفویض کیے جاتے ہیں اس سفرنامے سے اندازہ ہوتا ہے کہ بعض کام خوش اسلوبی سے بھی سرانجام دیئے جاتے ہیں اور بعض غفلت کے باعث حجاج کرام کی مشکلات میں اضافے کا باعث بنتے ہیں۔

-6 اس سفرنامے سے زائرین کورہنمائی بھی ملتی ہے کہ ایسا سفر آغاز کرنے سے قبل انہیں کن کن باتوں کو اورکن کن التزامات کو ملحوظ خاطر رکھنا چاہیے۔ یوں یہ سفرنامہ ایک مخصوص افادیت کا حامل بن جاتا ہے جس کا مطالعہ زائرین کے لیے بیحد مفید ثابت ہو سکتا ہے۔



7- تاریخی اعتبار سے یہ سفرنامہ معلومات کا خزانہ ہے جس کے گہرے مطالعے سے وہاں کے اہم مقامات کے بارے میں قیمتی تاریخی معلومات حاصل ہوتی ہیں۔

8- وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ ان مقدس مقامات اور ماحول میں کیا کیا تبدیلیاں رونما ہوئی ہیں ان سے بخوبی معلومات حاصل ہوتی ہیں۔ ان میں بعض تبدیلیاں تکلیف دہ بھی ہیں۔

9- یہ سفرنامہ ایک روحانی سیر ہے مگراسلوب اور ناقدانہ نظر ایک باشعور ادیب کے ہیں۔ یہ ادبی زبان میں لکھا ہوا روحانی سفر نامہ ہے جس میں وہاں کی انتظامی خامیوں پر تنقید بھی کی گئی ہے جو حجاج کرام کے لیے پریشانی کا باعث ہے۔

10- اس سفرنامے میں موضوعات کی رنگارنگی اور انداز بیان کا بہت لطف شامل ہیں۔

11- یہ سفرنامہ اپنے اندر جہاں تاریخی حقائق رکھتا ہے وہاں جذبوں کے ایسے مناظر بھی ملتے ہیں جو پڑھنے والے کواپنی رو میں بہالے جاتے ہیں اور پڑھنے والا محسوس کرنے لگتا ہے جیسے وہ خود بھی حیدر قریشی کے ساتھ اس مبارک سفر میں شریک ہے۔

12- یہ سفرنامہ اپنے صفحات کے لحاظ سے طویل نہیں مگر معنی،معلومات، کیفیات، تاریخی تعارفات اور پیش آمدہ مسائل و معاملات نیز مشاہدات کے باعث بہت بسیط ہے۔ دیوان غالبؔ کی طرح جو حجم میں قلیل ہے مگر معنی میں طویل۔

13- میری رائے میں حیدر قریشی کایہ سفرنامہ اردو میں لکھے ہوئے حج کے سفرناموں میں ایک بہت نمایاں اور

ممتاز مقام کا حامل ہے اور سفرناموں کے ضمن میں ایک قیمتی اضافہ جو آئندہ چل کر بہت سے نقطہ ہائے نظر سے تاریخی حوالہ جات کا کام دے گا۔

14- یہ سفرنامہ بے شک بڑی عقیدت سے لکھا گیا ہے جس میں مصنف کے انتہائی والہانہ عقیدتی جذبات کا اظہار ہوتا ہے۔۔۔ مگر مصنّف بنیادی طور پر ادیب اورشاعر ہے۔ اس لیے اس نے یہ سفرنامہ کھلی آنکھوں سے اپنے ماحول کودیکھ کر ایک ادیب کے ذہن سے سوچ کر ایک شاعر کے قلم سے لکھا ہے۔ جسے پڑھ کر بار بار شاعرانہ شعور کا احساس ہوتا ہے۔ مصنف نے اپنی عقیدت کو اپنی ذات تک محدود رکھا ہے اور تاریخی واقعات اور مشاہدات کو قطعاً علمی اور فکری تجربات کے ساتھ قلم بند کیا ہے۔ یہ گویا قعردریا میں اتر کر دامن خشک رکھنے والی بات ہے جس کا حافظ نے ذکر کیا تھا۔

15- حیدر قریشی کا سفر نامہ ’’سوئے حجاز‘‘ پڑھتے ہوئے اس موضوع کا کوئی بھی سفرنامہ یاد نہیں آتا۔ اس کی وجہ حیدر قریشی کا منفرد انداز فکر اور منفرد اسلوبِ تحریر ہے۔ حیدر قریشی کا یہ امتیاز بہت نمایاں ہے کہ وہ قاری کی تمام تر توجہ اپنی جانب اس طور باندھ رکھتا ہے کہ پڑھنے والے کو کہیں اِدھر اُدھر کی نہ تو فرصت ملتی ہے اور نہ ہی ضرورت محسوس ہوتی ہے۔ وہ حیدر قریشی کے تخلیقی سحر میں سر تا پا شرابور ہوتا چلا جاتا ہے۔مَیں اپنے عزیز دوست کواس شاہکار سفرنامے پر مبارکباد دیتا ہوں۔[171]

افتخار امام صدیقی-ممبئی،انڈیا
سوئے حجاز میرے لئے ایک انمول تحفہ ہے۔یوں لگاگویا میں آپ دونوں کے ساتھ سفر کر رہا ہوں۔مکہ معظمہ اور مدینہ منورہ

[171] اکبر حمیدی کے مضمون حیدر قریشی سوئے حجاز کا ایک حصہ

کے سارے متبرک مناظر اور شب و روز مجھے یاد آئے۔

ڈاکٹر نذر خلیق۔اسلام آباد،پاکستان
سوئے حجاز کی فکری اور ادبی سطح کے علاوہ بھی اورکئی سطحیں ہیں جن کا اس مختصر مضمون میں احاطہ کرنا مشکل ہے تاہم یہ بات کہی جا سکتی ہے کہ حیدر قریشی کا یہ سفرنامہ عصر حاضر کے بیشتر سفرناموں میں منفرد مقام رکھتا ہے حیدر قریشی اپنی دیگر تخلیقات کی طرح اس سفر نامہ میں بھی اپنے تخلیقی جوہر دکھانے میں کامیاب ہوئے ہیں اور یہ بات طے ہو چکی ہے کہ حیدر قریشی عصر حاضر کے چند منفرد اور پہلی صف کے تخلیق کار ہیں اور ان کے لیے کسی بھی صنفِ ادب میں لکھنا کوئی مشکل بات نہیں ہے۔

مولانا مفتی خالد محمود ۔کراچی،پاکستان
Your SAFARNAMA is very useful and valuable.I read in 1 sitting.

یونس خان۔سرگودھا،پاکستان
پارسل کی ڈوری کیا کھولی کہ محبت کی دوری سے بندھ گیا۔سوئے حجاز فوراََ پڑھنا شروع کی۔دو نشستوں میں عمرے کا سفر نامہ ختم کیا ایک افطاری سے پہلے اور دوسری افطاری کے بعد۔آج حج کا سفر نامہ پڑھ کے ختم کیا ہے اور نیٹ پر آگیا ہوں۔سارا سفر نامہ دردمندی اور عقیدت سے لکھا گیا ہے۔بلا وجہ کسی کو جذباتی نہیں کیا۔بات سادگی سے کہہ دی ہے۔سفر نامے کو انتہائی مختصر رکھا گیا ہے،شاید یہی اس کی خوبصورتی بھی ہے کہ بات کو زیادہ پھیلایا نہیں گیا۔ایک بات زیادہ خوبصورت لگی کہ سفر نامہ ہَیٹرس ہائم سے شروع ہوتا ہے،پاکستان سے نہیں۔

منزہ یاسمین۔بھاولپور،پاکستان

سفرنامہ ‘‘سوئے حجاز’’ جہاں حیدر قریشی کے احساسات اور خیالات کی بہترین ترجمانی کرتاہے ، وہاں اپنے قارئین کے لیے نہایت اہم تاریخی اور مذہبی معلومات کا خزینہ بھی ہے------ حیدر قریشی نے اپنے سفرنامہ ‘‘سوئے حجاز’’ میں جگہ جگہ مختلف پیغمبروں اور نبیوں کے فرمودات، واقعات اور قرآنی حوالے پیش کیے ہیں ، جن سے اُن کے وسیع دینی علم کا پتا چلتاہے۔

ارشد حسین۔حیدرآباد،انڈیا

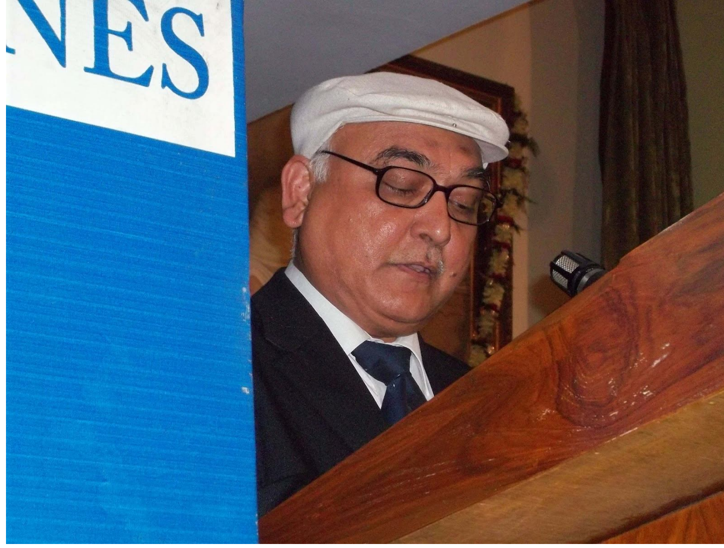
سوئے حجاز سفر نامہ نظر نواز ہوا۔دل میں زیارتِ کعبہ کی زبردست خواہش پیدا ہوئی ہے۔

after_Faiz_seminar_asiatic_society_kolkata





Autograph_detay_huey_3



H_Q__Faiz_Seminar



H_Q_aur_fatima_hassan



H_Q_Faiz_seminar_Iftetahi_taqreer



hazreen_faiz_seminar_2


jadeed_adab_present_kartay_huey


_khalid_saeed, h_q



kolkata_meN_students_ko_autograf_detay_huey



seminar_ki_report_parrhtay_huey_001



shahnaz_nabi,H_Q_Pallab_Sen,Mihir_chakar_warti



university_student_ko_autograf_detay_huey

معاون کتب

حیدرقریشی کی کتابیں:

کتاب	مصنف	ناشر	سنہ اشاعت
ادھر ادھر سے	حیدرقریشی	ایجوکینشل پبلشن ہوس ، دہلی	۲۰۰۸
اردو ماہیے کے بانی ہمت رائے شرما	حیدرقریشی	معیار پبلی کیشنز دہلی	۱۹۹۹
اردو ماہیے	حیدرقریشی	فرہاد پبلی کیشنز، راولپنڈی۔	۱۹۹۹
اردو میں ماہیا نگاری	حیدرقریشی	فرہاد پبلی کیشنز، راولپنڈی	۱۹۹۷
افسانے	حیدرقریشی	معیار پبلی کیشنز، دہلی	۱۹۹۹
تاثرات	حیدرقریشی	ایجوکیشنل پبلشنگ ہاوس دہلی،	۲۰۱۲
حاصل مطالعہ	حیدرقریشی	ایجوکیشنل پبلشنگ ہاوس دہلی	۲۰۱۲
خبرنامہ	حیدرقریشی	ایجوکیشنل پبلشنگ ہاوس، دہلی	۲۰۰۶
دعائے دل	حیدرقریشی	نصرت پبلی کیشنز دہلی	۱۹۹۷
ڈاکٹر وزیر	حیدرقریشی	انٹرنیٹ کی	۲۰۱۱



آغا۔ عہد ساز شخصیت غیر مطبوعہ		معرفت	
سوئے حجاز	حیدرقریشی	معیار پبلی کیشنز دہلی	۲۰۰۰
عمرگریزاں	حیدرقریشی	تجدید اشاعت گھر، لاہور	۱۹۹۶
عمرلاحاصل کا حاصل	حیدرقریشی	ایجوکیشنل پبلشنگ ہاوس دہلی	۲۰۰۵
غزلیں، نظمیں، ماہیے	حیدرقریشی	سرور ادبی اکادمی، جرمنی	۱۹۹۸
محبت کے پھول	حیدرقریشی	نایاب پبلی کیشنز خانپور	۱۹۹۶
میری محبتیں	حیدرقریشی	نایاب پبلی کیشنز، خانوپر	۱۹۹۶

دیگر کتب

آہنگ	مجاز لکھنوی		
انٹرویوز	سیعدشباب	نظامیہ آرٹ اکیڈمی، ہالنڈ	۲۰۰٤
افسانے کی حمایت میں	شمس الرحمٰن فاروقی		
انتخاب کلام میر	مولوی عبدالحق	انجمن ترقی اردو ، علیگڑھ	۱۹۸۵
اردو شاعری کا تنقیدی مطالعہ	سنبل نگار	ایجوکیشنل بک ہاوس، علی گڑھ	۲۰۱۰
اردو نثر	سنبل نگار	ایجوکیشنل بک	۲۰۱۰

		ہاوس، علی گڑھ	
کلیات ساحر	ساحر لدھیانوی		
مہردونیم	افتخار عارف		
دیوان غالب	غالب		
مسدس حالی	مولانا حالی		
افسانے کی حمایت میں	شمس الرحمٰن فاروقی		
آب حیات	شمس العلماء مولانا محمد حسین آزاد	کاک آفسیٹ پرنٹرس، دہلی	۲۰۰٤
کلیات اقبال	علامہ اقبال	اعتقاد پبلشنگ ہاوس، نئی دہلی-	
نسخہ ہائے وفا	فیض احمد فیض	ایجوکیشن پبلشنگ ہاوس، دہلی	۱۹۹۷
فن افسانہ نگاری	وقار عظیم	خواجہ پریس، دہلی	۱۹٦۹
جدید اردو تنقید اصول و نظریات	ڈاکٹر شارب ردولوی	اترپردیش ارو اکادمی، لکھنو	۱۹۸۷
انتخاب کلیات جوش	جوش ملیح آبادی، ترتیب ڈاکٹر فضل امام	فریدبک ڈپو	
تاثراورتنقید	عبدالرب استاد	ایجوکشنل بک ہاوس، دہلی	۲۰۰۸

ادبی جرائد:



جدید ادب پہلا شمارہ جولائی تا ڈسمبر ۲۰۰۳ء
جدید ادب دوسرا شمارہ جنوری تا جون ۲۰۰۴ء
جدید ادب تیسرا شمارہ جولائی تا ڈسمبر ۲۰۰۴ ء
جدید ادب چوتھا شمارہ جنوری تا جون ۲۰۰۵ ء
جدید ادب ۵/واں شمارہ جولائی تا دسمبر ۲۰۰۵ ء
جدید ادب ٦/واں شمارہ جنوری تا جون ۲۰۰٦ ء
جدید ادب ۷/واں شمارہ جولائی تا دسمبر ۲۰۰٦ ء
جدید ادب ۸/واں شمارہ جنوری تا جون ۲۰۰۷ ء
جدید ادب ۹/وانشمارہ جولائی تا دسمبر ۲۰۰۷ ء
جدید ادب ۱۰/واں شمارہ جنوری تا جون ۲۰۰۸ ء
جدید ادب ۱۱/واں شمارہ جولائی تا دسمبر ۲۰۰۸ ء
جدید ادب ۱۲/واں شمارہ جنوری تا جون ۲۰۰۹ ء
جدید ادب ۱۳واں شمارہ جولائی تا دسمبر ۲۰۰۹ ء
جدید ادب ۱٤/واں شمارہ جنوری تا جون ۲۰۱۰ ء
جدید ادب ۱۵/واں شمارہ جولائی تا دسمبر ۲۰۱۰ ء
جدید ادب ۱٦/واں شمارہ جنوری تا جون ۲۰۱۱ ء
جدید ادب ۱۷/واں شمارہ جولائی تا دسمبر ۲۰۱۱ ء
جدید ادب ۱۸/واں شمارہ جنوری تا جون ۲۰۱۲ ء
جدید ادب ۱۹/واں شمارہ جولائی تا دسمبر ۲۰۱۲ ء
ادب ساز دہلی نصرت ظہیر
شاعر ممبئی افتخار امام صدیقی
عکاس پاکستان کتاب نمبر ٤
عکاس پاکتان کتاب نمبر ٤

* * * * *